اسلام اور جاہلیت

سید ابوالاعلیٰ مودودی رح

اسلام

اور

جاہلیّت

از

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

شائع کردہ

مکتبہ جماعت اسلامی لاہور (پاکستان)

قیمت سات آنے

سید ابوالاعلیٰ مودودی طابع وناشر نے
کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر
مکتبہ جماعت اسلامی - لاہور (پاکستان)
سے شائع کیا

تعداد اشاعت ۲۰۰۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام اور جاہلیّت

(یہ مقالہ ۲۳ر فروری سنہ ۴۱ کو مجلس اسلامیات، اسلامیہ کالج پشاور کی دعوت پر پڑھا گیا تھا)

انسان کو دُنیا میں جتنی چیزوں سے سابقہ پیش آتا ہے اُن میں سے کسی کے ساتھ بھی وہ کوئی معاملہ اس وقت تک نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ اس چیز کی ماہیت و کیفیت اور اپنے اور اس کے باہمی تعلق کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کر لے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ رائے بجائے خود صحیح ہو یا غلط، مگر بہرحال اسے ان امور کے

متعلق کوئی نہ کوئی رائے قائم ضرور کرنی پڑتی ہے، اور جب تک وہ کوئی رائے قائم نہیں کر لیتا یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ میں اس کے ساتھ کیا طرزِ عمل اور کیا رویّہ اختیار کروں۔ یہ آپ کا شب و روز کا تجربہ ہے۔ آپ جب کسی شخص سے ملتے ہیں تو آپ کو یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ یہ شخص کون ہے، کس حیثیت، کس مرتبے، کن صفات کا آدمی ہے، اور مجھ سے اس کا تعلق کس نوعیت کا ہے۔ اس کے بغیر آپ یہ طے کر ہی نہیں سکتے کہ آپ کو اُس کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا ہے۔ اگر علم نہیں ہوتا تو بہر حال آپ کو قرائن کی بنا پر ایک قیاسی رائے ہی ان امور کے متعلق قائم کرنی پڑتی ہے، اور جو رویّہ بھی آپ اس کے ساتھ اختیار کرتے ہیں اسی رائے کی بنا پر کرتے ہیں۔ جو چیزیں آپ کھاتے ہیں ان کے ساتھ آپ کا یہ معاملہ اسی وجہ سے ہے کہ آپ کے علم یا آپ کے قیاس میں وہ چیزیں غذائی ضرورت پوری کرتی ہیں۔ جن چیزوں کو آپ پھینک دیتے ہیں، جن کو آپ استعمال کرتے ہیں، جن کی آپ حفاظت کرتے ہیں، جن کی آپ تعظیم یا تحقیر کرتے ہیں، جن سے آپ ڈرتے یا محبت کرتے ہیں، اُن سب کے متعلق آپ کے یہ مختلف طرزِ عمل بھی اُس رائے پر مبنی ہوتے ہیں جو آپ نے اُن چیزوں کی ذات و صفات اور اپنے

ساتھ اُن کے تعلق کے بارے میں قائم کی ہے

پھر جو رائے آپ اشیاء کے متعلق قائم کیا کرتے ہیں اُس کے صحیح ہونے پر آپ کے رویہ کا صحیح ہونا اور غلط ہونے پر آپ کے رویہ کا غلط ہونا منحصر ہوتا ہے۔ اور خود اس رائے کی غلطی و صحت کا مدار اس چیز پر ہوتا ہے کہ آیا آپ نے علم کی بنا پر قائم کی ہے، یا قیاس پر یا وہم پر، یا محض مشاہدۂ حسی پر۔ مثلاً ایک بچہ آگ کو دیکھتا ہے اور مجرد مشاہدۂ حسی کی بنا پر یہ رائے قائم کرتا ہے کہ یہ بڑا خوبصورت چمکدار کھلونا ہے۔ چنانچہ اس رائے کے نتیجہ میں اس سے یہ طرزِ عمل ظاہر ہوتا ہے کہ وُہ اُسے اُٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ ایک دوسرا شخص اُسی آگ کو دیکھ کر وہم سے یا قیاس سے یہ رائے قائم کرتا ہے کہ اس کے اندر الوہیت ہے، یا یہ الوہیت کا مظہر ہے۔ چنانچہ اس رائے کی بنا پر وہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے ساتھ میرا رویہ یہ ہونا چاہئے کہ میں اس کے آگے سرِ نیاز جھکا دُوں۔ ایک تیسرا شخص اسی آگ کو دیکھ کر اس کی ماہیت اور اس کی صفات کی تحقیق کرتا ہے اور علم و تحقیق کی بنا پر یہ رائے قائم کرتا ہے کہ یہ پکانے اور جلانے اور تپانے والی ایک چیز ہے، اور میرے ساتھ اس کا تعلق وہ ہے جو ایک مخدوم کے ساتھ خادم کا تعلق ہوتا ہے۔ چنانچہ اس رائے کی بنا پر وہ آگ کو نہ

کھلونا بناتا ہے نہ معبود، بلکہ اس سے حسبِ موقع پکانے اور جلانے اور تپانے کی خدمت لیتا ہے، اِن مختلف رویوں میں سے بچے اور آتش پرست کے رویے جاہلیت کے رویے ہیں، کیونکہ بچے کی یہ رائے کہ آگ محض کھلونا ہے تجربہ سے غلط ثابت ہو جاتی ہے، اور آتش پرست کی یہ رائے کہ آگ خود الٰہ ہے یا مظہرِ الوہیت ہے کسی ثبوتِ علمی پر مبنی نہیں بلکہ محض قیاس و وہم پر مبنی ہے بخلاف اس کے آگ سے خدمت لینے والے کا رویہ علمی رویہ ہے کیونکہ آگ کے متعلق اس کی رائے علم پر مبنی ہے۔

زندگی کے بنیادی مسائل

اس مقدمہ کو ذہن نشین کرنے کے بعد اب ذرا اپنی نظر کو جزئیات سے کلیات پر پھیلائیے۔ انسان اس دنیا میں اپنے آپ کو موجود پاتا ہے اس کے پاس ایک جسم ہے جس میں بہت سی قوتیں بھری ہوئی ہیں۔ اس کے سامنے زمین و آسمان کی ایک عظیم الشان بساط پھیلی ہوئی ہے جس میں بے حد و حساب اشیاء ہیں اور وہ ان اشیاء سے کام لینے کی قدرت اپنے اندر پاتا ہے۔ اس کے گرد و پیش بہت سے انسان، جانور، نباتات، جمادات وغیرہ ہیں اور ان سب سے اس کی زندگی وابستہ ہے، اب کیا آپ کے نزدیک یہ بات قابلِ تصور ہے کہ وہ ان چیزوں کے ساتھ کوئی رویہ اختیار کر سکتا ہے جب

تک کہ پہلے خود اپنے بارے میں، ان تمام موجودات کے بارے میں، اور ان کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کرے؟ کیا وہ اپنی زندگی کے لئے کوئی راستہ اختیار کر سکتا ہے جب تک یہ طے نہ کرلے کہ میں کون ہوں، کیا ہوں، ذمہ دار ہوں یا غیر ذمہ دار، خود مختار ہوں یا ماتحت، ماتحت ہوں تو کس کا اور جوابدہ ہوں تو کس کے سامنے، میری اس دنیوی زندگی کا کوئی مآل ہے یا نہیں اور ہے تو کیا ہے، اسی طرح کیا وہ اپنی قوتوں کے لئے کوئی مصرف تجویز کر سکتا ہے جبتک اس سوال کا فیصلہ نہ کرلے کہ یہ جسم اور جسمانی قوتیں اس کی اپنی ملک ہیں یا کسی کا عطیہ ہیں، ان کا حساب کوئی لینے والا ہے یا نہیں، اور ان کے استعمال کا ضابطہ اسے خود متعین کرنا ہے یا کسی اور کو؟ اسی طرح کیا اپنے گردوپیش کی اشیاء کا مالک وہ خود ہے یا کوئی اور، ان پر اس کے اختیارات محدود ہیں یا غیر محدود، اور محدود ہیں تو حدود مقرر کرنے والا کون ہے؟ اسی طرح کیا وہ آپس میں اپنے ابنائے نوع کے برتاؤ کی کوئی شکل متعین کر سکتا ہے، جب تک اس معاملہ میں کوئی رائے قائم نہ کرے کہ انسانیت کس چیز سے عبارت ہے، انسان اور انسان کے درمیان فرق وامتیاز کی بنیاد کیا ہے، اور دوستی و دشمنی، اتفاق و اختلاف، تعاون اور عدم تعاون کی اساس کن امور پر ہے؟ اسی طرح کیا وہ بحیثیت مجموعی اس دنیا کے

ساتھ کوئی رویہ اختیار کر سکتا ہے جبتک اس معاملہ میں کسی نتیجہ پر نہ پہنچے کہ یہ نظامِ کائنات کس قسم کا ہے اور اس میں میری حیثیت کیا ہے؟

جو مقدمہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں، اس کی بنا پر بلا تامل یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان تمام امور کے متعلق ایک نہ ایک رائے قائم کئے بغیر کوئی رویہ اختیار کرنا غیر ممکن ہے۔ فی الواقع ہر انسان جو دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے ان سوالات کے متعلق شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر کوئی نہ کوئی رائے ضرور رکھتا ہے اور رکھنے پر مجبور ہے، کیونکہ وہ اس رائے کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص نے ان سوالات پر فلسفیانہ غور و فکر کیا ہو اور واضح طور پر تنقیحات قائم کر کے ایک ایک سوال کا فیصلہ کیا ہو۔ نہیں، بہت سے آدمیوں کے ذہن میں ان سوالات کی سرے سے کوئی متعین صورت ہوتی ہی نہیں نہ وہ کبھی ان پر بالارادہ سوچتے ہیں۔ مگر باوجود اس کے ہر آدمی اجمالی طور ان سوالات کے متعلق منفی یا مثبت پہلو میں ایک رائے پر لازماً پہنچ جاتا ہے، اور زندگی میں اس کا رویہ جو بھی ہوتا ہے لازمی طور پر رائے کے مطابق ہوتا ہے۔

یہ بات جس طرح اشخاص کے معاملہ میں صحیح ہے اسی طرح جماعتوں کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ چونکہ یہ سوالات انسانی زندگی کے بنیادی سوالات ہیں اس لئے کسی نظامِ تمدن و تہذیب اور کسی ہیئت اجتماعی

کے لئے کوئی لائحۂ عمل بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ ان سوالات کا کوئی جواب متعین نہ کر لیا جائے۔ اور ان کا جواب جو بھی متعین کیا جائیگا اسی کے لحاظ سے اخلاق کا ایک نظریہ قائم ہوگا، اسی کی نوعیت کے مطابق زندگی کے مختلف شعبوں کی تشکیل ہوگی اور فی الجملہ پورا تمدن ویسا ہی رنگ اختیار کرے گا جیسا اس جواب کا مقتضا ہوگا۔ درحقیقت اس معاملہ میں کوئی تخلف ممکن ہی نہیں ہے۔ خواہ ایک شخص کا رویہ ہو یا ایک سوسائٹی کا، بہر حال وہ ٹھیک وہی نوعیت اختیار کرے گا جو ان سوالات کے جواب کی نوعیت ہوگی۔ حتیٰ کہ اگر آپ چاہیں تو ایک شخص یا ایک جماعت کے رویہ کا تجزیہ کرکے بآسانی یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ اس رویہ کی تہ میں زندگی کے ان بنیادی سوالات کا کونسا جواب کام کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ بات قطعی محال ہے کہ کسی شخصی یا اجتماعی رویہ کی نوعیت کچھ ہو اور ان سوالات کے جواب کی نوعیت کچھ اور ہو۔ اختلاف زبانی دعوے اور واقعی رویے کے درمیان تو ضرور ہو سکتا ہے لیکن ان سوالات کا جو جواب درحقیقت نفس کے اندر متمکن ہے اس کی نوعیت اور عملی رویہ کی نوعیت میں ہرگز کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔

اچھا اب ہمیں ایک قدم اور آگے بڑھانا چاہئے، زندگی کے یہ بنیادی مسائل جن کے متعلق ابھی آپ نے سنا کہ ان کا کوئی حل اپنے ذہن

ہیں متعین کئے بغیر آدمی دنیا میں ایک قدم نہیں چل سکتا، اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ سب امورِ غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا کوئی جواب افق پر لکھا ہوا نہیں ہے کہ ہر انسان دنیا میں آتے ہی اس کو پڑھ لے اور ان کا کوئی جواب ایسا بدیہی بھی نہیں ہے کہ ہر انسان کو خود بخود معلوم ہو جائے۔ اسی وجہ سے ان کا کوئی ایک حل نہیں ہے جس پر سارے انسان متفق ہوں۔ بلکہ ان کے بارے میں ہمیشہ انسانوں کے درمیان اختلاف رہا ہے اور ہمیشہ مختلف انسان مختلف طریقوں سے ان کو حل کرتے رہے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان کو حل کرنے کی کیا کیا صورتیں ممکن ہیں، کیا کیا صورتیں دنیا میں اختیار کی گئی ہیں، اور ان مختلف صورتوں سے جو حل نکلتے ہیں وہ کس قسم کے ہیں۔

ان کے حل کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے حواس پر اعتماد کرے اور حواس سے جیسا کچھ محسوس ہوتا ہے اُسی کی بنا پر ان امور کے متعلق ایک رائے قائم کرے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مشاہدۂ حسی کے ساتھ وہم و قیاس کو ملا کر ایک نتیجہ اخذ کیا جائے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ پیغمبروں نے حقیقت کا براہِ راست علم رکھنے کا دعویٰ کرتے ہوئے ان مسائل کا جو حل بیان کیا ہے اس کو

قبول کر لیا جائے۔

دنیا میں اب تک ان مسائل کے حل کی یہی تین صورتیں اختیار کی گئی ہیں، اور غالباً یہی تین صورتیں ممکن بھی ہیں۔ ان میں سے ہر صورت ایک جداگانہ طریقہ سے ان مسائل کو حل کرتی ہے، ہر ایک حل سے ایک خاص قسم کا رویہ وجود میں آتا ہے اور ایک خاص نظامِ اخلاق اور نظامِ تمدن بنتا ہے جو اپنی بنیادی خصوصیات میں دوسرے تمام حلوں کے پیدا کردہ رویوں سے مختلف ہوتا ہے۔ اب میں دکھانا چاہتا ہوں کہ ان مختلف طریقوں سے ان مسائل کے کیا حل نکلتے ہیں، اور ہر ایک حل کس قسم کا رویہ پیدا کرتا ہے۔

خالص جاہلیت

حواس پر اعتماد کر کے جب انسان ان مسائل کے متعلق کوئی رائے قائم کرتا ہے تو اس طرزِ فکر کی عین فطرت کے تقاضے سے وہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ کائنات کا یہ سارا نظام ایک اتفاقی ہنگامۂ وجود و ظہور ہے جس کے پیچھے کوئی مصلحت اور کوئی مقصد نہیں، یونہی بن گیا ہے، یونہی چل رہا ہے، یونہی بے نتیجہ ختم ہو جائے گا۔ اس کا کوئی مالک نظر نہیں آتا، لہٰذا وہ یا تو ہے ہی نہیں، یا اگر ہے تو انسان کی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ انسان ایک قسم کا جانور ہے جو شاید اتفاقاً یہاں پیدا ہو گیا ہے، کچھ

خبر نہیں کہ اس کو کس نے پیدا کیا یا یہ خود پیدا ہو گیا، بہر حال یہ سوال خارج از بحث ہے، ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ یہ اس زمین پر پایا جاتا ہے، کچھ خواہشیں رکھتا ہے جنہیں پورا کرنے کے لئے اس کی طبیعت اندر سے زور کرتی ہے، کچھ قویٰ اور کچھ آلات رکھتا ہے جو ان خواہشوں کی تکمیل کا ذریعہ بن سکتے ہیں، اور اس کے گرد و پیش زمین کے دامن پر بے حد و حساب سامان پھیلا ہوا ہے جس پر یہ اپنے قویٰ اور آلات کو استعمال کر کے اپنی خواہشات کی تکمیل کر سکتا ہے، لہٰذا اس کی قوتوں کا کوئی مصرف اس کے سوا نہیں کہ یہ اپنی خواہشات و ضروریات کو زیادہ سے زیادہ کمال کے ساتھ پورا کرے، اور دنیا کی کوئی حیثیت اس کے سوا نہیں کہ یہ ایک خوانِ یغما ہے جو اس لئے پھیلا ہوا ہے کہ انسان اس پر ہاتھ مارے اوپر کوئی صاحب امر نہیں جس کے سامنے انسان جواب دہ ہو، اور نہ کوئی علم کا منبع اور ہدایت کا سرچشمہ موجود ہے جہاں سے انسان کو اپنی زندگی کا قانون مل سکتا ہے، لہٰذا انسان ایک خود مختار اور غیر ذمہ دار ہستی ہے، اپنے لئے ضابطہ و قانون بنانا اور اپنی قوتوں کا مصرف تجویز کرنا اور موجودات کے ساتھ اپنے طرزِ عمل کا تعین کرنا اس کا اپنا کام ہے اس کے لئے اگر کوئی ہدایت ہے تو جانوروں کی زندگی میں، پتھروں کی سرگذشت میں، یا خود اپنی تاریخ کے تجربات میں ہے، اور اگر یہ کسی کے

سامنے جوابدہ ہے تو آپ اپنے سامنے یا اس اقتدار کے سامنے ہے جو خود انسانوں ہی میں سے پیدا ہو کر افراد پر مستولی ہو جائے۔ زندگی جو کچھ ہے یہی دنیوی زندگی ہے اور اعمال کے سارے نتائج اسی زندگی کی حد تک ہیں، لہٰذا صحیح اور غلط، مفید اور مضر، قابلِ اخذ اور قابلِ ترک ہونے کا فیصلہ صرف اُنہی نتائج کے لحاظ سے کیا جائے گا جو اس دنیا میں ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ ایک پورا نظریۂ حیات ہے جس میں انسانی زندگی کے تمام بنیادی مسائل کا جواب حسّی مشاہدہ پر دیا گیا ہے، اور اس جواب کا ہر جزء دوسرے جزء کے ساتھ کم از کم ایک منطقی ربط ایک مزاجی موافقت ضرور رکھتا ہے جس کی وجہ سے انسان دنیا میں ایک ہموار و یکساں رویہ اختیار کر سکتا ہے، قطع نظر اس سے کہ یہ جواب اور اس سے پیدا ہونے والا رویہ بجائے خود صحیح ہو یا غلط۔ اب اس رویہ پر ایک نگاہ ڈالیے جو اس جواب کی بنا پر آدمی دنیا میں اختیار کرتا ہے۔

انفرادی زندگی میں اس نقطۂ نگاہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسان اوّل سے لیکر آخر تک خود مختارانہ اور غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل اختیار کرے وہ اپنے آپ کو اپنے جسم اور اپنی جسمانی قوتوں کا مالک سمجھے گا، اس لئے اپنے حسبِ منشا جس طرح چاہے گا انہیں استعمال کرے گا، دنیا کی جو چیزیں اس کے قبضۂ قدرت میں آئیں گی اور جن انسانوں پر اس کو اقتدار

حاصل ہو گا ان سب کے ساتھ وہ اس طرح برتاؤ کرے گا جیسے کہ ان کا مالک ہے۔ اس کے اختیارات کو محدود کرنے والی چیز صرف قوانین قدرت کی حدیں اور اجتماعی زندگی کی ناگزیر بندشیں ہوں گی۔ خود اس کے اپنے نفس میں کوئی ایسا اخلاقی احساس —— ذمہ داری کا احساس اور کسی بازپرس کا خوف —— نہ ہو گا جو اسے شتر بے مہار ہونے سے روکتا ہو جہاں خارجی رکاوٹیں نہ ہوں، یا جہاں وہ ان رکاوٹوں کے علی الرغم کام کرنے پر قادر ہو وہاں تو اس کے عقیدے کا فطری اقتضا یہی ہے کہ وہ ظالم، بددیانت، شریر اور مفسد ہو۔ وہ فطرۃً خود غرض، مادہ پرست اور ابن الوقت ہو گا۔ اس کی زندگی کا کوئی مقصد اپنی نفسانی خواہشات اور حیوانی ضروریات کی خدمت کے سوا نہ ہو گا، اور اس کی نگاہ میں قدر و قیمت صرف اُن چیزوں کی ہو گی جو اُس کے اس مقصدِ زندگی کیلئے کوئی قیمت رکھتی ہوں۔ افراد میں یہ سیرت و کردار پیدا ہونا اس عقیدے کا فطری اور منطقی نتیجہ ہے۔ بے شک یہ ممکن ہے کہ مصلحت اور دور اندیشی کی بنا پر ایسا شخص ہمدرد ہو، ایثار پیشہ ہو، اپنی قوم کی فلاح و ترقی کے لئے جان توڑ کوشش کرتا ہو، اور فی الجملہ اپنی زندگی میں ایک طرح کے ذمہ دارانہ اخلاق کا اظہار کرے لیکن جب آپ اس کے اس رویہ کا تجزیہ کریں گے تو معلوم ہو گا کہ دراصل یہ اس کی خود غرضی

و نفسانیت ہی کی توسیع ہے۔ وہ اپنے ملک یا اپنی قوم کی بھلائی میں اپنی بھلائی دیکھتا ہے اس لئے اس کی بھلائی چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا شخص زیادہ سے زیادہ بس ایک نیشنلسٹ ہی ہو سکتا ہے۔

پھر جو سوسائٹی اس ذہنیت کے افراد سے بنے گی اُس کی امتیازی خصوصیات یہ ہونگی :-

سیاست کی بنیاد انسانی حاکمیت پر قائم ہوگی، خواہ وہ ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک طبقہ کی حاکمیت ہو، یا جمہور کی حاکمیت۔ زیادہ سے زیادہ بلند اجتماعی تصور جو قائم کیا جاسکے گا وہ بس دولت مشترکہ Commonwealth کا تصور ہوگا۔ اس مملکت میں قانون ساز انسان ہونگے، تمام قوانین خواہش اور تجربی مصلحت کی بنا پر بنائے اور بدلے جائیں گے، اور منفعت پرستی و مصلحت پرستی ہی کے لحاظ سے پالیسیاں بھی بنائی اور بدلی جائیں گی۔ مملکت کے حدود میں وہ لوگ زور کر کے اُبھر آئیں گے جو سب سے زیادہ طاقتور اور سب سے زیادہ چالاک، مکّار، جھوٹے، دغا باز، سنگدل اور خبیث النفس ہوں گے۔ سوسائٹی کی رہنمائی اور مملکت کی زمامِ کار انہی کے ہاتھ میں ہوگی، اور ان کی کتاب آئین میں زور کا نام حق اور بے زوری کا نام باطل ہوگا۔

تمدن و معاشرت کا سارا نظام نفس پرستی پر قائم ہوگا۔ لذاتِ نفس

کی طلب ہر اخلاقی قید سے آزاد ہوتی چلی جائیگی، اور تمام اخلاقی معیار اس طرح قائم کئے جائیں گے کہ ان کی وجہ سے لذتوں کے حصول میں کم سے کم رکاوٹ ہو۔

اسی ذہنیت سے آرٹ اور لٹریچر متاثر ہونگے اور ان کے اندر عُریانی و شہوانیت کے عناصر بڑھتے چلے جائیں گے۔

معاشی زندگی میں کبھی جاگیر داری سسٹم بر سرِ عروج آئے گا، کبھی سرمایہ داری نظام اس کی جگہ لے گا اور کبھی مزدور شورش کر کے اپنی ڈکٹیٹرشپ قائم کر لیں گے۔ عدل سے بہر حال معیشت کا رشتہ کبھی قائم نہ ہو سکے گا، کیونکہ دنیا اور اس کی دولت کے بارے میں اس سوسائٹی کے ہر فرد کا بنیادی رویہ اس تصور پر مبنی ہوگا کہ یہ ایک خوانِ یغما ہے جس پر حسبِ منشا، اور حسبِ موقع ہاتھ مارنے کیلئے وہ آزاد ہے۔

پھر اس سوسائٹی میں افراد کو تیار کرنے کے لئے تعلیم و تربیت کا جو نظام ہو گا اس کا مزاج بھی اسی تصورِ حیات اور اسی رویہ کے مناسب حال ہو گا اس میں ہر نئی آنے والی نسل کو دنیا اور انسان، اور دنیا میں انسان کی حیثیت کے متعلق وہی تصور دیا جائے گا جس کی تشریح میں نے اوپر کی ہے۔ تمام معلومات، خواہ وہ کسی شعبۂ علم سے متعلق ہوں، ان کو ایسی ہی ترتیب کے ساتھ دی جائیں گی کہ آپ سے آپ ان کے

ذہن میں زندگی کا یہ تصور پیدا ہو جائے۔ اور پھر ساری ترتیب اس ڈھنگ کی ہو گی کہ وہ زندگی میں یہی رویہ اختیار کرنے اور اسی طرز کی سوسائٹی میں کھپ جانے کیلئے تیار ہوں۔ اس تعلیم و تربیت کی خصوصیات کے متعلق مجھے آپ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ آپ لوگوں کو اس کا ذاتی تجربہ ہے۔ جن درسگاہوں میں آپ تعلیم پا رہے ہیں وہ سب اسی نظریہ پر قائم ہوئی ہیں اگرچہ ان کے نام اسلامیہ کالج اور مسلم یونیورسٹی وغیرہ ہیں۔

یہ رویہ جس کی تشریح میں نے ابھی آپ کے سامنے کی ہے۔ خالص جاہلیت کا رویہ ہے۔ اس کی نوعیت وہی ہے جو اس بچہ کے رویے کی نوعیت ہے جو محض حسی مشاہدے پر اعتماد کر کے آگ کو ایک خوبصورت کھلونا سمجھتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں اس مشاہدے کی غلطی فوراً تجربہ سے ظاہر ہو جاتی ہے، کیونکہ جس آگ کو کھلونا سمجھ کر وہ دست اندازی کا رویہ اختیار کرتا ہے وہ گرم آگ ہوتی ہے، ہاتھ لگاتے ہی فوراً بتا دیتی ہے کہ میں کھلونا نہیں ہوں۔ بخلاف اس کے یہاں مشاہدے کی غلطی بڑی دیر میں کھلتی ہے، بلکہ بہتوں پر کھلتی ہی نہیں، کیونکہ جس آگ پر ہاتھ ڈالتے ہیں اس کی آنچ دھیمی ہے، فوراً جلا نہیں دیتی بلکہ صدیوں تک تپاتی رہتی ہے۔ تاہم اگر کوئی شخص تجربات سے سبق لینے کے لئے تیار ہو تو شب و روز کی زندگی میں اس نظریہ کی بدولت افراد کی بے ایمانیوں،

حکام کے مظالم، منصفوں کی بے انصافیوں، مالداروں کی خود غرضیوں، اور عام لوگوں کی بداخلاقیوں کا جو تلخ تجربہ اس کو ہوتا ہے، اور بڑے پیمانے پر اسی نظریہ سے قوم پرستی، امپیریلزم، جنگ، فساد، ملک گیری اور اقوام کشی کے جو شرارے نکلتے ہیں، ان کے چرکوں سے وہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ یہ رویہ جاہلیت کا رویہ ہے، علمی رویہ نہیں ہے کیونکہ انسان نے اپنے متعلق اور نظامِ کائنات کے متعلق جو رائے قائم کرکے یہ رویہ اختیار کیا ہے وہ امرِ واقعہ کے مطابق نہیں ہے ورنہ اس سے یہ بُرے نتائج ظاہر نہ ہوتے۔

اب ہمیں دوسرے طریقہ کا جائزہ لینا چاہیے۔ زندگی کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مشاہدہ کے ساتھ قیاس و وہم سے کام لیکر ان مسائل کے متعلق کوئی رائے قائم کی جائے۔ اس طریقے سے تین مختلف رائیں قائم کی گئی ہیں اور ہر ایک رائے سے ایک خاص قسم کا رویہ پیدا ہوا ہے۔

شرک

ایک رائے یہ ہے کہ کائنات کا یہ نظام بے خداوند تو نہیں ہے مگر اس کا ایک خداوند (الٰہ یا رب) نہیں ہے بلکہ بہت سے خداوند (آلہٰ اور ارباب) ہیں۔ کائنات کی مختلف قوتوں کا سر رشتہ مختلف خداؤں کے ہاتھ

میں ہے اور انسان کی سعادت و شقاوت، کامیابی و ناکامی، نفع و نقصان، بہت سی ہستیوں کی مہربانی و نامہربانی پر منحصر ہے۔ یہ رائے جن لوگوں نے اختیار کی ہے انہوں نے پھر اپنے وہم و قیاس سے کام لیکر یہ تعین کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدائی کی طاقتیں کہاں کہاں اور کس کس کے ہاتھ میں ہیں اور جن جن چیزوں پر بھی ان کی نگاہ جاکر ٹھیری ہے اُنہی کو خدا مان لیا ہے۔

اس رائے کی بنا پر جو طرزِ عمل انسان اختیار کرتا ہے اس کی امتیازی

امتیازی خصوصیات یہ ہیں:۔

اوّلاً، اس سے آدمی کی پوری زندگی اوہام کی آماجگاہ بن جاتی ہے وہ کسی علمی ثبوت کے بغیر مجرد اپنے وہم و خیال سے بہت سی چیزوں کے متعلق یہ رائے قائم کرتا ہے کہ وہ فوق الفطری طریقوں سے اس کی قسمت پر اچھا یا بُرا اثر ڈالتی ہیں۔ اس لئے وہ اچھے اثرات کی موہوم امید اور بُرے اثرات کے موہوم خوف میں مبتلا ہو کر اپنی بہت سی قوتیں لاحاصل طریقہ سے ضائع کر دیتا ہے۔ کہیں کسی قبر سے اُمید لگاتا ہے کہ یہ میرا کام کر دے گی۔ کہیں کسی بُت پر بھروسہ کرتا ہے کہ وہ میری قسمت بنا دیگا۔ کہیں کسی اور خیالی کارساز کو خوش کرنے کے لئے دوڑتا پھرتا ہے۔ کہیں کسی بُرے شگون سے دل شکستہ ہو جاتا ہے، اور کہیں کسی اچھے

شگون سے توقعات کے خیالی قلعے بنا لیتا ہے، یہ ساری چیزیں اس کے خیالات اور اس کی کوششوں کو فطری تدابیر سے ہٹا کر ایک بالکل غیر فطری راستے پر ڈال دیتی ہیں۔

ثانیاً، اس راٹے کی وجہ سے پوجا پاٹ، نذر و نیاز، اور دوسری رسموں کا ایک لمبا چوڑا دستور العمل بنتا ہے جس میں اُلجھ کر آدمی کی سعی و عمل کا ایک بڑا حصہ بے نتیجہ مشغولیتوں میں صرف ہو جاتا ہے۔

ثالثاً، جو لوگ اس مشرکانہ وہم پرستی میں مبتلا ہوتے ہیں ان کو بیوقوف بنا کر اپنے جال میں پھانس لینے کا چالاک آدمیوں کو خوب موقع مل جاتا ہے۔ کوئی بادشاہ بن بیٹھتا ہے اور سورج، چاند اور دوسرے دیوتاؤں سے اپنا نسب ملا کر لوگوں کو یقین دلاتا ہے کہ ہم بھی خداؤں میں سے ہیں اور تم ہمارے بندے ہو۔ کوئی پروہت یا مجاور بن بیٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارا نفع و نقصان جن سے وابستہ ہے ان سے ہمارا تعلق ہے اور تم ہمارے ہی واسطے سے ان تک پہنچ سکتے ہو۔ کوئی پنڈت اور پیر بن جاتا ہے اور تعویذ گنڈوں اور منتروں اور عملیات کا ڈھونگ رچا کر لوگوں کو یقین دلاتا ہے کہ ہماری یہ چیزیں فوق الفطری طریقے سے تمہاری حاجتیں پوری کریں گی۔ پھر ان سب چالاک لوگوں کی نسلیں مستقل خاندانوں اور طبقوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں جن

کے حقوق، امتیازات، اور اثرات امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور گہری بنیادوں پر جمتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرح اس عقیدہ کی بدولت عام انسانوں کی گردنوں پر شاہی خاندانوں، مذہبی عہدہ داروں اور روحانی پیشواؤں کی خدائی کا جوا مسلط ہوتا ہے اور یہ بناوٹی خدا اُن کو اس طرح اپنا خادم بناتے ہیں کہ گویا وہ اُن کے لئے دودھ دینے اور سواری اور باربرداری کے جانور ہیں۔

رابعاً، یہ نظریہ نہ تو علوم وفنون، فلسفہ وادب، اور تمدن و سیاست کے لئے کوئی مستقل بنیاد فراہم کرتا ہے اور نہ ان خیالی خداؤں سے انسانوں کو کسی قسم کی ہدایت ہی ملتی ہے کہ وہ اس کی پابندی کریں۔ ان خداؤں سے تو انسان کا تعلق صرف اس حد تک محدود رہتا ہے کہ یہ اُن کی مہربانی و اعانت حاصل کرنے کے لئے بس عبودیت کے چند مراسم ادا کر دے۔ باقی رہے زندگی کے معاملات تو ان کے متعلق قوانین اور ضوابط بنانا اور عمل کے طریقے معین کرنا انسان کا اپنا کام ہوتا ہے۔ اس طرح مشرک سوسائٹی عملاً انہی سب راہوں پر چلتی ہے جن کا ذکر خالص جاہلیت کے سلسلہ میں ابھی میں آپ سے کر چکا ہوں۔ وہی اخلاق، وہی اعمال، وہی طرزِ تمدن، وہی سیاست، وہی نظامِ معیشت، اور وہی علم و ادب۔ ان تمام حیثیتوں سے شرک کے رویے اور خالص جاہلیت کے

رو یہ میں کوئی اصولی فرق نہیں ہوتا۔

رہبانیّت

دوسری رائے جو مشاہدے کے ساتھ قیاس و وہم کو ملا کر قائم کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا اور یہ جسمانی وجود انسان کے لئے ایک دارالعذاب ہے۔ انسان کی روح ایک سزا یافتہ قیدی کی حیثیت سے اس قفس میں بند کی گئی ہے۔ لذات و خواہشات اور تمام وہ ضروریات جو اس تعلق کی وجہ سے انسان کو لاحق ہوتی ہیں اصل میں یہ اس قید خانہ کے طوق و سلاسل ہیں۔ انسان جتنا اس دنیا اور اس کی چیزوں سے تعلق رکھیگا اتنا ہی ان زنجیروں میں پھنستا چلا جائے گا اور مزید عذاب کا مستحق ہوگا۔ نجات کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں کہ زندگی کے سارے بکھیڑوں سے قطع تعلق کیا جائے، خواہشات کو مٹایا جائے، لذّات سے کنارہ کشی کی جائے، جسمانی ضروریات اور نفس کے مطالبوں کو پورا کرنے سے انکار کیا جائے، ان تمام محبتوں کو دل سے نکال دیا جائے جو گوشت و خون کے تعلق سے پیدا ہوتی ہیں، اور اپنے اس دشمن یعنی نفس و جسم کو مجاہدوں اور ریاضتوں سے اتنی تکلیفیں دی جائیں کہ روح پر اس کا تسلط قائم نہ رہ سکے۔ اس طرح روح ہلکی اور پاک صاف ہو جائے گی اور نجات

کے بلند مقام پر اُڑنے کی طاقت حاصل کرے گی۔

اس رائے سے جو رویہ پیدا ہوتا ہے اس کی خصوصیات یہ ہیں:-

اوّلاً، اس سے انسان کے تمام رجحانات اجتماعیت سے انفرادیت کی طرف اور تمدن سے وحشت کی طرف پھر جاتے ہیں۔ وہ دنیا اور اس کی زندگی سے منہ موڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے، ذمہ داریوں سے بھاگتا ہے اس کی ساری زندگی عدم تعاون اور ترک موالات کی زندگی بن جاتی ہے۔ اور اس کے اخلاق زیادہ تر سلبی د نوعیت کے ہو جاتے ہیں۔

ثانیاً، اس رائے کی بدولت نیک لوگ دنیا کے کاروبار سے ہٹ کر اپنی نجات کی فکر میں گوشہ ہائے عزلت کی طرف چلے جاتے ہیں اور دنیا کے سارے معاملات شریر لوگوں کے ہاتھوں میں آجاتے ہیں۔

ثالثاً، تمدن میں اس رائے کا اثر جس حد تک پہنچتا ہے اس سے لوگوں کے اندر سلبی اخلاقیات، غیر تمدنی د) اور انفرادیت پسندانہ د) رجحانات اور مایوسانہ خیالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ ان کی عملی قوتیں سرد ہو جاتی ہیں۔ وہ ظالموں کے لئے نرم نوالہ بن جاتے ہیں اور ہر جابر حکومت ان کو آسانی سے قابو میں لا سکتی ہے درحقیقت یہ نظریہ عوام کو ظالموں کے لئے ذلول ر بنانے ہیں

جادو کی تاثیر رکھتا ہے۔

رابعاً، انسانی فطرت سے اس راہبانہ نظریہ کی مستقل جنگ رہتی ہے اور اکثر یہ اس سے شکست کھاجاتا ہے۔ پھر جب یہ شکست کھاتا ہے تو اپنی کمزوری کو چھپانے کے لئے اسے حیلوں کے دامن میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے کہیں کفارہ کا عقیدہ ایجاد ہوتا ہے، کہیں عشق مجازی کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے اور کہیں ترک دنیا کے پردے میں وہ دنیا پرستی کی جاتی ہے جس کے آگے دنیا پرست بھی شرما جائیں۔

ہمہ اوست

تیسری رائے جو مشاہدے اور قیاس کی آمیزش سے پیدا ہوتی ہے یہ ہے کہ انسان اور کائنات کی تمام چیزیں بجائے خود غیر حقیقی ہیں، ان کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے، دراصل ایک وجود نے ان ساری چیزوں کو خود اپنے ظہور کا واسطہ بنایا ہے اور وہی ان سب کے اندر کام کر رہا ہے۔ تفصیلات میں اسی نظریہ کی بے شمار صورتیں ہیں۔ مگر ان ساری تفصیلات کے اندر قدر مشترک یہی ایک خیال ہے کہ تمام موجودات ایک ہی وجود کا ظہور خارجی ہیں اور دراصل موجود وہی ہے باقی کچھ نہیں۔

اس نظریہ کی بنا پر انسان جو رویہ اختیار کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اسے خود اپنے ہونے ہی میں شک ہو جاتا ہے کجا کہ وہ کوئی کام کرے۔ وہ اپنے آپ کو ایک کٹھ پتلی سمجھتا ہے جسے کوئی اور نچا رہا ہے یا جس کے اندر کوئی اور ناچ رہا ہے۔ وہ اپنے تخیلات کے نشے میں گم ہو جاتا ہے اس کے لئے نہ کوئی مقصدِ زندگی ہوتا ہے اور نہ کوئی راہِ عمل۔ وہ خیال کرتا ہے کہ میں خود تو کچھ ہوں ہی نہیں، نہ میرے کرنے کا کوئی کام ہے، نہ میرے کئے سے کچھ ہو سکتا ہے، اصل میں تو وہ وجودِ کلّی جو مجھ میں اور تمام کائنات میں سرایت کئے ہوئے ہے اور جو ازل سے ابد تک چلا جا رہا ہے، سارے کام اسی کے ہیں اور وہی سب کچھ کرتا ہے۔ وہ اگر مکمل ہے تو میں بھی مکمل ہوں، پھر کوشش کس چیز کے لئے؟ اور وہ اگر اپنی تکمیل کے لئے کوشاں ہے تو جس عالمگیر حرکت کے ساتھ وہ کمال کی طرف جا رہا ہے اسی کی لپیٹ میں ایک جز کی حیثیت سے میں بھی آپ سے آپ چلا جاؤں گا۔ میں ایک جزء ہوں مجھے کیا خبر کہ کل کدھر جا رہا ہے اور کدھر جانا چاہتا ہے؟

اس طرزِ خیال کے عملی نتائج قریب قریب وہی ہیں جو ابھی میں نے راہبانہ نظریہ کے سلسلہ میں بیان کئے ہیں۔ بلکہ بعض حالات میں اس رائے کو اختیار کرنے والے کا طرزِ عمل اُن لوگوں کے رویہ سے ملتا جلتا ہے

جو خالص جاہلیت کا نظریہ اختیار کرتے ہیں، کیونکہ یہ اپنی خواہشات کے ہاتھ میں اپنی باگیں دے دیتا ہے اور پھر جدھر جدھر خواہشات لے جاتی ہیں اسی طرف یہ سمجھتے ہوئے بے تکلف چلا جاتا ہے کہ جلنے والا وجود کلی ہے نہ کہ میں۔

پہلے نظریئے کی طرح یہ تینوں نظریے بھی جاہلیت کے نظریے ہیں اور اس بنا پر جو رویے ان سے پیدا ہوتے ہیں وہ بھی جاہلیت ہی کے رویے ہیں۔ اس لئے کہ اوّل تو ان میں سے کوئی نظریہ بھی کسی علمی ثبوت پر مبنی نہیں ہے بلکہ محض خیالی اور قیاسی بنیادوں پر مختلف رائیں قائم کر لی گئی ہیں۔ دوسرے ان کا واقعہ کے خلاف ہونا تجربہ سے ثابت ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی رائے بھی امر واقعی کے مطابق ہوتی تو اس کے مطابق عمل کرنے سے برے نتائج تجربے میں نہ آتے۔ جب آپ دیکھتے ہیں کہ ایک چیز کو جہاں کہیں انسان نے کھایا اس کے پیٹ میں درد ضرور ہوا تو اس تجربہ سے آپ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ فی الواقع معدہ کی ساخت اور اس کی طبیعت سے یہ چیز مطابقت نہیں رکھتی۔ بالکل اسی طرح جب یہ حقیقت ہے کہ شرک، رہبانیت اور وجودیت کے نظریے اختیار کرنے سے انسان کو بحیثیت مجموعی نقصان ہی پہنچا تو یہ بھی اس امر کا ثبوت ہے کہ ان میں سے کوئی نظریہ بھی واقعہ اور

حقیقت کے مطابق نہیں ہے۔

اسلام

اب ہمیں تیسری صورت کو لینا چاہیئے جو زندگی کے ان بنیادی مسائل کے متعلق رائے قائم کرنے کی آخری صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ پیغمبروں نے ان مسائل کا جو حل پیش کیا ہے اُسے قبول کیا جائے۔
اس طریقہ کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی اجنبی مقام پر آپ ہوں اور آپ کو خود اس مقام کے متعلق کوئی واقفیت نہ ہو تو آپ کسی دوسرے شخص سے دریافت کریں اور اس کی رہنمائی میں وہاں کی سیر کریں۔ ایسی صورتِ حال جب پیش آتی ہے تو آپ پہلے اس شخص کو تلاش کرتے ہیں جو خود واقف کار ہونے کا دعویٰ کرے، پھر آپ قرائن سے اس امر کا اطمینان کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ شخص قابلِ اعتماد ہے یا نہیں، پھر آپ اس کی رہنمائی میں چل کر دیکھتے ہیں اور جب تجربہ سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق جو عمل آپ نے کیا اس سے کوئی بُرا نتیجہ نہیں نکلا تو آپ کو پوری طرح اطمینان ہو جاتا ہے کہ واقعی وہ شخص واقف کار تھا اور اس جگہ کے متعلق جو معلومات اس نے دی تھیں وہ صحیح تھیں۔ یہ

ایک علمی طریقہ ہے، اور اگر کوئی دوسرا طریق علمی ممکن نہ ہو تو پھر رائے قائم کرنے کے لئے یہی ایک صحیح طریقہ ہو سکتا ہے۔

اب دیکھئے، دنیا آپ کے لئے ایک اجنبی جگہ ہے۔ آپ کو نہیں معلوم کہ اس کی حقیقت کیا ہے، اس میں انتظام کس کا ہے، کس آئین پر یہ کارخانہ چل رہا ہے، اس کے اندر آپ کی کیا حیثیت ہے، اور یہاں آپ کے لئے کیا رویہ مناسب ہے۔ آپ نے پہلے یہ رائے قائم کی کہ جیسا بظاہر نظر آتا ہے اصل حقیقت بھی وہی ہے۔ آپ نے اس رائے پر عمل کیا۔ مگر نتیجہ غلط نکلا۔ پھر آپ نے قیاس اور گمان کی بنا پر مختلف رائیں قائم کیں اور ہر ایک پر عمل کرکے دیکھا، مگر صورت میں نتیجہ غلط ہی رہا۔ اس کے بعد آخری صورت یہی ہے کہ آپ پیغمبروں کی طرف رجوع کریں۔ یہ لوگ واقف کار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ان کے حالات کی جتنی چھان بین کی جاتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہایت سچے، نہایت امین، نہایت نیک، نہایت بے غرض، اور نہایت صحیح الدماغ لوگ ہیں۔ لہٰذا بادی النظر میں ان پر اعتماد کرنے کے لئے کافی وجہ موجود ہے۔ اب صرف یہ دیکھنا باقی رہ جاتا ہے کہ دنیا کے متعلق اور دنیا میں آپ کی حیثیت کے متعلق جو معلومات وہ دیتے ہیں وہ کہاں تک لگتی ہوئی ہیں، اُن کے خلاف کوئی عملی

ثبوت تو نہیں ہے، اور اُن کے مطابق جو رویہ دنیا میں اختیار کیا گیا وہ تجربہ سے کیسا ثابت ہوا۔ اگر تحقیق سے ان تینوں باتوں کا جواب بھی اطمینان بخش نکلے، تو ان کی رہنمائی پر ایمان لے آنا چاہئے۔ اور زندگی میں وہی رویہ اختیار کرنا چاہئے جو اس نظریہ کے مطابق ہو۔

جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا پچھلے جاہلیت کے طریقوں کے مقابلہ میں یہ طریقہ علمی طریقہ ہے۔ اور اگر اس علم کے آگے آدمی سرِ تسلیم خم کر دے، اگر خود سری اور خود رائی چھوڑ کر اس علم کا اتباع کرے، اور اپنے رویہ کو انہی حدود کا پابند بنا دے جو اس علم نے قائم کی ہیں، تو اسی طریقہ کا نام "اسلامی طریقہ" ہے۔

انبیاء کا نظریۂ کائنات و انسان

پیغمبر کہتے ہیں :-

یہ سارا عالمِ ہست و بود جو انسان کے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے اور جس کا ایک جزء انسان بھی ہے، کوئی اتفاقی ہنگامہ نہیں ہے بلکہ ایک منظم، باضابطہ سلطنت ہے۔ اللہ نے اس کو بنایا ہے، وہی اس کا مالک ہے اور وہی اس کا اکیلا حاکم ہے۔ یہ ایک کلی نظام (Toralitarian System) ہے، جس میں تمام اختیارات مرکزی

اقتدار کے ہاتھ میں ہیں۔ اس مقتدرِ اعلیٰ کے سوا یہاں کسی کا حکم نہیں چلتا۔ تمام قوتیں جو نظامِ عالم میں کام کر رہی ہیں، اسی کے زیرِ حکم ہیں اور کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کے حکم سے سرتابی کر سکے۔ یا اس کے اذن کے بغیر اپنے اختیار سے کوئی حرکت کرے۔ اس ہمہ گیر سسٹم کے اندر کسی کی خود مختاری (Independence) اور غیر ذمہ داری (Irresponsibility) کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ نہ فطرۃً ہو سکتی ہے

انسان یہاں پیدائشی رعیت (Born Subject) ہے۔ رعیت ہونا اس کی مرضی پر موقوف نہیں بلکہ یہ رعیت ہی پیدا ہوا ہے اور رعیت کے سوا کچھ اور ہونا اس کے امکان میں نہیں ہے۔ لہٰذا یہ خود اپنے لئے طریقِ زندگی وضع کرنے اور اپنی ڈیوٹی آپ تجویز کر لینے کا حق نہیں رکھتا۔

یہ کسی چیز کا مالک نہیں ہے کہ اپنی ملک میں تصرف کرنے کا ضابطہ خود بنائے۔ اس کا جسم اور اس کی ساری قوتیں اللہ کی ملک اور اُس کا عطیہ ہیں، لہٰذا یہ اُن کو خود اپنے منشاء کے مطابق استعمال کرنے کا حقدار نہیں ہے، بلکہ جس نے یہ چیزیں اس کو عطا کی ہیں اُسی کی مرضی کے مطابق اسے اُن کو استعمال کرنا چاہیے۔

اسی طرح جو اشیاء اس کے گردوپیش دنیا میں پائی جاتی

ہیں۔ زمین، جانور، پانی، نباتات، معدنیات وغیرہ، یہ سب اللہ کی ملک ہیں۔ انسان ان کا مالک نہیں ہے، لہٰذا انسان کو ان پر بھی اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں بلکہ اسے اُن کے ساتھ اس قانون کے مطابق برتاؤ کرنا چاہیئے جو اصل مالک نے مقرر کیا ہے

اسی طرح وہ تمام انسان بھی جو زمین پر بستے ہیں، اور جن کی زندگی ایک دوسرے سے وابستہ ہے، اللہ کی رعیّت ہیں۔ لہٰذا ان کو اپنے باہمی تعلقات کے بارے میں خود اصُول اور ضابطے مقرر کر لینے کا حق نہیں ہے۔ ان کے جملہ تعلقات خدا کے بنائے ہوئے قانون پر مبنی ہونے چاہئیں۔

رہی یہ بات کہ وہ خدا کا قانون کیا ہے؟ تو پیغمبر کہتے ہیں کہ جس ذریعۂ علم کی بنا پر ہم تمہیں دنیا کی اور خود تمہاری یہ حقیقت بتا رہے ہیں، اُسی ذریعۂ علم سے ہم کو خدا کا قانون بھی معلوم ہوا ہے خدا نے خود ہم کو یہ علم دیا ہے اور ہم کو اس بات پر مامور کیا ہے کہ یہ علم تم تک پہنچا دیں۔ لہٰذا تم ہم پر اعتماد کرو، ہمیں اپنے بادشاہ کا نمائندہ تسلیم کرو، اور ہم سے اس کا مستند قانون لو،

پھر پیغمبر ہم سے کہتے ہیں کہ یہ جو تم بظاہر دیکھتے ہو کہ سلطنت عالم کا سارا کاروبار ایک نظم کے ساتھ چل رہا ہے مگر نہ خود سلطان

نظر آتا ہے نہ اس کے کارپرداز کام کرتے دکھائی دیتے ہیں، اور یہ جو تم ایک طرح کی خود مختاری اپنے اندر محسوس کرتے ہو کہ جس طرح چاہو کام کرو، مالکانہ روش بھی اختیار کر سکتے ہو، اور اصل مالک کے سوا دوسروں کے سامنے بھی اطاعت و بندگی میں سر جھکا سکتے ہو، ہر صورت میں تم کو رزق ملتا ہے، وسائل کار بہم پہنچتے ہیں، اور بغاوت کی سزا فوراً نہیں دی جاتی، یہ سب دراصل تمہاری آزمائش کے لئے ہے۔ چونکہ تم کو عقل، قوتِ استنباط، اور قوتِ انتخاب دی گئی ہے، اس لئے مالک نے اپنے آپ کو اور اپنے نظام سلطنت کو تمہاری نظروں سے اوجھل کر دیا ہے۔ وہ تمہیں آزمانا چاہتا ہے کہ تم اپنی قوتوں سے کس طرح کام لیتے ہو۔ اس نے تم کو سمجھ بوجھ، انتخاب کی آزادی (Freedom of choice) اور ایک طرح کی خود اختیاری (Autonomy) عطا کر کے چھوڑ دیا ہے۔ اب اگر تم اپنی رعیت ہونے کی حیثیت کو سمجھو اور برضاؤ رغبت اس حیثیت کو اختیار کرو، بغیر اس کے کہ تم پر اس حیثیت میں رہنے کے لئے کوئی جبر ہو، تو اپنے مالک کی آزمائش میں کامیاب ہو گے اور اگر رعیت ہونے کی حیثیت کو نہ سمجھو، یا سمجھنے کے باوجود باغیانہ روش اختیار کرو تو امتحان میں ناکام ہو جاؤ گے۔ اسی امتحان کی غرض سے تم کو دنیا میں کچھ اختیارات دیئے گئے ہیں، دنیا میں بہت سی

چیزیں تمہارے قبضۂ قدرت میں دی گئی ہیں، اور تم کو عمر بھر کی مہلت دی گئی ہے۔

اس کے بعد پیغمبر ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ دنیوی زندگی چونکہ امتحان کی مہلت ہے لہٰذا یہاں نہ حساب ہے نہ جزا سزا[1]۔ یہاں جو کچھ دیا جاتا ہے لازم نہیں کہ وہ کسی عملِ نیک کا انعام ہی ہو۔ وہ اس بات

---

[1] اس سلسلہ میں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہئیے کہ یہ عالم جس میں ہم اسوقت ہیں، دراصل عالم طبیعی ہے نہ کہ عالم اخلاقی۔ جن قوانین پر کائنات کا موجودہ نظام چل رہا ہے وہ اخلاقی قوانین نہیں ہیں بلکہ طبیعی قوانین ہیں۔ اس لئے موجودہ نظام کائنات میں اعمال کے اخلاقی نتائج پوری طرح مترتب نہیں ہوسکتے۔ وہ اگر مترتب ہوسکتے ہیں تو صرف اسی حد تک جس حد تک کہ قوانین طبیعی ان کو مترتب ہونے کا موقع دیں، ورنہ جہاں قوانین طبیعی ان کے ظہور کیلئے سازگار نہ ہوں وہاں ان کا ظاہر ہونا محال ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دے تو اس فعل کے اخلاقی نتیجہ کا مترتب ہونا موقوف ہے اس امر پر کہ قوانین طبیعی اس کا سراغ لگنے اور اس کے اوپر جرم ثابت ہونے اور اس پر اخلاقی سزا کے نافذ ہونے میں مددگار ہوں۔ اگر وہ مددگار نہ ہوں تو کوئی اخلاقی نتیجہ سرے سے مترتب ہوگا ہی نہیں اور اگر وہ سازگاری کر بھی دیں تب بھی اس فعل کے پورے اخلاقی نتائج مترتب نہ ہوسکیں گے، کیونکہ مقتول کے عوض قاتل کا محض قتل کر دیا جانا اس فعل کا پورا اخلاقی نتیجہ نہیں ہے جس کا اس نے ارتکاب کیا تھا۔ اسی لئے یہ دنیا دارالجزا نہیں ہے اور نہیں ہوسکتی۔ دارالجزا ہونے کیلئے ایک ایسا نظامِ عالم درکار ہے جس میں موجودہ نظامِ عالم کے برعکس حکمران قوانین، قوانین اخلاقی ہوں اور قوانین طبیعی محض ان کے خادم کی حیثیت رکھتے ہوں۔

کی علامت نہیں ہے کہ اللہ تم سے خوش ہے یا جو کچھ تم کر رہے ہو وہ درست ہے، بلکہ دراصل وہ محض امتحان کا سامان ہے، مال، دولت، اولاد، خدام، حکومت، اسباب زندگی، یہ سب وہ چیزیں ہیں جو تم کو امتحان کی غرض سے دی جاتی ہیں تاکہ تم ان پر کام کرکے دکھاؤ اور اپنی اچھی یا بری قابلیتوں کا اظہار کرو۔ اسی طرح جو تکلیفیں، نقصانات، مصائب وغیرہ آتے ہیں وہ بھی لازماً کسی عمل بد کی سزا نہیں ہیں بلکہ ان میں سے بعض قانون فطرت کے تحت آپ سے آپ ظاہر ہونے والے نتائج ہیں[1]، بعض آزمائش کے ذیل میں آتے ہیں[2]، اور بعض اس وجہ سے پیش آتے ہیں کہ حقیقت کے خلاف رائے قائم کرکے جب تم ایک رویہ اختیار کرتے ہو تو لامحالہ تم کو چوٹ لگتی ہے[3]۔ بہرحال یہ دنیا

---

[1] مثلاً زنا کرنیوالے کا بیماری میں مبتلا ہونا، کہ یہ اس گناہ کی اخلاقی سزا نہیں ہے بلکہ اس کا طبیعی نتیجہ ہے۔ اگر وہ علاج کرنے میں کامیاب ہو جائے تو بیماری سے بچ جائیگا مگر اخلاقی سزا سے نہ بچے گا۔ اگر توبہ کرے تو اخلاقی سزا سے بھی بچ جائیگا مگر بیماری دور نہ ہو گی۔

[2] مثلاً کسی شخص کا افلاس میں مبتلا ہونا اس کے حق میں اس امر کی آزمائش ہے کہ وہ اپنی حاجات پوری کرنے کے لئے ناجائز ذرائع استعمال کرتا ہے یا جائز وسائل ہی سے کام لینے پر ثابت قدم رہتا ہے، مصائب کے ہجوم میں حق پرستی پر قائم رہتا ہے یا مضطرب ہو کر باطل کے سامنے سر جھکا دیتا ہے

[3] یعنی جب انسان اس دنیا کو بے خدا اور اپنے آپکو خود مختار سمجھ کر کام کرتا ہے تو چونکہ فی الواقع نہ دنیا بے خدا ہے اور نہ انسان خود مختار، اس لئے امر واقعی کے خلاف عمل کرنے کی وجہ سے وہ

(باقی ص۳۵ پر)

دار الجزا نہیں ہے بلکہ دار الامتحان ہے۔ یہاں جو کچھ نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ کسی طریقہ یا کسی عمل کے صحیح یا غلط، نیک یا بد، قابلِ ترک یا قابلِ اخذ ہونے کا معیار نہیں بن سکتے۔ اصلی معیار آخرت کے نتائج ہیں۔ مہلت کی زندگی ختم ہونے کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جس میں تمہارے پورے کارنامے کو جانچ کر فیصلہ کیا جائیگا کہ تم امتحان میں کامیاب ہوئے یا ناکام۔ اور وہاں جس چیز پر کامیابی و ناکامی کا انحصار ہے وہ یہ ہے کہ اوّلاً، تم نے اپنی قوت نظر و استدلال کے صحیح استعمال سے اللہ تعالیٰ کے حاکم حقیقی ہونے اور اس کی طرف سے آئی ہوئی تعلیم و ہدایت کے منجانب اللہ ہونے کو پہچانا یا نہیں، اور ثانیاً، اس حقیقت سے واقف ہونے کے بعد آزادیٔ انتخاب رکھنے کے باوجود، تم نے اپنی رضا و رغبت سے اللہ کی حاکمیت اور اس کے حکم شرعی کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا یا نہیں۔

نظریۂ اسلامی کی تنقید

دنیا اور انسان کے متعلق یہ نظریہ جو پیغمبروں نے پیش کیا ہے ایک مکمل نظریہ ہے۔ اس کے تمام اجزاء میں ایک منطقی ربط ہے۔ کوئی جز

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴) لامحالہ چوٹ کھاتا ہے۔ اسکی مثال ایسی ہے جیسے آگ کو کھلونا سمجھ کر آپ ہاتھ میں پکڑ لیں تو ہاتھ جل جائیگا کیونکہ آپ نے امر واقعی کے خلاف رویہ اختیار کیا۔

دوسرے جز سے متناقض نہیں ہے۔ اس سے تمام واقعات عالم کی پوری توجیہ اور تمام آثارِ کائنات کی پوری تعبیر ملتی ہے۔ کوئی ایک چیز بھی مشاہدہ یا تجربہ میں ایسی نہیں آتی جس کی توجیہ اس نظریہ سے نہ کی جا سکتی ہو، لہٰذا یہ ایک علمی نظریہ (Scientific theory) ہے۔ "علمی نظریہ" کی جو تعریف بھی کی جائے وہ اس پر صادق آتی ہے۔

پھر کوئی مشاہدہ یا تجربہ آج تک ایسا نہیں ہوا جس سے نظریہ ٹوٹ جاتا ہو۔ لہٰذا یہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ٹوٹے ہوئے نظریات میں اس کو شمار نہیں کیا جا سکتا[1]۔

پھر نظامِ عالم کا جو مشاہدہ ہم کرتے ہیں اس سے یہ نظریہ نہایت اغلب (Most probable) نظر آتا ہے۔ کائنات میں جو زبردست تنظیم پائی جاتی ہے اس کو دیکھ کر یہ کہنا زیادہ قرینِ دانش ہے کہ اس کا کوئی ناظم ہے، بہ نسبت اس کے کوئی ناظم نہیں ہے۔ اسی طرح

[1] کسی زمانے کے علمی نظریات کا اس کے خلاف ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ یہ نظریہ ٹوٹ گیا۔ ایک علمی نظریہ کو صرف حقائق (Facts) توڑ سکتے ہیں نہ کہ نظریات لہٰذا جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ انبیاء کے پیش کئے ہوئے اس تصورِ کائنات و انسان کو کس ثابت شدہ حقیقت نے غلط ثابت کر دیا ہے، اس کو ٹوٹے ہوئے نظریات میں شمار کرنا قطعاً ایک غیر علمی اور متعصبانہ اِدّعاء ہے۔

اس تنظیم کو دیکھکر یہ نتیجہ نکالنا زیادہ معقول ہے کہ یہ مرکزی نظام ہے اور ایک ہی مختارِ کل اس کا ناظم ہے، بہ نسبت اس کے یہ لامرکزی نظام ہے اور بہت سے ناظموں کے ماتحت چل رہا ہے۔ اسی طرح جو حکمت کی شان اس کائنات کے نظام میں علانیہ محسوس ہوتی ہے اُسے دیکھ کر یہ رائے قائم کرنا زیادہ قریب از عقل ہے کہ یہ حکیمانہ اور بامقصد نظام ہے، بہ نسبت اس کے کہ بے مقصد ہے اور محض ایک بچے کا کھیل ہے۔

پھر جب ہم اس حیثیت سے غور کرتے ہیں کہ اگر واقعی یہ نظامِ کائنات ایک سلطنت ہے اور انسان اس نظام کا ایک جزء ہے تو یہ بات ہم کو سراسر معقول معلوم ہوتی ہے کہ اس نظام میں انسان کی خود مختاری و غیر ذمہ داری کے لئے کوئی جگہ نہ ہونی چاہئے اور اس کا صحیح مقام رعیت ہی کا ہونا چاہئے۔ اس لحاظ سے یہ ہم کو نہایت معقول (Most reasonable) نظریہ معلوم ہوتا ہے۔

پھر جب عملی نقطۂ نظر سے ہم دیکھتے ہیں تو یہ بالکل ایک قابلِ عمل (Practicable) نظریہ ہے۔ زندگی کی ایک پوری اسکیم اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ اس نظریہ پر مبنی ہے۔ فلسفہ اور اخلاق کے لئے، علوم و فنون کے لئے، ادب اور ہنر کے لئے، سیاست و انتظام

مملکت کے لئے، صلح و جنگ اور بین الاقوامی تعلقات کے لئے، غرض زندگی کے ہر پہلو اور ہر ضرورت کے لئے یہ ایک مستقل بنیاد فراہم کرتا ہے اور کسی شعبۂ زندگی میں بھی انسان کو اپنا رویہ متعین کرنے کے لئے اس نظریہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

اب ہمیں صرف یہ دیکھنا باقی رہ گیا ہے کہ اس نظریہ سے دنیا کی زندگی میں کس قسم کا رویہ بنتا ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں۔

انفرادی زندگی میں یہ نظریہ دوسرے جاہلی نظریات کے برعکس ایک نہایت ذمہ دارانہ اور نہایت منضبط (Decilined) رویہ پیدا کرتا ہے۔ اس نظریہ پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے جسم اور اس کی طاقتوں کو اور دنیا اور اس کی کسی چیز کو بھی اپنی ملک سمجھ کر خود مختارانہ استعمال نہ کرے بلکہ خدا کی ملک سمجھ کر صرف اس کے قانون کی پابندی میں استعمال کرے۔ ہر چیز کو جو اُسے حاصل ہے خدا کی امانت سمجھے اور یہ سمجھتے ہوئے اس میں تصرف کرے کہ مجھے اس امانت کا پورا حساب دینا ہے، اور حساب بھی اس کو دینا ہے جس کی نظر سے میرا کوئی فعل بلکہ کوئی دل میں چھپا ہوا ارادہ تک پوشیدہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص ہر حال میں ایک ضابطہ کا پابند ہوگا۔ وہ خواہشات کی بندگی میں کبھی شتر بے مہار نہیں بن سکتا۔ وہ ظالم

اور خائن نہیں ہو سکتا اس کی سیرت پر کامل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ وہ ضابطہ کی پابندی کے لئے کسی خارجی دباؤ کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کے اپنے نفس میں ایک زبردست اخلاقی انضباط پیدا ہو جاتا ہے جو اسے ان مواقع پر بھی راستی اور حق پر قائم رکھتا ہے جہاں اُسے کسی دنیوی طاقت کی باز پرس کا خطرہ نہیں ہوتا۔ یہ خدا کا خوف اور امانت کا احساس وہ چیز ہے جس سے بڑھ کر سوسائٹی کو قابلِ اعتماد افراد فراہم کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ تصور میں نہیں آسکتا۔

مزید برآں یہ نظریہ آدمی کو نہ صرف سعی وجہد کا آدمی بناتا ہے بلکہ اس کی سعی وجہد کو خود غرضی، نفس پرستی یا قوم پرستی کے بجائے حق پرستی اور بلند تر اخلاقی مقاصد کی راہ پر لگا دیتا ہے۔ جو شخص اپنے متعلق یہ رائے رکھتا ہو کہ میں دنیا میں بیکار نہیں آیا ہوں بلکہ خدا نے مجھے کام کرنے کے لئے یہاں بھیجا ہے، اور میری زندگی اپنے لئے یا اپنے دوسرے متعلقین کے لئے نہیں ہے بلکہ اُس کام کے لئے ہے۔ جس میں خدا کی رضا ہو، اور میں یونہی چھوڑ نہ جاؤں گا بلکہ مجھ سے پورا حساب لیا جائے گا کہ میں نے اپنے وقت کا اور اپنی قوتوں کا کتنا اور کس طرح استعمال کیا، ایسے شخص سے زیادہ کوشش کرنے والا اور نتیجہ خیز اور صحیح کوشش کرنے والا آدمی اور کوئی نہیں ہو سکتا

لہذا یہ نظریہ ایسے بہتر افراد پیدا کرتا ہے کہ ان سے بہتر انفرادی رویہ کا تصور کرنا مشکل ہے۔

اب اجتماعی پہلو میں دیکھئے:۔

سب سے پہلے تو یہ نظریہ انسانی اجتماع کی بنیاد بدل دیتا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے تمام انسان خدا کی رعیت ہیں۔ رعیت ہونے کی حیثیت سے سب کے حقوق یکساں، سب کی حیثیت یکساں، اور سب کے لئے مواقع یکساں۔ کسی شخص، کسی خاندان، کسی طبقہ، کسی قوم، کسی نسل کے لئے دوسرے انسانوں پر نہ کسی قسم کی برتری و فوقیت ہے نہ امتیازی حقوق۔ اس طرح انسان پر انسان کی حاکمیت اور فضیلت کی جڑ کٹ جاتی ہے، اور وہ تمام خرابیاں یک لخت دور ہو جاتی ہیں جو بادشاہی، جاگیرداری، نوابی (Aristocracy) اور برہمنیت و پاپائیت سے پیدا ہوتی ہیں۔

پھر یہ چیز قبائلی، قومی، نسلی، جغرافی اور لونی تعصبات کا بھی خاتمہ کر دیتی ہے جن کی بدولت دنیا میں سب سے زیادہ خونریزیاں ہوئی ہیں۔ اس نظریہ کی رو سے تمام روئے زمین خدا کا ملک ہے، تمام انسان آدم کی اولاد اور خدا کے بندے ہیں، اور فضیلت کی بنیاد نسل و نسب، مال و دولت، یا رنگ کی سپیدی و سرخی پر نہیں بلکہ اخلاق

کی پاکیزگی اور خدا کے خوف پر ہے۔ جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا اور صلاح و تقویٰ پر عمل کرنے والا ہے وہی سب سے افضل ہے۔

اسی طرح انسان اور انسان کے درمیان اجتماعی ربط و تعلق یا فرق و امتیاز کی بنا بھی اس نظریہ میں کلیتہً تبدیل کر دی گئی ہے انسان نے اپنی ایجاد سے جن چیزوں کو اجتماع و افتراق کی بنا ٹھیرایا ہے وہ انسانیت کو بے شمار حصوں میں تقسیم کرتی ہیں اور ان حصوں کے درمیان ناقابل عبور دیواریں کھڑی کر دیتی ہیں۔ کیونکہ نسل، یا وطن، یا قومیت یا رنگ وہ چیزیں نہیں ہیں جن کو آدمی تبدیل کر سکتا ہو اور ایک گروہ میں سے دوسرے گروہ میں جا سکتا ہو۔ برعکس اس کے یہ نظریہ انسان اور انسان کے درمیان اجتماع و افتراق کی بنا خدا کی بندگی اور اس کے قانون کی پیروی رکھتا ہے جو لوگ مخلوقات کی بندگی چھوڑ کر خدا کی بندگی اختیار کر لیں اور خدا کے قانون کو اپنی زندگی کا واحد قانون تسلیم کر لیں وہ سب ایک جماعت ہیں، اور جو ایسا نہ کریں وہ دوسری جماعت۔ اس طرح تمام اختلافات مٹ کر صرف ایک اختلاف باقی رہ جاتا ہے اور وہ اختلاف بھی قابل عبور ہے۔ کیونکہ ہر وقت ایک شخص کے لئے ممکن ہے کہ اپنا عقیدہ اور طرز زندگی

بدل دے اور ایک جماعت سے دوسری جماعت میں چلا جائے۔

ان تمام اصلاحات کے بعد جو سوسائٹی اس نظریہ پر مبنی ہے اس کی ذہنیت، اسپرٹ، اور اجتماعی تعمیر (Social structure) بالکل بدلی ہوئی ہوتی ہے۔ اس میں اسٹیٹ انسان کی حاکمیت پر نہیں بلکہ خدا کی حاکمیت پر مبنی ہوتا ہے۔ حکومت خدا کی ہوتی ہے، قانون خدا کا ہوتا ہے، انسان صرف خدا کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ یہ چیز اول تو اُن ساری خرابیوں کو دُور کر دیتی ہے جو انسان پر انسان کی حکومت اور انسان کی قانون سازی سے پیدا ہوتی ہیں۔ پھر ایک عظیم الشان فرق جو اس نظریہ پر اسٹیٹ بننے سے واقع ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اسٹیٹ کے پورے نظام میں عبادت اور تقویٰ کی اسپرٹ پھیل جاتی ہے۔ راعی اور رعیت دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کی حکومت میں ہیں اور ہمارا معاملہ براہ راست اُس خدا سے ہے جو عالم الغیب والشہادہ ہے۔ ٹیکس دینے والا یہ سمجھ کر ٹیکس دیتا ہے کہ وہ خدا کو ٹیکس دے رہا ہے، اور ٹیکس لینے والے اور اس ٹیکس کو خرچ کرنے والے یہ سمجھتے ہوئے کام کرتے ہیں کہ یہ مال خدا کا مال ہے اور ہم امین کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں

[1] تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو "اسلام کا نظریہ سیاسی"

ایک سپاہی سے لیکر ایک جج اور گورنر تک ہر کارندہ حکومت اپنی ڈیوٹی اسی ذہنیت کے ساتھ انجام دیتا ہے جس ذہنیت کے ساتھ وہ نماز پڑھتا ہے دونوں کام اس کے لئے یکساں عبادت ہیں اور دونوں میں وہی ایک تقویٰ اور خشیت کی روح درکار ہے۔ باشندے اپنے اندر سے جن لوگوں کو خدا کی نیابت کا کام انجام دینے کیلئے چنتے ہیں ان میں سب سے پہلے جو صفت تلاش کی جاتی ہے وہ خوف خدا اور امانت و صداقت کی صفت ہے۔ اس طرح سطح پر وہ لوگ اُبھر کر آتے ہیں اور اختیارات ان کے ہاتھوں میں دیئے جاتے ہیں جو سوسائٹی میں سب سے بہتر اخلاق کے حامل ہوتے ہیں۔

تمدن و معاشرت میں بھی یہ نظریہ وہی تقویٰ اور طہارت اخلاق کی اسپرٹ پھیلا دیتا ہے۔ اس میں نفس پرستی کے بجائے خدا پرستی ہوتی ہے، ہر ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان خدا کا واسطہ حائل ہوتا ہے، اور خدا کا قانون دونوں کے تعلقات کو منضبط کرتا ہے یہ قانون چونکہ اس نے بنایا ہے جو تمام نفسانی خواہشات اور ذاتی اغراض سے پاک ہے، اور علیم و حکیم بھی ہے، اس لئے اس میں فتنے کا ہر دروازہ اور ظلم کا ہر راستہ بند کیا گیا ہے اور انسانی فطرت کے ہر پہلو اور اس کی ہر ضرورت کی رعایت کی گئی ہے۔

یہاں اتنا موقع نہیں کہ میں اُس پوری اجتماعی عمارت کا نقشہ پیش کروں جو اس نظریہ پر بنتی ہے۔ مگر جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ پیغمبروں نے جو نظریہ کائنات و انسان پیش کیا ہے وہ کس قسم کا رویہ پیدا کرتا ہے اور اس کے نتائج کیا ہیں اور کیا ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی نہیں کہ یہ محض کاغذ پر ایک خیالی نقشہ Utepia ہو، بلکہ تاریخ میں اس نظریہ پر ایک اجتماعی نظام اور ایک اسٹیٹ بنا کر دکھایا جا چکا ہے۔ اور تاریخ شاہد ہے کہ جیسے افراد اس نظریہ پر تیار کئے گئے تھے نہ اُن سے بہتر افراد کبھی روئے زمین پر پائے گئے اور نہ اس اسٹیٹ سے بڑھ کر کوئی اسٹیٹ انسان کے لئے رحمت ثابت ہوا۔ اس کے افراد میں اپنی اخلاقی ذمہ داری کا احساس اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک صحرائی عورت کو زنا سے حمل ہو جاتا ہے، وہ جانتی ہے کہ میرے لئے اس جرم کی سزا سنگساری جیسی ہولناک سزا ہے، مگر وہ خود چل کر آتی ہے اور درخواست کرتی ہے کہ اس پر سزا نافذ کی جائے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ وضع حمل کے بعد آئیو، اور بغیر کسی مچلکہ و ضمانت کے اُسے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وضع حمل کے بعد وہ پھر صحرا سے آتی ہے اور سزا دیئے جانے کی درخواست کرتی ہے اس سے کہا جاتا ہے کہ بچہ کو دودھ پلا اور جب دودھ

پلانے کی مدت ختم ہو جائے تب آئیو پھر وہ صحرا کی طرف واپس چلی جاتی ہے اور کوئی پولیس کی نگرانی اس پر نہیں ہوتی۔ رضاعت کی مدت ختم ہونے کے بعد وہ پھر آ کر التجا کرتی ہے کہ اب اسے سزا دے کر اُس گناہ سے پاک کر دیا جائے جو اس سے سرزد ہو چکا ہے۔ چنانچہ اسے سنگسار کیا جاتا ہے اور جب وہ مر جاتی ہے تو اُس کے لئے دعائے رحمت کی جاتی ہے۔ اور جب ایک شخص کی زبان سے اس کے حق میں اتفاقاً یہ کلمہ نکل جاتا ہے کہ کیسی بے حیا عورت تھی تو جواب میں فرمایا جاتا ہے کہ "خدا کی قسم! اس نے ایسی توبہ کی تھی کہ اگر ناجائز محصول لینے والا بھی ایسی توبہ کرتا تو بخش دیا جاتا"۔ یہ تو اس سوسائٹی کے افراد کا حال تھا اور اس اسٹیٹ کا حال یہ تھا کہ جس حکومت کی آمدنی کروڑوں روپے تک پہنچی ہوئی تھی، اور جس کے خزانے ایران و شام و مصر کی دولت سے معمور ہو رہے تھے، اُس کا صدر صرف ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ تنخواہ لیتا تھا، اور اس کے شہریوں میں ڈھونڈے سے بھی بمشکل کوئی ایسا شخص ملتا تھا جو خیرات لینے کا مستحق ہو۔

اس تجربہ کے بعد بھی اگر کسی شخص کو یہ اطمینان حاصل نہ ہو کہ انبیاء نے نظام کائنات کی حقیقت اور اس میں انسان کی حیثیت کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے وہ حق ہے تو ایسے شخص کے اطمینان

کے لئے کوئی دوسری صورت ممکن نہیں ہے، کیونکہ خدا اور فرشتوں اور آخرت کی زندگی کا براہ راست عینی مشاہدہ تو اسے بہر حال حاصل نہیں ہو سکتا۔ جہاں مشاہدہ ممکن نہ ہو وہاں تجربہ سے بڑھ کر صحت کا کوئی دوسرا معیار نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک طبیب بیمار کے اندر مشاہدہ کر کے یہ نہیں دیکھ سکتا کہ فی الواقع سسٹم میں کیا خرابی پیدا ہو گئی ہے تو مختلف دوائیں دے کر دیکھتا ہے، اور جو دوا اس اندھیری کوٹھڑی میں ٹھیک نشانہ پر جا کر بیٹھتی ہے اس کا مرض کو دور کر دینا ہی اس بات پر قطعی دلیل ہوتا ہے کہ سسٹم میں فی الواقع جو خرابی تھی یہ دوا اس کے عین مطابق تھی۔ اسی طرح جب انسانی زندگی کی کل کسی دوسرے نظریہ سے درست نہیں ہوتی اور صرف انبیاء کے نظریہ ہی سے درست ہوتی ہے تو یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ نظریہ حقیقت کے مطابق ہے۔ فی الواقع یہ کائنات اللہ کی سلطنت ہے اور واقعی اس زندگی کے بعد ایک زندگی ہے جس میں انسان کو اپنے کارنامۂ حیات دنیوی کا حساب دینا ہے ؂

فہرست مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

روداد جماعت اسلامی حصّہ اول	عہ ر
″ ″ ″ حصّہ دوم	۹ ر
″ ″ ″ حصّہ سوم	عہ ر

تبلیغی پمفلٹ

سلامتی کا راستہ	۶ ر
اسلام کا نظریۂ سیاسی	۶ ر
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟	۶ ر
اسلام اور جاہلیت	۷ ر
نیا نظام تعلیم	۶ ر
انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	۶ ر
دینِ حق	۷ ر
مذہب کا انقلابی تصوّر	۶ ر
نشانِ راہ	۶ ر
اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	۶ ر
جہاد فی سبیل اللہ	۶ ر
تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں	۶ ر
حقیقتِ شرک	عہ ۸ ر
دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات	عگہ ۸ ر مجلد

از

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

مکتبہ جماعت اسلامی" ذیلدار پارک اِچھرہ - لاہور

قیمت آٹھ آنے

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی طابع و ناشر نے
آفتاب عالم پریس لاہور میں چھپوا کر
مکتبہ جماعت اسلامی - لاہور - پاکستان
سے شائع کیا
تعداد اشاعت ... چار ہزار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اسلام کا نظریۂ سیاسی

(یہ مقالہ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ، لاہور کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔)

اسلام کے متعلق یہ فقرہ آپ اکثر سنتے رہتے ہیں کہ یہ ایک "جمہوری نظام ہے"۔ پچھلی صدی کے آخری دور سے اس فقرے کا بار بار اعادہ کیا جا رہا ہے۔ مگر جو لوگ اس کو زبان سے نکالتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ ان میں سے ایک فی ہزار بھی ایسے نہیں ہیں جنہوں نے اس دین کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہو اور یہ سمجھنے کی کوشش کی ہو کہ اسلام میں جمہوریت کس حیثیت سے ہے اور کس نوعیت کی ہے۔ ان میں سے بعض لوگ تو اسلامی نظامِ جماعت کی چند ظاہری شکلوں کو دیکھ کر اس پر جمہوریت کا نام چسپاں کر دیتے ہیں، اور اکثر ایسے ہیں جن کی ذہنیت کچھ اس طور پر مبنی ہے کہ دنیا میں (اور خصوصاً

ان کے حکمرانوں میں) جو چیز مقبولِ عام ہو اس کو کسی نہ کسی طرح اسلام میں موجود ثابت کر دینا اُن کے نزدیک اس مذہب کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ شاید وہ اسلام کو اس یتیم بچے کی طرح سمجھتے ہیں جو ہلاکت سے بس اسی طرح بچ سکتا ہے کہ کسی با اثر شخص کی سرپرستی اس کو حاصل ہو جائے۔ یا پھر غالباً ان کا خیال یہ ہے کہ ہماری عزت محض مسلمان ہونے کی حیثیت سے قائم نہیں ہو سکتی، بلکہ صرف اسی طرح قائم ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے مسلک میں دنیا کے کسی چلتے ہوئے مسلک کے اصولوں کی جھلک دکھا دیں۔ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ جب دنیا میں اشتراکیت کا غلغلہ بلند ہوا تو مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں نے پکارنا شروع کیا کہ اشتراکیت تو محض اسلام ہی کا ایک جدید ایڈیشن ہے، اور جب ڈکٹیٹر شپ کا آوازہ اُٹھا تو کچھ دوسرے لوگوں نے اطاعتِ امیر، اطاعتِ امیر کی صدائیں بلند کرنی شروع کر دیں، اور لگے کہنے کہ یہاں سارا نظامِ جماعت ڈکٹیٹر شپ ہی پر قائم ہے۔ غرض اسلام کا نظریہ سیاسی اس زمانہ میں ایک چیستان، ایک چوں چوں کا مربہ بن کر رہ گیا ہے جس میں سے ہر وہ چیز نکال کر دکھا دی جاتی ہے جس کا بازار میں چلن ہو۔ ضرورت ہے کہ باقاعدہ علمی طریقہ سے اس امر کی تحقیق کی جائے کہ فی الواقع اسلام کا سیاسی نظریہ ہے کیا۔ اس طرح نہ صرف ان پراگندہ خیالیوں کا خاتمہ ہو جائے گا جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں، اور نہ صرف اُن لوگوں کا منہ بند ہو جائے گا جنہوں نے حال میں علی الاعلان یہ کہہ کر اپنی جہالت کا ثبوت دیا تھا کہ "اسلام سرے سے کوئی سیاسی و تمدنی نظام تجویز ہی نہیں کرتا"، بلکہ درحقیقت تاریکیوں میں بھٹکنے والی دنیا

کے سامنے ایک ایسی روشنی نمودار ہوجائے گی جس کی وہ سخت حاجتمند ہے ، اگرچہ اپنی اس حاجتمندی کا شعور نہیں رکھتی۔

تمام اسلامی نظریات کی اساس سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کرلیجئے کہ اسلام محض چند منتشر خیالات اور منتشر طریقہائے عمل کا مجموعہ نہیں ہے جس میں ادھر اُدھر سے مختلف چیزیں لاکر جمع کردی گئی ہوں ، بلکہ یہ ایک باضابطہ نظام ہے جس کی بنیاد چند مضبوط اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اس کے بڑے بڑے ارکان سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے جزئیات تک ہر چیز اس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں کے متعلق اس نے جتنے قاعدے اور ضابطے مقرر کئے ہیں اُن سب کی روح اور ان کا جوہر اس کے اصول اولیہ ہی سے ماخوذ ہے۔ ان اصول اولیہ سے پوری اسلامی زندگی اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ بالکل اسی طرح نکلتی ہے جس طرح درخت میں آپ دیکھتے ہیں کہ بیج سے جڑیں اور جڑوں سے تنہ ، اور تنہ سے شاخیں ، اور شاخوں سے پتیاں پھوٹتی ہیں ، اور خوب پھیل جانے کے باوجود اس کی ایک ایک پتی اپنی جڑ کے ساتھ مربوط رہتی ہے۔ پس آپ اسلامی زندگی کے جس شعبے کو بھی سمجھنا چاہیں آپ کے لئے ناگزیر ہے کہ اس کی جڑ کی طرف رجوع کریں ، کیونکہ اس کے بغیر آپ اس کی روح کو نہیں پاسکتے۔

انبیاء علیہم السلام کا مشن اسلام کے متعلق یہ بات تو آپ مجملاً جانتے ہی ہیں کہ یہ انبیاء علیہم السلام کا مشن ہے۔ یہ صرف محمد بن عبداللہ صلے اللہ علیہ وسلم ہی کا مشن نہیں ہے ، بلکہ انسانی تاریخ کے قدیم ترین دور سے جتنے انبیاء بھی خدا

کی طرف سے آئے ہیں، اُن سب کا یہی مشن تھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی اجمالی طور پر آپ کو معلوم ہے کہ یہ سب نبی ایک خدا کی خدائی منوانے اور اسی کی عبادت کرانے آئے تھے۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کا پردہ اٹھا کر ذرا آپ گہرائی میں اُتریں۔ سب کچھ اسی پردے کے پیچھے چھپا ہوا ہے تجسس کی نگاہ ڈال کر اچھی طرح دیکھئے کہ ایک خدا کی خدائی منوانے سے مقصد کیا تھا، اور صرف اسی کی عبادت کرانے کا مطلب کیا تھا؟ اور آخر اس میں ایسی کونسی بات تھی کہ جہاں کسی اللہ کے بندے نے مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ کا اعلان کیا اور ساری طاغوتی طاقتیں جھاڑ کا کانٹا بن کر اس کو چمٹ گئیں؟ اگر بات صرف اتنی ہی تھی جتنی آج کل سمجھی جاتی ہے کہ مسجد میں خدائے واحد کے آگے سجدہ کر لو اور پھر باہر نکل کر حکومتِ وقت (جو بھی وقت کی حکومت ہو) کی وفاداری اور اطاعت میں لگ جاؤ تو کس کا سر پھرا تھا کہ اتنی سی بات کے لئے خواہ مخواہ اپنی وفادار رعایا کی مذہبی آزادی میں مداخلت کرتا؟ آئیے ہم تحقیق کر کے دیکھیں کہ خدا کے بارے میں انبیاء علیہم السلام کا اور دنیا کی دوسری طاقتوں کا اصل جھگڑا کس بات پر تھا۔

قرآن میں ایک جگہ نہیں بکثرت مقامات پر یہ بات صاف کر دی گئی ہے کہ کفار و مشرکین، جن سے انبیاء کی لڑائی تھی، اللہ کے منکر نہ تھے۔ ان سب کو تسلیم تھا کہ اللہ ہے، اور وہی زمین و آسمان کا خالق اور خود ان کفار و مشرکین کا خالق بھی ہے۔ کائنات کا سارا انتظام اسی کے

اشارے سے ہو رہا ہے، وہی پانی برساتا ہے، وہی ہواؤں کو گردش دیتا ہے، اسی کے ہاتھ میں سورج اور چاند اور زمین سب کچھ ہیں:-

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ؕ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ؕ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ؕ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ؕ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ؕ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ؕ (المومنون-۵)

ان سے پوچھو کہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے وہ کس کا ہے، بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے اللہ کا ہے۔ کہو، پھر تم غور نہیں کرتے؟ ان سے پوچھو ساتوں آسمانوں کا رب اور عرش عظیم کا رب کون ہے؟ کہیں گے اللہ، کہو پھر تم اس سے ڈرتے نہیں؟ ان سے پوچھو وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اختیار ہے اور وہ سب کو پناہ دیتا ہے مگر کوئی اس کے مقابلہ میں کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ بتاؤ اگر تم جانتے ہو؟ وہ کہیں گے کہ اللہ، کہو پھر تم کس دھوکے میں ڈال دیئے گئے ہو؟

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ۚ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۔ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَّزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِ

اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے؟ اور کس نے سورج اور چاند کو تابع فرمان بنا رکھا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ خدا نے۔ پھر یہ آخر کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں؟ اور اگر تم ان سے

مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔ (عنکبوت - ۶)

پوچھو کہ کس نے آسمان سے پانی آتارا اور کس نے مری ہوئی زمین کو روئیدگی بخشی؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ۔ (الزخرف - ۷)

اور اگر تم ان سے پوچھو کہ تم کو کس نے پیدا کیا ہے؟ وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ پھر آخر یہ کدھر بھٹکائے جا رہے ہیں؟

ان آیات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کے ہونے میں اور اس کے خالق ہونے اور مالکِ ارض وسما ہونے میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ لوگ ان باتوں کو خود ہی مانتے تھے۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ انہی باتوں کو منوانے کے لئے تو انبیاء کے آنے کی ضرورت تھی ہی نہیں۔ اب پوچھئے کہ انبیاء کی آمد کس لئے تھی اور جھگڑا کس چیز کا تھا؟

قرآن کہتا ہے کہ سارا جھگڑا اس بات پر تھا کہ انبیاء کہتے تھے، جو تمہارا اور زمین و آسمان کا خالق ہے وہی تمہارا رب اور الٰہ بھی ہے، اس کے سوا کسی کو الٰہ اور رب نہ مانو۔ مگر دنیا اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہ تھی۔

آئیے ذرا پھر تجسس کریں کہ اس جھگڑے کی تہ میں کیا ہے؟ الٰہ سے کیا مراد ہے؟ رب کسے کہتے ہیں؟ انبیاء کو کیوں اصرار تھا کہ صرف اللہ ہی کو الٰہ اور رب مانو؟ اور دنیا کیوں اس بات پر لڑنے کھڑی ہو جاتی تھی؟

الٰہ کے معنی | الٰہ کے معنی آپ سب جانتے ہیں کہ معبود کے ہیں، مگر معاف کیجئے گا

معبود کے معنی آپ بھول گئے ہیں۔ معبود کا مادہ عبد ہے۔ عبد بندے اور غلام کو کہتے
ہیں۔ عبادت کے معنی محض پوجا کے نہیں ہیں، بلکہ بندہ اور غلام جو زندگی غلامی اور
بندگی کی حالت میں بسر کرتا ہے، وہ پوری کی پوری سراسر عبادت ہے۔ خدمت
کے لئے کھڑا ہونا، احترام میں ہاتھ باندھنا، اعترافِ بندگی میں سر جھکانا، جذبۂ
وفاداری سے سرشار ہونا، فرماں برداری میں دوڑ دھوپ اور سعی وجہد کرنا،
جس کام کا اشارہ ہو اُسے بجالانا، جو کچھ آقا طلب کرے اُسے پیش کر دینا،
اس کی طاقت و جبروت کے آگے ذلت اور عاجزی اختیار کرنا، جو قانون وہ
بنائے اس کی اطاعت کرنا، جس کے خلاف وہ حکم دے اُس پر چڑھ دوڑنا،
جہاں اُس کا فرمان ہو، سر تک کٹوا دینا، یہ عبادت کا اصل مفہوم ہے، اور
آدمی کا معبود حقیقت میں وہی ہے جس کی عبادت وہ اس طرح سے کرتا ہے۔

رب کا مفہوم

اور "رب" کا مفہوم کیا ہے؟ عربی زبان میں رب کے اصلی
معنی پرورش کرنے والے کے ہیں۔ اور چونکہ دنیا میں پرورش کرنے والے ہی کی
اطاعت و فرماں برداری کی جاتی ہے۔ لہٰذا رب کے معنی مالک اور آقا کے بھی
ہوئے۔ چنانچہ عربی محاورہ میں مال کے مالک کو ربُّ المال، اور صاحب خانہ
کو ربُّ الدار کہتے ہیں۔ آدمی جس کو اپنا رازق اور اپنا مربی سمجھے، جس سے نوازش
اور سرفرازی کی امید رکھے، جس سے عزت اور ترقی اور امن کا متوقع ہو، جس
کی نگاہِ لطف کے پھر جانے سے خوف کرے کہ میری زندگی بگڑ جائے گی، جس کو
اپنا آقا اور مالک قرار دے اور جس کی فرمانبرداری اور اطاعت کرے وہی اُس
کا رب[1] ہے۔

[1] ان دونوں اصطلاحوں کی مفصل تشریح کے لئے ملاحظہ ہو "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں"۔

ان دونوں لفظوں کے معنی پر نگاہ رکھئے اور پھر غور سے دیکھئے، انسان کے مقابلہ میں یہ دعویٰ لے کر کون کھڑا ہو سکتا ہے کہ میں تیرا الٰہ ہوں، اور میں تیرا رب ہوں، میری بندگی و عبادت کر؟ کیا درخت؟ پتھر؟ دریا؟ جانور؟ سورج؟ چاند؟ تارے؟ کسی میں بھی یہ یارا ہے کہ وہ انسان کے سامنے آکر یہ دعویٰ پیش کر سکے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ وہ صرف انسان ہی ہے جو انسان کے مقابلہ میں خدائی کا دعویٰ لے کر اٹھتا ہے اور اٹھ سکتا ہے۔ خدائی کی ہوس انسان ہی کے سر میں سما سکتی ہے۔ انسان ہی کی حد سے بڑھی ہوئی خواہش اقتدار، یا خواہش انتفاع اُسے اس بات پر ابھارتی ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کا خدا بنے، ان سے اپنی بندگی کرائے، ان کے سر اپنے آگے جھکوائے، ان پر اپنا حکم چلائے، ان کو اپنی خواہشات کے حصول کا آلہ بنائے۔ یہ خدا بننے کی لذت ایسی ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی لذیذ چیز انسان آج تک دریافت نہیں کر سکا ہے جس کو کچھ طاقت، یا دولت، یا چالاکی یا ہوشیاری یا کسی نوع کا کچھ زور حاصل ہے وہ یہی چاہتا ہے کہ اپنے فطری اور جائز حدود سے آگے بڑھے پھیل جائے اور آس پاس کے انسانوں پر، جو اس کے مقابلہ میں ضعیف یا مفلس یا بے وقوف یا کسی حیثیت سے بھی کمزور ہوں، اپنی خدائی کا سکہ جما دے۔

اس قسم کی ہوس خداوندی رکھنے والے لوگ دو طرح کے ہوتے ہیں اور دو مختلف راستے اختیار کرتے ہیں۔

ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن میں زیادہ جرأت ہوتی ہے، یا جن کے پاس

خدائی کے ٹھاٹھ جمانے کے لئے کافی ذرائع ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ براہِ راست اپنی خدائی کا دعویٰ پیش کر دیتے ہیں۔ مثلاً ایک وہ فرعون تھا جس نے اپنی بادشاہی اور اپنے لشکروں کے بل بوتے پر مصر کے باشندوں سے کہہ دیا کہ اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی (میں تمہارا سب سے اونچا رب ہوں)، اور مَا عَلِمْتُ لَکُمْ مِّنْ اِلٰہٍ غَیْرِیْ (میں نہیں جانتا کہ میرے سوا تمہارا اور بھی کوئی الٰہ ہے) جب حضرت موسیٰؑ نے اس کے سامنے اپنی قوم کی آزادی کا مطالبہ پیش کیا، اور اس سے کہا کہ تو خود بھی اللہ العالمین کی بندگی اختیار کر، تو اس نے کہا کہ میں تم کو جیل بھیج دینے کی قدرت رکھتا ہوں۔ لہٰذا تم مجھ کو الٰہ تسلیم کرو۔ لَئِنِ اتَّخَذْتَ اِلٰھًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّکَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ۔ اسی طرح ایک وہ بادشاہ تھا جس سے حضرت ابراہیمؑ کی بحث ہوئی تھی۔ قرآن میں اس کا ذکر جن الفاظ کے ساتھ آیا ہے انہیں ذرا غور سے پڑھئے:۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْ حَآجَّ اِبْرٰھٖمَ فِیْ رَبِّہٖٓ اَنْ اٰتٰہُ اللّٰہُ الْمُلْکَ اِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ قَالَ اِبْرٰھٖمُ فَاِنَّ اللّٰہَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِھَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُھِتَ الَّذِیْ کَفَرَ۔

(بقرہ - ۳۵)

تو نے نہیں دیکھا اُس شخص کو جس نے ابراہیم سے حجت کی اس بارے میں کہ ابراہیم کا رب کون ہے اور یہ حجت کیوں کی؟ اس لئے کہ اللہ نے اس کو حکومت دے رکھی تھی جب ابراہیم نے کہا کہ میرا رب وہ ہے۔ جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے تو اس نے جواب دیا کہ زندگی اور موت تو میرے ہاتھ میں ہے۔ ابراہیم نے کہا،

اچھا اللہ تو سورج کو مشرق کی طرف سے لاتا ہے، تو ذرا مغرب کی طرف سے نکال لا۔" یہ سُن کر وہ کافر ہکا بکا رہ گیا۔

غور کیجئے! وہ کافر ہکا بکا کیوں رہ گیا؟ اس لئے کہ وہ اللہ کا منکر نہ تھا۔ وہ اس بات کا قائل تھا کہ کائنات کا فرماں روا اللہ ہی ہے۔ سورج کو وہی نکالتا اور وہی غروب کرتا ہے۔ جھگڑا اس بات میں نہ تھا کہ کائنات کا مالک کون ہے بلکہ اس بات میں تھا کہ انسانوں کا اور خصوصاً ارضِ بابل کے باشندوں کا مالک کون ہے۔ وہ اللہ ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتا تھا بلکہ اس بات کا دعویٰ رکھتا تھا کہ اس ملک کے باشندوں کا رب میں ہوں۔ اور یہ دعویٰ اس بنا پہ تھا کہ حکومت اس کے ہاتھ میں تھی، لوگوں کی جانوں پہ وہ قابض و متصرف تھا، اپنے آپ میں یہ قدرت پاتا تھا کہ جسے چاہے پھانسی پہ لٹکا دے۔ اور جس کی چاہے جاں بخشی کر دے۔ یہ سمجھتا تھا کہ میری زبان قانون ہے اور میرا حکم ساری رعایا پر چلتا ہے۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ سے اس کا مطالبہ یہ تھا کہ مجھے رب تسلیم کرو، میری بندگی اور عبادت کرو۔ مگر جب حضرت ابراہیمؑ نے کہا کہ میں تو اسی کو رب مانوں گا اور اسی کی بندگی و عبادت بھی کروں گا جو زمین و آسمان کا رب ہے اور جس کی عبادت یہ سورج بھی کر رہا ہے تو وہ حیران رہ گیا اور اس لئے حیران رہ گیا کہ ایسے شخص کو کیوں کر قابو میں لاؤں۔[۱] یہ خدائی جس کا دعویٰ فرعون اور نمرود نے کیا تھا، کچھ انہی دو

---

[۱] اس مضمون کی مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں"

آدمیوں تک محدود نہ تھی۔ دنیا میں ہر جگہ فرماں رواؤں کا یہی دعویٰ تھا اور یہی دعویٰ ہے۔ ایران میں بادشاہ کے لئے خدا اور خداوند کے الفاظ مستعمل تھے اور ان کے سامنے پورے مراسم عبودیت بجالائے جاتے تھے۔ حالانکہ کوئی ایرانی ان کو خدائے خدائیگاں (یعنی اللہ) نہیں سمجھتا تھا، اور نہ وہ خود اس کے مدعی تھے۔ اسی طرح ہندوستان میں فرماں رواخاندان اپنا نسب دیوتاؤں سے ملاتے تھے ——— چنانچہ سورج بنسی اور چندر بنسی آج تک مشہور ہیں ——— راجہ کو اَن داتا یعنی رازق کہا جاتا تھا اور اس کے سامنے سجدے کئے جاتے تھے۔ حالانکہ پرمیشور ہونے کا دعویٰ نہ کسی راجہ کو تھا اور نہ پرجا ہی ایسا سمجھتی تھی۔ ایسا ہی حال دنیا کے دوسرے ممالک کا بھی تھا اور آج بھی ہے۔ بعض جگہ فرماں رواؤں کے لئے الٰہ اور رب کے ہم معنی الفاظ اب بھی صریحاً بولے جاتے ہیں، مگر جہاں یہ نہیں بولے جاتے وہاں اسپرٹ وہی ہے جو ان الفاظ کے مفہوم میں پوشیدہ ہے۔ اس نوع کے دعوائے خداوندی کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی صاف الفاظ میں الٰہ اور رب ہونے ہی کا دعوےٰ کرے۔ نہیں، وہ سب لوگ جو انسانوں پر اس اقتدار، اس فرماں روائی و حکمرانی، اس آقائی و خداوندی کو قائم کرتے ہیں، جیسے فرعون اور نمرود نے قائم کیا تھا، دراصل وہ الٰہ اور رب کے معنی و مفہوم کا دعوےٰ کرتے ہیں، چاہے الفاظ کا دعویٰ نہ کریں۔ اور وہ سب لوگ جو ان کی اطاعت و بندگی کرتے ہیں وہ بہر حال ان کے الٰہ و رب ہونے کو تسلیم کرتے ہیں، چاہے زبان سے یہ الفاظ نہ کہیں۔

غرض ایک قسم تو انسانوں کی وہ ہے جو براہ راست اپنی الٰہیت اور ربوبیت کا دعویٰ کرتی ہے۔ دوسری قسم وہ ہے جس کے پاس اتنی طاقت نہیں ہوتی، اتنے ذرائع نہیں ہوتے کہ خود ایسا دعویٰ لے کر اُٹھیں اور اُسے منوالیں۔ البتہ چالاکی اور فریب کاری کے ہتھیار ہوتے ہیں جن سے وہ عام انسانوں کے دل و دماغ پر جادو کر سکتے ہیں، سو ان ذرائع سے کام لے کر وہ کسی روح، کسی دیوتا، کسی بُت، کسی قبر، کسی سیارے، کسی درخت کو الٰہ بنا دیتے ہیں، اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ تمہیں نفع اور ضرر پہنچانے پر قادر ہیں، یہ تمہاری حاجت روائی کر سکتے ہیں، یہ تمہارے ولی اور محافظ اور مددگار ہیں، ان کو خوش نہ کرو گے تو یہ تمہیں قحط اور بیماریوں اور مصیبتوں میں مبتلا کر دیں گے، انہیں خوش کر کے حاجتیں طلب کرو گے تو یہ تمہاری مدد کو پہنچیں گے، مگر انہیں خوش کرنے اور ان کو تمہارے حال پر متوجہ کرنے کے طریقے ہم کو معلوم ہیں، ان تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہی بن سکتے ہیں، ہماری بزرگی تسلیم کرو، ہمیں خوش کرو، اور ہمارے ہاتھ میں اپنی جان و مال و آبرو سب کچھ دے دو۔ بہت سے بے وقوف انسان اس جال میں پھنس جاتے ہیں، اور یوں جھوٹے خداؤں کی آڑ میں ان پروہتوں اور پجاریوں اور مجاوروں کی خداوندی قائم ہوتی ہے۔

اسی نوع میں کچھ دوسرے لوگ ہیں جو کہانت اور نجوم اور فال گیری اور تعویذ گنڈوں اور منتروں کے وسیلے اختیار کرتے ہیں۔ کچھ اور لوگ ہیں جو اللہ کی بندگی کا اقرار تو کرتے ہیں، مگر کہتے ہیں کہ تم براہ راست

اللہ تک نہیں پہنچ سکتے، اس کی بارگاہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہم ہیں، عبادت کے مراسم ہمارے ہی واسطے سے ادا ہوں گے، اور تمہاری پیدائش سے لے کر موت تک ہر مذہبی رسم ہمارے ہاتھوں سے انجام پائے گی۔ کچھ دوسرے لوگ ہیں جو اللہ کی کتاب کے حامل بن جاتے ہیں، عام لوگوں کو اس کے علم سے محروم کر دیتے ہیں۔ اور خود اپنے زعم میں خدا کی زبان بن کر حلال و حرام کے احکام دینے شروع کر دیتے ہیں۔ یوں انکی زبان قانون بن جاتی ہے، اور وہ انسانوں کو خدا کے بجائے خود اپنے حکم کا تابع بنا لیتے ہیں۔ یہی اصل ہے اس برہمنیت اور پاپائیت کی جو مختلف ناموں اور مختلف صورتوں سے قدیم ترین زمانہ سے آج تک دنیا کے مختلف گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے، اور جس کی بدولت بعض خاندانوں، نسلوں یا طبقوں نے عام انسانوں پر اپنی سیادت کا سکہ جما رکھا ہے۔

فتنہ کی جڑ اس نظر سے جب آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دنیا میں فتنہ کی اصل جڑ اور فساد کا اصلی سرچشمہ انسان پر انسان کی خدائی ہے، خواہ وہ بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ۔ اسی سے خرابی کی ابتدا ہوئی اور اسی سے آج بھی بس کے زہریلے چشمے پھوٹ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تو خیر انسان کی فطرت کے سارے راز ہی جانتا ہے۔ مگر اب تو ہزارہا برس کے تجربہ سے خود ہم پر بھی یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو چکی ہے کہ انسان کسی نہ کسی کو الٰہ اور رب مانے بغیر رہ ہی نہیں سکتا،

گویا کہ اس کی زندگی محال ہے اگر کوئی اس کا الٰہ اور رب نہ ہو، اگر اللہ کو نہ ماننے گا تب بھی اسے الٰہ اور رب سے چھٹکارا نہیں ہے بلکہ اس صورت میں بہت سے آلہتہ اور ارباب اس کی گردن پر مسلط ہو جائیں گے۔

غور سے دیکھئے۔کیا روس میں کمیونسٹ پارٹی کی سیاسی مجلس Political Bureau کے ارکان باشندگان روس کے ارباب و آلہتہ نہیں ہیں اور کیا اسٹالین ان کا رب الارباب نہیں؟ روس کا کونسا گاؤں اور کونسا زرعی فارم ایسا ہے جہاں اس خدائے روسیاں کی تصویر موجود نہیں؟ ابھی پولینڈ کے جس حصہ پر روس نے قبضہ کیا ہے[1] اس میں سوویٹ سسٹم کی بسم اللہ آپ کو معلوم ہے کس طرح ہوئی؟ اسٹالین کی تصویریں ہزاروں کی تعداد میں درآمد کی گئیں، گاؤں گاؤں میں پہنچائی گئیں تاکہ سب سے پہلے وہ اپنے الٰہ العظیم اور رب کبیر سے واقف ہو لیں، تب ان کو دینِ بالشویکی میں داخل کیا جائے۔سوال یہ ہے کہ آخر ایک انسان کو یہ اہمیت کیوں؟ کیا وجہ ہے کہ ایک آدمی کو خواہ وہ جماعت Community کی نمائندگی ہی کر رہا ہو، کروڑوں انسانوں کے دماغوں اور ان کی روحوں پر اس طرح مسلط کر دیا جائے کہ اس کی شخصیت کا جبروت اور اس کی کبریائی ان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو جائے؟ اسی طریقہ سے تو شخصی اقتدار دنیا میں قائم ہوتا ہے۔یونہی تو انسان انسانوں کا خدا بنتا ہے۔یہی تو وہ ڈھنگ ہیں جن سے فرعونیت اور نمرودیت اور زاریت و

[1] خیال رہے کہ یہ مقالہ اکتوبر ۱۹۳۹ء میں لکھا گیا تھا

وقیصریت کی جڑیں ہر زمانہ میں مستحکم ہوئی ہیں۔

اسی طرح اٹلی کو دیکھئے۔ وہاں فاشسٹ گرانڈ کونسل الہٰوں کا مجمع ہے اور مسولینی ان کا سب سے بڑا الٰہ۔ جرمنی میں نازی پارٹی کے لیڈر آلہہ ہیں اور ہٹلر ان کا الٰہ کبیر۔ انگلستان بھی اپنی ڈیموکریسی کے باوجود بینک آف انگلینڈ کے ڈائرکٹروں اور چند اونچے طبقے کے امراء و مدبرین میں اپنے آلہہ رکھتا ہے۔ امریکہ میں وال اسٹریٹ کے چند مٹھی بھر سرمایہ دار تمام ملک کے ارباب و آلہہ بنے ہوئے ہیں۔

غرض آپ جدھر نظر ڈالیں گے کہیں ایک قوم دوسری قوم کی الٰہ ہے۔ کہیں ایک طبقہ دوسرے طبقوں کا الٰہ ہے۔ کہیں ایک پارٹی نے الٰہیت و ربوبیت کے مقام پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اور کہیں ڈکٹیٹر مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ کی منادی کر رہا ہے۔ انسان کسی ایک جگہ بھی الٰہ کے بغیر نہ رہا۔

پھر انسان پر انسان کی خدائی قائم ہونے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ وہی جو ایک کمینے کم ظرف آدمی کو پولیس کمشنر بنا دینے، یا ایک جاہل تنگ نظر آدمی کو وزیر اعظم بنا دینے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اوّل تو خدائی کا نشہ ہی کچھ ایسا ہے کہ آدمی اس شراب کو پی کر کبھی اپنے قابو میں رہ نہیں سکتا۔ اور بالفرض اگر وہ قابو میں رہ بھی جائے تو خدائی کے فرائض انجام دینے کے لئے جس علم کی ضرورت ہے اور جس بے لوثی و بے غرضی اور بے نیازی کی حاجت ہے وہ انسان کہاں سے لائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ جہاں جہاں انسانوں

پر انسانوں کی الہیت و ربوبیت قائم ہوئی وہاں ظلم، طغیان، ناجائز انتفاع، بے اعتدالی اور ناہمواری نے کسی نہ کسی صورت سے راہ پا ہی لی۔ وہاں انسانی روح اپنی فطری آزادی سے محروم ہو کر ہی رہی۔ وہاں انسان کے دل و دماغ پر اور اس کی پیدائشی قوتوں اور صلاحیتوں پر ایسی بندشیں عائد ہو کر رہیں جنہوں نے انسانی شخصیت کے نشو و ارتقا کو روک دیا۔ کس قدر سچ فرمایا اس صادق و مصدوق علیہ و علیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام نے:

قال اللہ عز وجل انی خلقت عبادی حنفاء فجاءتھم الشیٰطین فاجتالتھم من دینھم وحرمت علیھم ما احللت لھم۔

(حدیث قدسی)

اللہ عز و جل فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو صحیح فطرت پر پیدا کیا تھا پھر شیطانوں نے ان کو آگھیرا، انہیں فطرت کی راہ راست سے بھٹکا لے گئے اور جو کچھ میں نے ان کے لئے حلال کیا تھا ان شیطانوں نے ان کو اس سے محروم کر کے رکھ دیا۔

جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں، یہ ہے وہ چیز جو انسان کے سارے مصائب، اس کی ساری تباہیوں، اس کی تمام محرومیوں کی اصل جڑ ہے یہ اس کی ترقی میں اصلی رکاوٹ ہے، یہ وہ روگ ہے جو اس کے اخلاق اور اس کی روحانیت کو، اس کی علمی و فکری قوتوں کو، اس کے تمدن اور اس کی معاشرت کو، اس کی سیاست اور اس کی معیشت کو، اور قصہ مختصر اس کی انسانیت کو تپ دق کی طرح کھا گیا ہے، قدیم ترین زمانہ سے کھا رہا ہے اور آج تک کھائے چلا جاتا ہے۔ اس روگ کا علاج بجز اس کے

کچھ ہے ہی نہیں کہ انسان سارے ارباب اور تمام الٰہوں کا انکار کر کے صرف اللہ کو اپنا الٰہ اور صرف رب العالمین کو اپنا رب قرار دے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ اس کی نجات کے لئے نہیں ہے، کیونکہ ملحد اور دہریہ بن کر بھی تو وہ الٰہوں اور ارباب سے چھٹکارا نہیں پا سکتا۔

انبیاء کا اصل اصلاحی کام | یہی وہ بنیادی اصلاح تھی جو انبیاء علیہم السلام نے انسانی زندگی میں کی۔ وہ در اصل انسان پر انسان کی خدائی تھی جس کو مٹانے کے لئے یہ لوگ آئے۔ ان کا اصلی مشن یہ تھا کہ انسان کو اس ظلم سے، ان جھوٹے خداؤں کی بندگی سے، اس طغیان اور ناجائز انتفاع سے نجات دلائیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جو انسان، انسانیت کی حد سے آگے بڑھ گئے ہیں انہیں دھکیل کر پھر اس حد میں واپس پہنچائیں؛ جو اس حد سے نیچے گرا دیئے گئے ہیں انہیں اُبھار کر اس حد تک اُٹھا لائیں، اور سب کو ایک ایسے عادلانہ نظامِ زندگی کا پابند بنا دیں جس میں کوئی انسان نہ کسی دوسرے انسان کا عبد ہو نہ معبود، بلکہ سب ایک اللہ کے بندے بن جائیں۔ ابتدا سے جتنے نبی دنیا میں آئے ان سب کا ایک ہی پیغام تھا اور وہ یہ تھا کہ یَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ۔ "لوگو! اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا کوئی تمہارا الٰہ نہیں ہے"[1] یہی حضرت نوحؑ نے کہا۔ یہی حضرت ہودؑ نے کہا۔ یہی حضرت صالحؑ نے کہا یہی حضرت شعیبؑ نے کہا۔ اور اسی کا اعلان محمد عربی صلے اللہ علیہ وسلم

[1] ملاحظہ ہو سورۂ ہود۔ رکوع ۴-۵-۶-۸۔

نے کیا ہے :-

اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ - رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا

(ص-٥)

میں تمہیں خبردار کرنے آیا ہوں۔ کوئی الٰہ نہیں ہے بجز اس ایک اللہ کے جو سب پر غالب ہے، جو رب ہے آسمانوں اور زمین کا اور ہر اس چیز کا جو آسمان و زمین کے درمیان ہے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ... ... وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۢ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ

(اعراف-٧)

یقیناً تمہارا رب اللہ ہے جس نے پیدا کیا ہے آسمانوں اور زمین کو ... ... اور سورج اور چاند اور تاروں کو، سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔ خبردار! خلق بھی اسی کی ہے اور حکومت بھی اُسی کی۔

ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ - لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ - خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِيْلٌ

(انعام-١٣)

وہ ہے اللہ، وہی تمہارا رب ہے اور اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، وہ ہر چیز کا خالق ہے، لہٰذا تم اس کی بندگی کرو۔ اور وہ ہر چیز پر نگہبان ہے۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ

(البینہ)

ان کو کوئی حکم نہیں دیا گیا بجز اس کے کہ اللہ کی بندگی کریں، سب کو چھوڑ کر صرف اس کی اطاعت کریں۔

تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ

آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے

وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران ۷)

اور تمہارے درمیان یکساں ہے یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی ہم بندگی نہ کریں، اور خدائی میں کسی کو اس کا شریک نہ قرار دیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا رب نہ بنالے۔

یہی وہ منادی تھی جس نے انسان کی روح اور اس کی عقل و فکر اور اس کی ذہنی و مادی قوتوں کو غلامی کی ان بندشوں سے رہا کرایا جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے، اور وہ بوجھ ان پر سے اتارے جن کے نیچے وہ دبے ہوئے تھے۔ یہ انسان کے لئے حقیقی آزادی کا چارٹر تھا۔ محمد رسول اللہ کے اسی کارنامے کے متعلق قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ یعنی یہ نبی ان پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو ان پر لدے ہوئے تھے اور ان بندھنوں کو کاٹتا ہے جن میں وہ کسے ہوئے تھے۔

نظریۂ سیاسی کا نقطۂ آغاز

انبیاء علیہم السلام نے انسانی زندگی کے لئے جو نظام مرتب کیا اس کا مرکز و محور اس کی روح اور اس کا جوہر یہی عقیدہ ہے اور اسی پر اسلام کے نظریۂ سیاسی کی بنیاد بھی قائم ہے۔ اسلامی سیاست کا اولین اصول یہ ہے کہ حکم دینے اور قانون بنانے کے اختیارات تمام انسانوں سے فرداً

فرداً اور مجتمعاً سلب کر لئے جائیں، کسی شخص کا یہ حق تسلیم نہ کیا جائے کہ وہ حکم دے اور دوسرے اس کی اطاعت کریں، وہ قانون بنائے اور دوسرے اس کی پابندی کریں۔ یہ اختیار صرف اللہ کو ہے۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِیَّاہُ۔ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ۔ (یوسف۔ ۵)	حکم سوائے اللہ کے کسی اور کا نہیں۔ اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کرو یہی صحیح دین ہے۔
یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّهٗ لِلّٰهِ (آل عمران۔ ۱۶)	وہ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہو کہ اختیارات تو سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔
وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُکُمُ الْکَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ (النمل۔ ۱۵)	اپنی زبانوں سے یونہی غلط سلط نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام۔
وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (مائدہ۔ ۷)	جو خدا کی نازل کی ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی دراصل ظالم ہیں۔

اس نظریہ کے مطابق حاکمیت Sovereignty صرف خدا کی ہے۔ قانون ساز Law Giver صرف خدا ہے۔ کوئی انسان، خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو، بذاتِ خود حکم دینے اور منع کرنے کا حق دار نہیں۔ نبی خود بھی اللہ کے حکم ہی کا پیرو ہے۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ (انعام۔ ۵) "میں تو صرف

اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے"۔ عام انسان نبی کی اطاعت پر صرف اس لئے مامور ہیں کہ وہ اپنا حکم نہیں بلکہ خدا کا حکم بیان کرتا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (النساء۔۹)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے۔ اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے اذن Sanction کے تحت اس کی اطاعت کی جائے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ۔ (الانعام۔۱۰)

یہ نبی وہ لوگ ہیں جن کو ہم نے اپنی کتاب دی۔ حکم Authority سے سرفراز کیا اور نبوت عطا کی۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ۔ (آل عمران۔۸)

کسی بشر کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اسے کتاب اور حکم اور نبوت سے سرفراز کرے اور وہ لوگوں سے یہ کہے کہ تم خدا کے بجائے میرے بندے بن جاؤ، بلکہ وہ تو یہی کہے گا۔ کہ تم ربانی بنو۔

پس اسلامی اسٹیٹ کی ابتدائی خصوصیات جو قرآن کی مذکورہ بالا تصریحات سے نکلتی ہیں یہ ہیں:۔

۱۔ کوئی شخص، خاندان، طبقہ یا گروہ بلکہ اسٹیٹ کی ساری آبادی مل کر بھی حاکمیت کی مالک نہیں ہے۔ حاکم اصلی صرف خدا ہے، اور باقی سب محض رعیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۲۔ قانون سازی کے اختیارات بھی خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں

ہیں۔ سارے مسلمان مل کر بھی نہ اپنے لئے کوئی قانون بنا سکتے ہیں، اور نہ خدا کے بنائے ہوئے کسی قانون میں ترمیم کر سکتے ہیں۔

۳۔ اسلامی اسٹیٹ بہرحال اس قانون پر قائم ہوگا۔ جو خدا کی طرف سے اس کے نبی نے دیا ہے۔ اور اس سٹیٹ کو چلانے والی گورنمنٹ صرف اس حال میں اور اس حیثیت سے اطاعت کی مستحق ہوگی کہ وہ خدا کے قانون کو نافذ کرنے والی ہو۔

اسلامی اسٹیٹ کی نوعیّت

ایک شخص بیک نظر ان خصوصیات کو دیکھ کر سمجھ سکتا ہے کہ یہ جمہوریّت Democracy نہیں ہے۔ اس لئے کہ جمہوریت تو نام ہی اُس طرزِ حکومت کا ہے جس میں ملک کے عام باشندوں کو حاکمیت حاصل ہو، انہی کی رائے سے قوانین میں تغیر و تبدل ہو اور انہی کی رائے سے قوانین بنیں، جس قانون کو وہ چاہیں، نافذ ہو اور جسے نہ چاہیں وہ کتابِ آئین پر سے محو کر دیا جائے۔ یہ بات اسلام میں نہیں ہے، لہٰذا اس معنی میں اسے جمہوریت نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے لئے زیادہ صحیح نام "الٰہی حکومت" ہے جس کو انگریزی میں Theocracy کہتے ہیں مگر یورپ جس تھیاکریسی سے واقف ہے۔ اسلامی تھیاکریسی اُس سے بالکل مختلف ہے۔ یورپ اُس تھیاکریسی سے واقف ہے جس میں ایک مخصوص مذہبی طبقہ Priest Class خدا کے نام سے خود اپنے بنائے

ہوئے قوانین نافذ کرتا[1] ہے اور عملاً اپنی خدائی عام باشندوں پر مسلط کر دیتا ہے۔ ایسی حکومت کو تو الٰہی حکومت کے بجائے شیطانی حکومت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ بخلاف اس کے اسلام جس تھیاکریسی کو پیش کرتا ہے وہ کسی مخصوص مذہبی طبقہ کے ہاتھ میں نہیں ہوتی، بلکہ عام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے، اور یہ عام مسلمان اسے خدا کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت کے مطابق چلاتے ہیں۔ اگر مجھے ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو میں اس طرزِ حکومت کو Theo-Democracy یعنی "الٰہی جمہوری حکومت" کے نام سے موسوم کروں گا۔ کیونکہ اس میں خدا کی حاکمیت اور اس کے اقتدار اعلیٰ Paramountcy کے تحت مسلمانوں کو ایک محدود عمومی حاکمیت Limited popular Sovereignity عطا کی گئی ہے۔ اس میں عاملہ یعنی Executive مسلمانوں کی رائے سے بنے گی، مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہوں گے۔ سارے انتظامی معاملات اور

---

[1] عیسائی پاپاؤں اور پادریوں کے پاس مسیح کی چند اخلاقی تعلیمات کے سوا کوئی شریعت سرے سے تھی ہی نہیں۔ لہٰذا وہ اپنی مرضی سے اپنی خواہشاتِ نفس کے مطابق قوانین بناتے تھے اور یہ کہہ کر انہیں نافذ کرتے تھے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ۔

تمام وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے، مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہوں گے۔ اور الٰہی قانون جہاں تعبیر طلب ہو گا وہاں کوئی مخصوص طبقہ یا نسل نہیں، بلکہ عام مسلمانوں میں سے ہر وہ شخص اس کی تعبیر کا مستحق ہو گا جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہنچائی ہو۔ اس لحاظ سے یہ ڈیموکریسی ہے۔ مگر جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، جہاں خدا اور اس کے رسول کا حکم موجود ہو وہاں مسلمانوں کے کسی امیر کو، کسی لیجسلیچر کو، کسی مجتہد اور عالم دین کو بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو مل کر بھی اس حکم میں یک سر مُو ترمیم کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس لحاظ سے یہ تھیاکریسی ہے۔

ایک اعتراض آگے بڑھنے سے پہلے میں اس امر کی تھوڑی سی تشریح کر دینا چاہتا ہوں کہ اسلام میں ڈیموکریسی پر حدود و قیود کیوں عائد کئے گئے ہیں، اور ان حدود و قیود کی نوعیت کیا ہے۔ اعتراض کرنے والا یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ اس طرح تو خدا نے انسانی عقل و روح کی آزادی سلب کر لی، حالانکہ ابھی تم یہ ثابت کر رہے تھے کہ خدا کی الٰہیت انسان کو عقل و فکر اور جسم و جان کی آزادی عطا کرتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قانون سازی کا اختیار اللہ نے اپنے ہاتھ میں انسان کی فطری آزادی سلب کرنے کے لئے نہیں، بلکہ اس کو محفوظ کرنے کے لئے لیا ہے۔ اس کا مقصد انسان کو بے راہ ہونے اور اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مارنے سے بچانا ہے۔

یہ مغرب کی نام نہاد ڈیموکریسی، جس کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس میں عمومی حاکمیت Popular Sovereignty ہوتی ہے، اس کا ذرا تجزیہ تو کر کے دیکھئے۔ جن لوگوں سے مل کر کوئی اسٹیٹ بنتا ہے وہ سب کے سب نہ تو خود قانون بناتے ہیں، اور نہ خود اس کو نافذ کرتے ہیں۔ انہیں اپنی حاکمیت چند مختلف لوگوں کے سپرد کرنی پڑتی ہے تاکہ ان کی طرف سے وہ قانون بنائیں اور اسے نافذ کریں۔ اسی غرض سے انتخاب کا ایک نظام مقرر کیا جاتا ہے۔ اس انتخاب میں زیادہ تر وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو عوام کو اپنی دولت، اپنے علم، اپنی چالاکی اور اپنے جھوٹے پروپیگنڈے کے زور سے بیوقوف بنا سکتے ہیں۔ پھر یہ خود عوام کے ووٹ ہی سے ان کے الٰہ بن جاتے ہیں، عوام کے فائدے کے لئے نہیں بلکہ اپنے شخصی اور طبقاتی فائدے کے لئے قوانین بناتے ہیں، اور اسی طاقت سے جو عوام نے ان کو دی ہے ان قوانین کو عوام پر نافذ کرتے ہیں۔ یہی مصیبت امریکہ میں ہے، یہی انگلستان میں ہے، اور یہی ان سب ممالک میں ہے جن کو جمہوریت کی جنت ہونے کا دعوےٰ ہے۔

پھر اس پہلو کو نظر انداز کر کے اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہاں عام لوگوں ہی کی مرضی سے قانون بنتے ہیں، تب بھی تجربہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ عام لوگ خود بھی اپنے مفاد کو نہیں سمجھ سکتے۔ انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ یہ اپنی زندگی کے اکثر معاملات میں حقیقت کے

بعض پہلوؤں کو دیکھتا ہے اور بعض کو نہیں دیکھتا۔ اس کا فیصلہ (Judgment) عموماً یک طرفہ ہوتا ہے۔ اس پر جذبات اور خواہشات کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ خالص عقلی اور علمی حیثیت سے بے لاگ رائے بہت کم قائم کر سکتا ہے بلکہ بسا اوقات عقلی اور علمی حیثیت سے جو بات اس پر روشن ہو جاتی ہے اس کو بھی یہ جذبات و خواہشات کے مقابلہ میں رد کر دیتا ہے۔ اس کے ثبوت میں بہت سی مثالیں میرے سامنے ہیں مگر طوالت سے بچنے کے لئے میں صرف امریکہ کے قانون منع شراب (Prohibition Law) کی مثال پیش کروں گا۔ علمی اور عقلی حیثیت سے یہ بات ثابت ہو چکی تھی کہ شراب صحت کے لئے مضر ہے، عقلی و ذہنی قوتوں پر برا اثر ڈالتی ہے، اور انسانی تمدن میں فساد پیدا کرتی ہے۔ انہی حقائق کو تسلیم کر کے امریکہ کی رائے عام اس بات کے لئے راضی ہوئی تھی کہ منع شراب کا قانون پاس کیا جائے۔ چنانچہ عوام کے ووٹ ہی سے یہ قانون پاس ہوا تھا۔ مگر جب وہ نافذ کیا گیا تو انہی عوام نے جن کے ووٹ سے وہ پاس ہوا تھا اس کے خلاف بغاوت کی۔ بدتر سے بدتر قسم کی شرابیں ناجائز طور پر بنائیں اور پیں۔ پہلے سے کئی گنا زیادہ شراب کا استعمال ہوا۔ جرائم میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔ آخر کار انہی عوام کے ووٹوں سے وہ شراب جو حرام کی گئی تھی، حلال کر دی گئی۔ یہ حرمت کا فتویٰ حلت سے جو بدلا گیا، اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ علمی و عقلی حیثیت سے اب شراب کا

استعمال مفید ثابت ہو گیا تھا۔ بلکہ صرف یہ وجہ تھی کہ عوام اپنی جاہلانہ خواہشات کے بندے بنے ہوئے تھے، انہوں نے اپنی حاکمیت اپنے نفس کے شیطان کی طرف منتقل کر دی تھی۔ اپنی خواہش کو اپنا الٰہ بنا لیا تھا، اور اس الٰہ کی بندگی میں وہ اس قانون کو بدلنے پر مُصر تھے جسے انہوں نے خود ہی علمی اور عقلی حیثیت سے صحیح تسلیم کر کے پاس کیا تھا، اس قسم کے اور بہت سے تجربات ہیں جن سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ انسان خود اپنا واضع قانون Legislator بننے کی پوری اہلیت نہیں رکھتا۔ اگر اس کو دوسرے الٰہوں کی بندگی سے رہائی مل بھی جائے تو وہ اپنی جاہلانہ خواہشات کا بندہ بن جائے گا۔ اپنے نفس کے شیطان کو الٰہ بنا لے گا۔ لہٰذا وہ اس کا محتاج ہے کہ اس کی آزادی پر خود اس کے لئے اپنے مفاد میں مناسب حدیں لگا دی جائیں۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے وہ قیود عائد کی ہیں جن کو اسلام کی اصطلاح میں "حدود اللہ" Divine limits کہا جاتا ہے۔ یہ حدود زندگی کے ہر شعبہ میں چند اصول، چند ضوابط اور چند قطعی احکام پر مشتمل ہیں جو اس شعبہ کے اعتدال و توازن کو برقرار رکھنے کے لئے لگائی گئی ہیں۔ ان کا منشا یہ ہے کہ یہ تمہاری آزادی کی آخری حدیں ہیں، ان کے اندر رہ کر تم اپنے برتاؤ کے لئے ضمنی اور فروعی قاعدے Regulations بنا سکتے ہو، مگر ان حدود سے تجاوز کرنے کی تمہیں اجازت

نہیں ہے، ان سے تجاوز کر دگے تو تمہاری اپنی زندگی کا نظام فاسد و مختل ہو جائے گا۔

حدود اللہ کا مقصد | مثال کے طور پر انسان کی معاشی زندگی کو لیجئے۔

اس میں اللہ تعالیٰ نے شخصی ملکیت کا حق، زکوٰۃ کی فرضیت، سود کی حرمت، جوئے اور سٹے کی ممانعت، وراثت کا قانون، اور دولت کمانے، جمع کرنے اور خرچ کرنے پر پابندیاں عائد کر کے چند سرحدی نشانات لگا دیئے ہیں۔ اگر انسان ان نشانات کو برقرار رکھے اور ان کے اندر رہ کر اپنے معاملات کی تنظیم کرے تو ایک طرف شخصی آزادی Personal liberty بھی محفوظ رہتی ہے اور دوسری طرف طبقاتی جنگ Class-war اور ایک طبقہ پر دوسرے طبقہ کے تسلط کی وہ حالت بھی پیدا نہیں ہو سکتی جو ظالمانہ سرمایہ داری سے شروع ہو کر مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ پر منتہی ہوتی ہے۔

اسی طرح عائلی زندگی Family life میں اللہ نے حجاب شرعی، مرد کی قوامیت، شوہر، بیوی، بچوں اور والدین کے حقوق و فرائض، طلاق اور خلع کے احکام، تعداد ازدواج کی مشروط اجازت، زنا اور قذف کی سزائیں مقرر کر کے ایسی حدیں کھڑی کر دی ہیں کہ اگر انسان ان کی ٹھیک ٹھیک نگہداشت کرے اور ان کے اندر رہ کر اپنی خانگی زندگی کو مضبوط کر لے تو نہ گھر ظلم و ستم کی دوزخ بن سکتے ہیں، اور نہ ان گھروں سے عورتوں کی شیطانی آزادی کا وہ طوفان اٹھ سکتا ہے جو آج پوری انسانی تہذیب

کو غارت کر دینے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔

اسی طرح انسانی تمدن و معاشرت کی حفاظت کے لیئے اللہ تعالیٰ نے قصاص کا قانون، چوری کے لئے ہاتھ کاٹنے کی سزا، شراب کی حرمت، جسمانی ستر کے حدود، اور ایسے چند مستقل قاعدے مقرر کرکے فساد کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند کر دیئے ہیں۔

میرے لیئے اتنا موقع نہیں ہے کہ میں حدود اللہ کی ایک مکمل فہرست آپ کے سامنے پیش کرکے تفصیل کے ساتھ بتاؤں کہ انسانی زندگی میں توازن و اعتدال قائم کرنے کے لیئے ان میں سے ایک ایک حد کس قدر ضروری ہے۔ یہاں میں صرف یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اس طریقہ سے ایک ایسا مستقل ناقابل تغیر و تبدل دستور Constitution بنا کر انسان کو دے دیا ہے جو اس کی روح آزادی کو سلب اور اس کی عقل و فکر کو معطل نہیں کرتا، بلکہ اس کے لیئے ایک صاف، واضح اور سیدھا راستہ مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنی جہالت اور اپنی کمزوریوں کے سبب سے تباہی کی بھول بھلیوں میں بھٹک نہ جائے، اس کی قوتیں غلط راستوں میں ضائع نہ ہوں، اور وہ اپنی حقیقی فلاح و ترقی کی راہ پر سیدھا بڑھتا چلا جائے اگر آپ کو کسی پہاڑی مقام پر جانے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ پُر پیچ پہاڑی راستوں میں، جن کے ایک طرف عمیق غار اور دوسری طرف بلند چٹانیں ہوتی ہیں۔ سڑک کے کناروں کو ایسی

رکاوٹوں سے محفوظ کر دیا جاتا ہے کہ مسافر غلطی سے کھڈ کی طرف نہ چلا جائے۔ کیا ان رکاوٹوں کا مقصد راہ رو کی آزادی سلب کرنا ہے؟ نہیں! دراصل ان سے مقصد یہ ہے کہ اس کو ہلاکت سے محفوظ رکھا جائے اور ہر پیچ، ہر موڑ اور ہر امکانی خطرے کے موقع پر اسے بتایا جائے کہ تیرا راستہ اُدھر نہیں اِدھر ہے، تجھے اُس رُخ پر نہیں اس رُخ پر مڑنا چاہیئے، تاکہ تو بسلامت اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکے۔ بس یہی مقصد اُن حدود کا بھی ہے جو خدا نے اپنے دستور میں مقرر کی ہیں۔ یہ حدیں انسان کے لئے زندگی کے سفر کا صحیح رُخ معیّن کرتی ہیں اور ہر پُرپیچ مقام، ہر موڑ اور ہر دوراہے پر اُسے بتاتی ہیں کہ سلامتی کا راستہ اس طرف ہے، تجھے اُن سمتوں پر نہیں بلکہ اِس سمت پر پیش قدمی کرنی چاہیئے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں خدا کا مقرر کیا ہوا یہ دستور ناقابلِ تغیّر و تبدل ہے۔ آپ اگر چاہیں تو ٹرکی اور ایران کی طرح اس دستور کے خلاف بغاوت کر سکتے ہیں۔ مگر اس کو بدل نہیں سکتے، یہ قیامت تک کے لئے اٹل دستور ہے۔ اسلامی اسٹیٹ جب بنے گا اسی دستور پر بنے گا۔ جب تک قرآن اور سنتِ رسول دنیا میں باقی ہے، اس دستور کی ایک دفعہ بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹائی جا سکتی۔ جس کو مسلمان رہنا ہو وہ اس کی پابندی پر مجبور رہے۔

اس دستور کی حدود کے اندر جو اسٹیٹ	اسلامی اسٹیٹ کا مقصد

بنے۔ اس کے لئے ایک مقصد بھی خدا نے متعیّن کر دیا ہے اور اس کی تشریح قرآن میں متعدد مقامات پر کی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا:-

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ (الحدید - ۳)

ہم نے اپنے رسولوں کو واضح ہدایات کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں اور ہم نے لوہا اتارا جس میں زبردست طاقت ہے اور لوگوں کے لئے فائدے ہیں۔

اس آیت میں لوہے سے مراد ریاسی قوت[1] ہے اور رسولوں کا کام یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی واضح ہدایات اور اپنی کتاب میں جو میزان ان کو دی ہے یعنی جس ٹھیک ٹھیک متوازن Well balanced نظامِ زندگی کی طرف ان کی رہنمائی فرمائی رہے، اس کے مطابق اجتماعی عدل (Social justice) قائم کریں۔ دوسری جگہ فرمایا

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (الحج ۶)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو اگر ہم زمین میں تمکن (حکومت عطا کریں گے تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

---

[1] یا قوت قاہرہ Coercive power

ایک اور جگہ فرمایا :-

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ

تم وہ بہترین جماعت ہو جسے نوع انسانی کے لئے نکالا گیا ہے تم نیکی کا حکم کرتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

(آل عمران-۱۲)

ان آیات پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن جس اسٹیٹ کا تخیل پیش کر رہا ہے اس کا مقصد سلبی Negative نہیں ہے بلکہ وہ ایجابی Positive مقصد اپنے سامنے رکھتا ہے اس کا مُدعا صرف یہی نہیں ہے کہ لوگوں کو ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے روکے، ان کی آزادی کی حفاظت کرے، اور مملکت کو بیرونی حملوں سے بچائے، بلکہ اس کا مدعا اجتماعی عدل کے اس متوازن نظام کو رائج کرنا ہے جو خدا کی کتاب پیش کرتی ہے، اُس کا مقصد، بدی کی اُن تمام صورتوں کو مٹانا اور نیکی کی اُن تمام شکلوں کو قائم کرنا ہے جن کو خدا نے اپنی واضح ہدایات میں بیان کیا ہے۔ اس کام میں حسب موقع و محل سیاسی طاقت بھی استعمال کی جائے گی، تبلیغ و تلقین سے بھی کام لیا جائے گا، تعلیم و تربیت کے ذرائع بھی کام میں لائے جائیں گے، اور جماعتی اثر اور رائے عام کے دباؤ کو بھی استعمال کیا جائے گا۔

ہمہ گیر اسٹیٹ اس نوعیت کا اسٹیٹ ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتا۔ یہ ہمہ گیر اسٹیٹ ہے۔ اس کا دائرہ عمل

پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبہ کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریہ اور اصلاحی پروگرام کے مطابق ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کوئی شخص اپنے کسی معاملہ کو پرائیویٹ اور شخصی نہیں کہہ سکتا۔ اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے یک گونہ مماثلت رکھتا ہے۔ مگر آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ اس کلیت کے باوجود اس میں موجودہ زمانے کی کلی (Totalitarian) اور استبدادی (Authoritarian) حکومتوں کا سا رنگ نہیں ہے۔ اس میں شخصی آزادی سلب نہیں کی جاتی اور نہ اس میں آمریت (Dictatorship) پائی جاتی ہے۔ اس معاملہ میں جو کمال درجہ کا اعتدال اسلامی نظام حکومت میں قائم کیا گیا ہے، اور حق و باطل کے درمیان جیسی نازک اور باریک سرحدیں قائم کی گئی ہیں، انہیں دیکھ کر ایک صاحب بصیرت آدمی کا دل گواہی دینے لگتا ہے کہ ایسا متوازن نظام حقیقت میں خدائے حکیم و خبیر ہی وضع کر سکتا ہے۔

جماعتی اور مسلکی اسٹیٹ دوسری بات جو اسلامی اسٹیٹ کے دستور اور اس کے مقصد اور اس کی اصلاحی نوعیت پر غور کرنے سے خود بخود واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسے اسٹیٹ کو صرف وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو اس کے دستور پر ایمان رکھتے ہوں، جنہوں نے اس کے مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہو، جو اس کے اصلاحی پروگرام سے نہ صرف پوری طرح متفق ہوں، نہ صرف اس میں کامل عقیدہ رکھتے

ہوں بلکہ اس کی اسپرٹ کو اچھی طرح سمجھتے بھی ہوں اور اس کی تفصیلات سے بھی واقف ہوں۔ اسلام نے اس باب میں کوئی جغرافی، لونی یا لسانی قید نہیں رکھی ہے۔ وہ تمام انسانوں کے سامنے اپنے دستور، اپنے مقصد اور اپنے اصلاحی پروگرام کو پیش کرتا ہے۔ جو شخص بھی اسے قبول کرلے، خواہ وہ کسی نسل، کسی ملک اور کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو، وہ اس جماعت میں شریک ہو سکتا ہے جو اس اسٹیٹ کو چلانے کے لئے بنائی گئی ہے مگر جو اُسے قبول نہ کرے اسے اسٹیٹ کے کام میں دخیل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اسٹیٹ کے حدود میں ذمّی Subject کی حیثیت سے رہ سکتا ہے۔ اس کے لئے اسلام کے قانون میں معیّن حقوق اور مراعات موجود ہیں۔ اس کی جان و مال اور عزت کی پوری حفاظت کی جائے گی لیکن بہر حال اس کو حکومت میں شریک کی حیثیت نہ دی جائے گی، کیونکہ یہ ایک خاص مسلک رکھنے والی پارٹی کا اسٹیٹ ہے۔ یہاں بھی اسلامی اسٹیٹ اور کمیونسٹ اسٹیٹ میں یک گونہ مماثلت پائی جاتی ہے لیکن دوسرے مسلکوں پر اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ جو برتاؤ اشتراکی جماعت کا اسٹیٹ کرتا ہے اس کو اس برتاؤ سے کوئی نسبت نہیں جو اسلامی اسٹیٹ کرتا ہے۔ اسلام میں وہ صورت نہیں جو کمیونسٹ حکومت میں ہے کہ غلبہ و اقتدار حاصل کرتے ہی اپنے تمدنی اصولوں کو دوسروں پر بجبر مسلط کر دیا جائے، جائدادیں ضبط کی جائیں، قتل و خون کا

بازار گرم ہو اور ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو پکڑ کر زمین کے جہنم "سائبیریا" کی طرف پھینک کر دیا جائے۔ اسلام نے غیر مسلموں کے لئے جو فیاضانہ برتاؤ اپنے اسٹیٹ میں اختیار کیا ہے۔ اور اس بارے میں عدل و ظلم اور راستی و ناراستی کے درمیان جو باریک خطِ امتیاز کھینچا ہے اسے دیکھ کر ہر انصاف پسند آدمی بیک نظر معلوم کر سکتا ہے کہ خدا کی طرف سے جو مصلح آتے ہیں وہ کس طرح کام کرتے ہیں، اور زمین میں جو مصنوعی اور جعلی مصلحین اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ان کا طریق کار کیا ہے۔

نظریۂ خلافت اب میں آپ کے سامنے اسلامی اسٹیٹ کی ترکیب اور اس کے طرزِ عمل کی تھوڑی سی تشریح کروں گا۔ یہ بات میں آپ سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں اصلی حاکم اللہ ہے۔ اس اصل الاصول کو پیشِ نظر رکھ کر جب آپ اس سوال پر غور کریں گے کہ زمین میں جو لوگ خدا کے قانون کو نافذ کرنے کے لئے اُٹھیں اُن کی حیثیت کیا ہونی چاہیئے تو آپ کا ذہن خود بخود پکارے گا کہ وہ اصلی حاکم کے نائب قرار پائے چاہئیں۔ ٹھیک یہی حیثیت اسلام نے بھی ان کو دی ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے:۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْکُمْ	اللہ نے وعدہ کیا ہے ان لوگوں کے
وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ	ساتھ جو تم سے ایمان لائیں اور نیک
فِی الْاَرْضِ کَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِیْنَ	عمل کریں کہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا

مِنْ قَبْلِہِمْ۔ اسی طرح جس طرح ان سے پہلے اس نے دوسروں کو خلیفہ بنایا تھا۔

یہ آیت اسلام کے نظریہ ریاست Theory of State پر نہایت صاف روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں دو بنیادی نکات بیان کئے گئے ہیں:۔

پہلا نکتہ یہ ہے کہ اسلام حاکمیت کے بجائے خلافت (Vicegerency) کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ چوں کہ اُس کے نظریہ کے مطابق حاکمیت خدا کی ہے لہٰذا جو کوئی اسلامی دستور کے تحت زمین پر حکمراں ہو اسے لامحالہ حاکمِ اعلیٰ کا خلیفہ Vicegerent ہونا چاہیئے جو محض تفویض کردہ اختیارات Delegated powers استعمال کرنے کا مجاز ہوگا۔

دوسری کانٹے کی بات اس آیت میں یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مومنوں سے کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤنگا۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ سب مومن خلافت کے حامل ہیں۔ خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوتی ہے وہ عمومی خلافت Popular vicegerency ہے۔ کسی شخص یا خاندان یا نسل یا طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ ہر مومن اپنی جگہ خدا کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً ہر ایک خدا کے سامنے جواب دہ ہے (کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہٖ)[1] اور ایک خلیفہ دوسرے خلیفہ

[1] مشہور حدیث ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور تم سب خدا کے سامنے اپنی رعیت کے بارے میں جواب دِہ ہو۔

کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے فروتر نہیں ہے۔

اسلامی جمہوریت کی حیثیت یہ ہے اسلامی ڈیموکریسی کی اصل بنیاد عمومی خلافت کے اس تصور کا تجزیہ کرنے سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:-

۱- ایسی سوسائٹی جس میں ہر شخص خلیفہ ہو اور خلافت میں برابر کا شریک ہو، طبقات کی تقسیم اور پیدائشی یا معاشرتی امتیازات کو اپنے اندر راہ نہیں دے سکتی۔ اس میں تمام افراد مساوی الحیثیت اور مساوی المرتبہ ہوں گے فضیلت جو کچھ بھی ہوگی شخصی قابلیت اور سیرت کے اعتبار سے ہوگی۔ یہی بات ہے جس کو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے بار بار بتصریح بیان فرمایا ہے۔

لیس لاحد فضل علی احد الا بدین وتقوی۔ الناس کلھم بنوا دم وا دم من تراب۔ لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لابیض علی اسود ولا لاسود علی ابیض الا بالتقوی۔

کسی کو کسی پر فضیلت نہیں۔ اگر ہے تو دین کے علم وعمل اور تقویٰ کے اعتبار سے ہے سب لوگ آدمؑ کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ نہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت ہے، نہ عجمی کو عربی پر، نہ گورے کو کالے پر اور نہ کالے کو گورے پر فضیلت ہے تو تقویٰ کی بنا پر ہے۔

فتح مکہ کے بعد جب تمام عرب اسلامی اسٹیٹ کے دائرے میں آگیا تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے خاندان والوں کو جو عرب میں برہمنوں کی سی حیثیت رکھتے تھے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:-

یا معشر قریش ان اللہ قد ذھب عنکم نخوۃ الجاھلیۃ وتعظمھا الآباء - ایھا الناس کلکم من آدم وآدم من تراب لا فخر للانساب - لا فضل للعربی علی العجمی ولا للعجمی علی العربی اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔	قریش والو! اللہ نے تمہاری جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا کے ناز کو دور کر دیا۔ لوگو! تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ نسب کا فخر ہیچ ہے۔ عرب کو عجمی پر اور عجمی کو عرب پر کوئی فخر نہیں تم میں بزرگ وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔

۲- ایسی سوسائٹی میں کسی فرد یا کسی گروہِ افراد کے اس کی پیدائش یا اس کے معاشرتی مرتبے Social status یا اس کے پیشے کے اعتبار سے اس قسم کی رکاوٹیں Disabilities نہیں ہو سکتیں جو اس کی ذاتی قابلیتوں کے نشوونما اور اس کی شخصیت کے ارتقا میں کسی طرح بھی مانع ہوں۔ اس کو سوسائٹی کے تمام دوسرے افرادِ کی طرح ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہونے چاہئیں۔ اس کے لئے راستہ کھلا ہوا ہونا چاہیئے کہ اپنی قوت و استعداد کے لحاظ سے جہاں تک بڑھ سکتا ہے بڑھتا چلا جائے۔ بغیر اس کے کہ دوسروں کے اسی طور پر بڑھنے میں مانع ہو۔ یہ چیز اسلام میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ غلام اور غلام زادے فوجوں کے افسر اور صوبوں کے گورنر بنائے گئے اور بڑے بڑے اونچے گھرانوں کے شیوخ نے ان کی ماتحتی کی۔ چمار جوتیاں گانٹھتے گانٹھتے اٹھے اور امامت کی مسند پر بیٹھ گئے۔ جولاہے اور بزاز مفتی اور قاضی اور فقیہ بنے اور آج

اُن کے نام اسلام کے بزرگوں کی فہرست میں ہیں۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ اسمعوا واطیعوا ولو استعمل علیکم عبد حبشی "سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تمہارا سردار ایک حبشی ہی کیوں نہ بنا دیا جائے"۔

۳۔ ایسی سوسائٹی میں کسی شخص یا گروہ Group کی ڈکٹیٹر شپ کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اس لئے کہ یہاں ہر شخص خلیفہ ہے، کسی شخص یا گروہ کو حق نہیں ہے کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کر کے خود حاکم مطلق بن جائے۔ یہاں جو شخص حکمراں بنایا جاتا ہے اس کی اصلی حیثیت یہ ہے کہ تمام مسلمان، یا اصطلاحی الفاظ میں، تمام خلفاء اپنی رضامندی سے اپنی خلافت کو انتظامی اغراض کے لئے اس کی ذات میں مرکوز Concentrate کر دیتے ہیں۔ وہ ایک طرف خدا کے سامنے جواب دہ ہے اور دوسری طرف ان عام خلفاء کے سامنے جنہوں نے اپنی خلافت اس کو تفویض کی ہے۔ اب اگر وہ غیر ذمہ دار مطاع مطلق، یعنی ڈکٹیٹر بنتا ہے تو خلیفہ کے بجائے غاصب کی حیثیت اختیار کرتا ہے، کیونکہ ڈکٹیٹر شپ دراصل عمومی خلافت کی نفی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی اسٹیٹ ایک کلی اسٹیٹ ہے اور زندگی کے تمام شعبوں پر اس کا دائرہ وسیع ہے۔ مگر اس کلیت اور ہمہ گیری کی بنیاد یہ ہے کہ خدا کا وہ قانون ہمہ گیر ہے جسے اسلامی حکمران کو نافذ کرنا ہے۔ خدا نے زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق جو ہدایات دی ہیں وہ یقیناً پوری ہمہ گیری کے ساتھ نافذ

کی جائیں۔ مگران ہدایات سے ہٹ کر اسلامی حکمران خود ضابطہ بندی Regimentation کی پالیسی اختیار نہیں کر سکتا۔ وہ لوگوں کو مجبور نہیں کر سکتا کہ فلاں پیشہ کریں اور فلاں پیشہ نہ کریں، فلاں فن سیکھیں اور فلاں نہ سیکھیں، اپنے بچوں کو فلاں قسم کی تعلیم دلوائیں اور فلاں قسم کی نہ دلوائیں۔ جو اختیارات روس اور جرمنی اور اٹلی میں ڈکٹیٹروں نے اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں، یا جن کو اتاترک نے ترکی میں استعمال کیا، اسلام نے وہ اختیارات امیر کو عطا نہیں کئے۔ علاوہ بریں ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ اسلام میں ہر فرد شخصی طور پر خدا کے سامنے جوابدہ ہے، یہ شخصی جواب دہی Personal responsibility ایسی ہے جس میں کوئی دوسرا شخص اس کے ساتھ شریک نہیں۔ لہٰذا اس کو قانون کی حدود کے اندر پوری آزادی ہونی چاہئیے کہ اپنے لئے جو راستہ چاہے اختیار کرے اور جدھر اس کا میلان ہو، اپنی قوتوں کو اسی طرف بڑھنے کے لئے استعمال کرے۔ اگر امیر اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالے گا تو وہ خود اس ظلم کے لئے اللہ کے ہاں پکڑا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے خلفائے راشدین کی حکومت میں ضابطہ بندی کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔

۴۔ ایسی سوسائٹی میں ہر عاقل و بالغ مسلمان کو، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، رائے دہی کا حق حاصل ہونا چاہئے، اس لئے کہ وہ خلافت کا حامل ہے۔ خدا نے اس خلافت کو کسی خاص معیار لیاقت یا کسی معیار ثروت

سے مشروط نہیں کیا ہے، بلکہ صرف ایمان و عملِ صالح سے مشروط کیا ہے۔
لہٰذا رائے دہی میں ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ مساوی حیثیت
رکھتا ہے۔

انفرادیت اور اجتماعیت کا توازن | ایک طرف اسلام نے یہ کمال درجہ کی
جمہوریت قائم کی ہے۔ دوسری طرف ایسی انفرادیت Individualism
کا سدِباب کر دیا ہے جو اجتماعیت Socialism کی نفی کرتی ہو۔ یہاں افراد
و جماعت کا تعلق اس طرح قائم کیا گیا ہے کہ نہ فرد کی شخصیت جماعت میں
گم ہو جائے، جس طرح کمیونزم اور فاشزم کے نظامِ اجتماعی میں ہو جاتی
ہے، اور نہ فرد اپنی حد سے اتنا بڑھ جائے کہ جماعت کے لئے نقصان دہ
ہو، جیسا کہ مغربی جمہوریتوں کا حال ہے۔ اسلام میں فرد کا مقصدِ حیات
وہی ہے جو جماعت کا مقصدِ حیات ہے، یعنی قانونِ الٰہی کا نفاذ اور
رضائے الٰہی کا حصول۔ مزید برآں اسلام میں فرد کے حقوق پوری طرح
محفوظ کرنے کے بعد اس پر جماعت کے لئے مخصوص فرائض بھی عائد
کر دیئے ہیں۔ اس طرح انفرادیت اور اجتماعیت میں ایسی موافقت
Harmony پیدا ہو گئی ہے کہ فرد کو اپنی قوتوں کے نشوونما کا پورا موقع
بھی ملتا ہے اور پھر وہ اپنی ان ترقی یافتہ قوتوں کے ساتھ اجتماعی فلاح
و بہبود میں مددگار بھی بن جاتا ہے۔ یہ ایک مستقل مبحث ہے جس پر
تفصیل کے ساتھ گفتگو کا یہاں موقع نہیں۔ اس کی طرف اشارہ کرنے
سے میرا مقصد صرف ان غلط فہمیوں کا سدِباب کرنا تھا جو اسلامی

جمہوریت کی مذکورۂ بالا تشریح سے پیدا ہو سکتی تھیں۔

اسلامی اسٹیٹ کی ہیئت ترکیبی

خلافت عمومی کے تصور کا جو تجزیہ میں نے کیا ہے اس کو نظر میں رکھنے کے بعد آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی اسٹیٹ میں امام یا امیر یا صدرِ حکومت کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ عام مسلمانوں کو جو خلافت حاصل ہے، اس کے اختیارات وہ اپنے میں سے ایک بہترین شخص کا انتخاب کرکے امانت کے طور پر اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اس کے لئے "خلیفہ" کا لفظ جو استعمال کیا جاتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بس وہی اکیلا خلیفہ ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام مسلمانوں کی خلافت اس کی ذات میں مرتکز Concentrate ہو گئی ہے۔

اب میں مختصر طور پر اس طرزِ حکومت کی چند خاص خاص تفصیلات بیان کروں گا تاکہ اس کا ایک واضح خاکہ آپ کے سامنے آجائے۔

۱۔ امیر کا انتخاب اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کے اصول پر ہوگا یعنی عام مسلمان جس کے کیریکٹر پر پوری طرح اعتماد رکھتے ہوں وہی اس منصب کے لئے چُنا جائے گا۔ اور جب وہ چُن لیا جائے گا تو اس کو سیاہ و سپید کے اختیارات ہوں گے۔ اس پر پورا بھروسہ کیا جائے گا جب تک وہ خدا اور رسول کے قانون کی پیروی[1] کرے گا۔ اس کی کامل

---

[1] یعنی کسی شخص کو خلیفہ منتخب کرنے کے لئے صرف یہی بات نہ دیکھی جائے گی کہ اس کی علمی و ذہنی قابلیت اور تدبیر و تنظیم کی صلاحیت کیسی ہے، بلکہ سب سے زیادہ (باقی ص۹۵ پر)

اطاعت کی جائے گی۔

۲- امیر تنقید سے بالاتر نہ ہوگا۔ ہر عامی مسلمان اس کے پبلک کاموں ہی پر نہیں بلکہ پرائیویٹ زندگی پر بھی نکتہ چینی کرنے کا مجاز ہوگا۔ وہ قابل عزل ہوگا۔ قانون کی نگاہ میں اس کی حیثیت عام شہریوں کے برابر ہوگی۔ اس کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کیا جاسکے گا۔ اور وہ عدالت میں کسی امتیازی برتاؤ کا مستحق نہ ہوگا۔

۳- امیر کو مشورہ کے ساتھ کام کرنا ہوگا۔ مجلس شوریٰ ایسی ہوگی جسے عام مسلمانوں کا اعتماد حاصل ہو۔ اس امر میں بھی کوئی شرعی مانع نہیں ہے کہ اس مجلس کو مسلمانوں کے ووٹوں سے منتخب کیا جائے۔ اگرچہ اس کی مثال خلافت راشدہ میں نہیں ملتی۔

۴- عموماً مجلس کے فیصلے کثرت رائے سے ہوں گے۔ مگر اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔ قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ۔ اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کی رائے کے مقابلہ میں برحق ہو۔ اور اگر ایسا ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اُس کی تائید میں ایک جم غفیر نہیں ہے۔ لہٰذا امیر کو حق ہے کہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے یا اقلیت کے ساتھ۔ اور امیر کو یہ بھی حق ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کرکے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔ مگر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۹۴) جس چیز کا لحاظ کیا جائے گا۔ وہ یہ ہے کہ اس کے تقوے پر اعتماد کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

ہر صورت میں عامۂ مسلمین اس بات پر نظر رکھیں گے کہ امیر اپنے ان وسیع اختیارات کو تقویٰ اور خوفِ خدا کے ساتھ استعمال کرتا ہے یا نفسانیت کے ساتھ۔ بصورت دیگر رائے عام اس امیر کو مسندِ امارت سے نیچے بھی اتار لا سکتی ہے۔

۵۔ امارت، یا مجلسِ شوریٰ کی رکنیت، یا کسی ذمہ داری کے منصب کے لئے کوئی ایسا شخص منتخب نہ کیا جائے گا جو خود اس کا امیدوار ہو، یا کسی طور پر اس کے لئے کوشش کرے۔ اسلام میں امیدواری (Candidature) اور انتخابی پروپیگنڈا کے لئے قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاف ہدایت ہے کہ امیدوار کو کوئی منصب نہ دیا جائے۔ اسلامی ذہنیت اس بات کے خیال تک سے نفرت کرتی ہے کہ ایک منصب کے لئے دو تین چار امیدوار کھڑے ہوں، ایک دوسرے کے خلاف پوسٹر بازی، جلسہ بازی، اور اخباری پروپیگنڈا کریں۔ ووٹروں کو طرح طرح سے بیوقوف بنائیں اور کھانوں کی دیگیں چڑھائی جائیں، موٹریں دوڑیں اور ان میں سے وہ امیدوار بازی لے جائے جو جھوٹ، فریب اور زر پاشی میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔ یہ شیطانی ڈیموکریسی کے ملعون طریقے ہیں جن کا عشر عشیر بھی اسلامی حکومت میں برسر کار آئے تو خلافت کی مجلس شوریٰ میں منتخب ہو کر جانا تو درکنار، ایسے لوگوں کو قاضی کی عدالت میں پیش کر کے سزا دلوا دی جائے۔

۶۔ اسلامی مجلس شوریٰ میں پارٹی بندی نہیں ہو سکتی۔ فرد فرد علیحدہ

ہوگا اور حق کے مطابق رائے دے گا۔ اسلام میں اس کا موقع نہیں کہ آپ ہر حال میں اپنی پارٹی کا ساتھ دیں، خواہ وہ حق پر ہو یا باطل پر۔ بلکہ اسلامی سپرٹ کا تقاضہ یہ ہے کہ آج کسی کی رائے کو آپ حق پر پائیں تو اس کا ساتھ دیں، اور کل کسی دوسرے مسئلے میں اگر کسی شخص کی رائے آپ کے نزدیک خلافِ حق ہو تو اس سے اختلاف کر دیں۔

۷۔ اسلام میں عدالت کے شعبہ کو انتظامی شعبہ کے اثر سے کلیتہً آزاد رکھا گیا ہے۔ قاضی کا کام خدا کے قانون کو اس کے بندوں پر نافذ کرنا ہے۔ وہ عدالت کی کرسی پر امیر یا خلیفہ کے نائب کی حیثیت سے نہیں بلکہ اللہ عزوجل کے نائب کی حیثیت سے بیٹھتا ہے۔ لہٰذا عدالت میں اس کے سامنے خود خلیفہ کی بھی کوئی وقعت نہیں۔ کسی کو اپنی شخصیت یا اپنے خاندان یا اپنے عہدے کی وجہ سے یہ حق حاصل نہیں کہ قاضی کے سامنے حاضر ہونے سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ ایک ادنیٰ مزدور، ایک غریب کاشتکار۔ ایک فقیر بے نوا بھی اس کا حق رکھتا ہے کہ بڑے سے بڑے شخص، حتیٰ کہ خود خلیفہ کے خلاف قاضی کی عدالت میں دعوےٰ دائر کر دے اور قاضی کو پورے اختیارات حاصل ہیں کہ اگر مدعی کا حق ثابت ہو جائے تو خدا کا قانون خلیفہ پر بھی ٹھیک اسی طرح نافذ کر دے جس طرح ایک عامی مسلمان پر کرتا ہے۔ اسی طرح اگر خود خلیفہ کو اپنی ذاتی حیثیت میں کسی کے خلاف شکایت ہو، تو وہ اپنے حاکمانہ اختیارات استعمال کر کے خود اس شکایت کو رفع کر لینے کا

حق نہیں رکھتا بلکہ از روئے آئین وہ مجبور ہے کہ ایک عام شہری کی طرح عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے۔

اس مختصر خطبہ میں میرے لئے یہ موقع نہیں ہے کہ اسلامی اسٹیٹ کی تفصیلی صورت آپ کے سامنے پیش کرسکوں۔ اس کی اسپرٹ اور اس کے طرزِ کارروائی کو پوری طرح سمجھنے کے لئے نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دورِ حکومت کی نظیریں پیش کرنا ضروری ہے، اور اس کی گنجائش یہاں نہیں ہے۔ تاہم مجھے توقع ہے کہ جو کچھ میں نے بیان کیا ہے وہ اسلامی طرزِ حکومت کا ایک واضح تصور پیش کرنے کے لئے کافی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

ایک نہایت اہم

استفسار

از

سید ابوالاعلیٰ مودودی

شائع کردہ

مکتبہ جماعت اسلامی، لاہور (پاکستان)

قیمت تین آنے

سید ابوالاعلیٰ مودودی طابع و ناشر نے
اتحاد پریس بل روڈ لاہور ——— میں چھپوا کر
مکتبۂ جماعت اسلامی لاہور،
(پاکستان) سے شائع کیا
تعداد اشاعت ۲۰۰۰

ایک نہایت اہم استفتاء

ہمارے پاس دہلی سے ایک صاحب نے ایک مطبوعہ استفتاء بھیجا ہے جس کا موضوع بجائے خود نہایت اہم ہے، اور اس لحاظ سے اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے کہ ہمارے اکابر علماء اس مسئلہ کو غیر شرعی طریقہ پر حل کرنے کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ ذیل میں استفتاء اور اس کا جواب درج کیا جاتا ہے:۔

"ماہرین علوم اسلامیہ ومفتیان شرع متین سے حسب ذیل سوالوں کا مدلل جواب کتاب وسنت اور فقہ کی روشنی میں جلد مطلوب ہے:۔

۱۔ اگر کوئی غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث وپنچ مسلمان مرد وعورت کے نکاح کو اسلامی احکام کے مطابق فسخ کر دے، یا غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث وپنچ عورت پر مرد کا ظلم ثابت ہو جانے کی صورت میں مرد کی طرف سے عورت کو طلاق دے دے، جیسا کہ بعض صورتوں میں مسلمان قاضی کو یہ حق حاصل ہے، تو کیا نکاح فسخ ہو جائے گا اور عورت پر طلاق واقع ہو جائے گی اور عورت کو شرعاً یہ حق حاصل ہو جائے گا کہ وہ غیر مسلم کے فسخ کردہ نکاح اور ایقاع طلاق کو شرعاً درست سمجھ کر بعد عدت یا جیسی صورت ہو دوسرے مسلمان مرد سے نکاح کر سکتی ہے؟

۲- اگر سوال مذکورۃ الصدر کا جواب نفی میں ہو، یعنی شرعاً غیر مسلم کے حکم فسخ نکاح اور ایقاع طلاق کا کوئی اعتبار نہیں ہے اور غیر مسلم کے فسخ نکاح یا ایقاع طلاق کے بعد بھی وہ عورت شوہر اول کی زوجیت میں باقی رہتی ہے، تو اس صورت میں جو عورت دوسرے مرد سے نکاح کرے گی، اور اس دوسرے مرد کو یہ علم بھی ہو کہ اس عورت نے غیر مسلم ثالث و پنچ کے ذریعہ سے طلاق حاصل کی ہے، تو وہ نکاح باطل و فاسد ہو گا یا نہیں؟ اور دوسرے مرد سے نکاح کے باوجود اس عورت کا دوسرے مرد سے زن و شوہر کا تعلق رکھنا حرام ہو گا یا نہیں؟ اور وہ دونوں شرعاً زنا کے مرتکب سمجھے جائیں گے یا نہیں؟

۳- اور دوسرے مرد سے نکاح باطل ہونے کی صورت میں جب اس دوسرے مرد سے کوئی اولاد ہو گی تو وہ ولد الحرام ہو گی یا نہیں؟ اور یہ اولاد اس دوسرے مرد کے ترکے سے محروم ہو گی یا نہیں؟

مہربانی فرما کر ان سوالوں کے جواب نمبروار مدلل تحریر فرمایئے۔"

اس سوال میں بنیادی غلطی یہ ہے کہ صرف غیر مسلم حاکم یا غیر مسلم ثالث و پنچ کے بارے میں سوال کیا گیا ہے۔ حالانکہ سوال یہ کرنا چاہیے تھا کہ جو عدالتی نظام خدا سے بے نیاز ہو کر انسان نے خود قائم کر لیا ہو اور جس کے فیصلے انسانی ساخت کے قوانین پر مبنی ہوں۔ اس کو خدا کا قانون جائز تسلیم کرتا ہے یا نہیں۔ اس کے ساتھ ضمنی غلطی یہ بھی ہے کہ سوال صرف فسخ و تفریق کے معاملات کے متعلق کیا گیا ہے حالانکہ اصولی حیثیت سے ان

معاملات کی نوعیت، دوسرے معاملات سے مختلف نہیں ہے۔

صرف نکاح و طلاق ہی کے معاملہ میں نہیں بلکہ جملہ معاملات میں غیر اسلامی عدالت کا فیصلہ اسلامی شریعت کی رُو سے غیر مسلّم ہے۔ اسلام نہ اس حکومت کو تسلیم کرتا ہے جو اصل مالک الملک یعنی اللہ سے بے تعلق ہو کر آزادانہ و خود مختارانہ قائم ہوئی ہو، نہ اس قانون کو تسلیم کرتا ہے، جو کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت نے بطور خود بنا لیا ہو، نہ اس عدالت کے حق سماعت و فصل خصومات کو تسلیم کرتا ہے جو اصل مالک و فرماں روا کے ملک میں اس کی اجازت Sanction کے بغیر اس کے باغیوں نے قائم کر لی ہو۔ اسلامی نقطۂ نظر سے ایسی عدالتوں کی حیثیت وہی ہے جو انگریزی قانون کی رُو سے ان عدالتوں کی قرار پاتی ہے جو برطانی سلطنت کے حدود میں "تاج"، کی اجازت کے بغیر قائم کی جائیں۔ ان عدالتوں کے جج، ان کے کارندے اور وکیل اور ان سے فیصلہ کرانے والے جس طرح انگریزی قانون کی نگاہ میں باغی و مجرم اور بجائے خود مستلزم سزا ہیں، اسی طرح اسلامی قانون کی نگاہ میں وہ پورا عدالتی نظام مجرمانہ و باغیانہ ہے جو بادشاہِ ارض و سما کی مملکت میں اس کے "سلطان" اجازت، کے بغیر قائم کیا گیا ہو اور جس میں اس کے منظور کردہ قوانین کے بجائے کسی دوسرے کے منظور کردہ قوانین پر فیصلہ کیا جاتا ہو، ایسا نظامِ عدالت جرمِ مجسم ہے۔ اس کے جج مجرم ہیں، اس کے کارکن مجرم ہیں، اس کے وکیل مجرم ہیں، اس کے سامنے اپنے

معاملات لے جانے والے فریقین مجرم ہیں، اور اس کے جملہ احکام قطعی طور پر کالعدم ہیں۔ اگر ان کا فیصلہ کسی خاص معاملہ میں شریعت اسلامی کے مطابق ہو تب بھی وہ فی الاصل غلط ہے، کیونکہ بغاوت، اس کی جڑ میں موجود ہے۔ بالفرض اگر وہ چور کا ہاتھ کاٹیں، زانی پر کوڑے یا رجم کی سزا نافذ کریں، شرابی پر حد جاری کریں تب بھی شریعت کی نگاہ میں چور، زانی اور شرابی اپنے جرم سے اس سزا کی بنا پر پاک نہ ہوں گے، اور خود یہ عدالتیں بغیر کسی حق کے ایک شخص کا ہاتھ کاٹنے یا اس پر کوڑے یا پتھر برسانے کی مجرم ہوں گی، کیونکہ انہوں نے خدا کی رعیت پر وہ اختیارات استعمال کئے جو خدا کے قانون کی رُو سے ان کو حاصل نہ تھے[1]

ان عدالتوں کی یہ شرعی حیثیت اس صورت میں بھی علیٰ حالہٖ قائم رہتی ہے جب کہ غیر مسلم کے بجائے کوئی نام نہاد مسلمان ان کی کرسی پر بیٹھا ہو۔ خدا کی باغی حکومت سے فیصلہ نافذ کرنے کے اختیارات لے کر جو شخص

---

[1] اس سلسلہ میں ان مقدمات کی کارروائی مزید بصیرت کی موجب ہوگی جو ۱۹۴۵ء کے آخر اور ۱۹۴۶ء کے آغاز میں حکومت ہند نے ان فوجی افسروں پر چلائے تھے جنہوں نے برما و ملایا پر جاپانی قبضہ کے دوران میں "آزاد ہند ریاست" اور "آزاد ہند فوج" بنائی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ شاہ نواز، سہگل اور ڈھلوں کے مقدمہ میں ہندوستان کے ایڈووکیٹ جنرل نے استغاثہ کی جو تقریر کی تھی وہ بغور پڑھنے کے لائق ہے، کیونکہ اس میں ان نام نہاد "باغیوں" کے مقابلہ میں حکومت ہند کی جو قانونی پوزیشن بیان کی گئی ہے، درحقیقت وہی تمام اصلی و حقیقی "باغیوں" کے مقابلہ میں سلطنت رب العالمین کی قانونی پوزیشن ہے۔

مقدمات کی سماعت کرتا ہے اور جو انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کی رُو سے احکام جاری کرتا ہے وہ کم از کم جج کی حیثیت سے تو مسلمان نہیں ہے بلکہ خود باغی کی حیثیت رکھتا ہے، پھر بھلا اس کے احکام کالعدم ہونے سے کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں؟

یہی قانونی پوزیشن اُس صورت میں بھی قائم رہتی ہے جب کہ حکومت جمہوری ہو اور اس میں مسلمان شریک ہوں، خواہ مسلمان کسی جمہوری حکومت میں قلیل التعداد ہوں یا کثیر التعداد، یا وہ ساری آبادی مسلمان ہو جس نے جمہوری لادینی اصول پر نظامِ حکومت قائم کیا ہو، بہر حال جس حکومت کی بنیاد اس نظریہ پر ہو کہ اہلِ ملک خود مالک الملک Sovereign people ہیں اور ان کو قانونِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر خود اپنے لئے قانون بنا لینے کا اختیار حاصل ہے، اس کی حیثیت اسلام کی نگاہ میں بالکل ایسی ہے جیسے کسی بادشاہ کی رعیت اس کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرے اور اس کے بالمقابل اپنی خود مختارانہ حکومت قائم کرے۔ جس طرح ایسی حکومت کو اس بادشاہ کا قانون کبھی جائز تسلیم نہیں کر سکتا، اسی طرح اس نوع کی جمہوری حکومت کو خدا کا قانون بھی تسلیم نہیں کرتا۔ ایسی جمہوری حکومت کے تحت جو عدالتیں قائم ہوں گی، خواہ ان کے جج قومی حیثیت سے مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اُن کے فیصلے بھی اسی طرح کالعدم ہوں گے جس طرح کہ صورت اول و دوم میں بیان کئے گئے ہیں۔

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کی صحت پر پورا قرآن دلیل ہے۔ تاہم

چونکہ سائل نے کتاب و سنت کی تصریحات کا مطالبہ کیا ہے اس لئے محض چند آیاتِ قرآنی پیش کی جاتی ہیں:-

۱۔ قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے خلق اسی کی ہے لہٰذا فطرتاً امر کا حق (Right to rule) بھی صرف اسی کو پہنچتا ہے۔ اس کے ملک (Dominion) میں اس کی خلق پر، خود اس کے سوا کسی دوسرے کا امر جاری ہونا اور حکم چلنا بنیادی طور پر غلط ہے[1]۔

قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَاءُ (آل عمران ۳)	کہو اے اللہ، مالک الملک! تو جس کو چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے۔
ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ لَہُ الْمُلْکُ (فاطر ۲)	وہ ہے اللہ، تمہارا رب، ملک اسی کا ہے
لَمْ یَکُنْ لَّہٗ شَرِیْکٌ فِی الْمُلْکِ (بنی اسرائیل ۱۳)	بادشاہی میں کوئی اس کا شریک (Partner) نہیں
فَالْحُکْمُ لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْکَبِیْرِ (المومن ۲)	لہٰذا حکم اللہ بزرگ و برتر ہی کے لئے خاص ہے
وَلَا یُشْرِکُ فِیْ حُکْمِہٖ اَحَدًا (الکہف ۴)	اور وہ اپنے حکم میں کسی کو اپنا حصہ دار نہیں بناتا۔
اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (اعراف ۷)	خبردار! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے۔
یَقُوْلُوْنَ ھَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ	لوگ پوچھتے ہیں کیا امر میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟
قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ (آل عمران ۱۶)	کہہ دو کہ امر سارا اللہ کے لئے مخصوص ہے۔

۲۔ اس اصل الاصول کی بنا پر قانون سازی کا حق انسان سے بالکلیہ

---

[1] اِلّا یہ کہ کوئی اس کے خلیفہ، نائب کی حیثیت اختیار کرکے اس کے قانونِ شرعی کے مطابق حکمرانی اور فیصلہ کرے، جیسا کہ آگے آتا ہے۔

سلب کر لیا گیا ہے، کیونکہ انسان مخلوق اور رعیت ہے، بندہ اور محکوم ہے، اور اس کا کام صرف اس قانون کی پیروی کرنا ہے جو مالک الملک نے بنایا ہے[1]۔ اس کے قانون کو چھوڑ کر جو شخص یا ادارہ خود کوئی قانون بناتا ہے یا کسی دوسرے کے بنائے ہوئے قانون کو تسلیم کر کے اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے وہ طاغوت (باغی اور خارج از اطاعتِ حق) ہے، اور اس سے فیصلہ چاہنے والا اور اس کے فیصلہ پر عمل کرنے والا بھی بغاوت کا مجرم ہے:-

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ (النحل-۱۵)	اور تم اپنی زبانوں سے جن چیزوں کا ذکر کرتے ہو ان کے متعلق جھوٹ گھڑ کر یہ نہ کہدیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے
اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (اعراف-۱)	جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے اولیاء (اپنے ٹھیرائے ہوئے کارسازوں) کی پیروی نہ کرو۔
وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ	اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو

---

[1] قانونِ الٰہی کی حدود کے اندر استنباط و اجتہاد سے تفصیلات فقہی مرتب کرنے کا معاملہ دوسرا ہے جو یہاں زیر بحث نہیں ہے۔ نیز جن امور میں اللہ اور اس کے رسول نے کوئی صریح حکم نہ دیا ہو، ان میں روح شریعت اور مزاج اسلامی کو ملحوظ رکھتے ہوئے قانون بنانے کا حق اہل ایمان کو حاصل ہے کیونکہ ایسے امور میں کسی صریح حکم کا نہ ہونا بجائے خود یہ معنی رکھتا ہے کہ ان کے متعلق ضوابط و احکام مقرر کرنیکا قانونی حق اہل ایمان کو دیدیا گیا ہے۔

فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ (المائدہ - ۷)

اللہ نے اتارا ہے تو ایسے تمام لوگ کافر ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَحَاکَمُوْٓا اِلَی الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ (النساء - ۹)

اے نبی! کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جو دعوے تو کرتے ہیں اس ہدایت پر ایمان لانے کا جو تم پر اور تم سے پہلے کے انبیاء پر اتاری گئی ہے اور پھر چاہتے ہیں کہ اپنے معاملہ کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں حالانکہ انہیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ طاغوت سے کفر کریں (یعنی اس کے حکم کو تسلیم نہ کریں)

۳- خداوند عالم کی زمین پر صحیح حکومت اور عدالت صرف وہ ہے جو اس قانون کی بنیاد پر قائم ہو جو اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ اسی کا نام خلافت ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ (النساء - ۹)

اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ حکم الٰہی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے

اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الْکِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىکَ اللّٰہُ (النساء - ۱۶)

اے نبی! ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس روشنی کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے تمہیں دکھائی ہے

وَاَنِ احْکُمْ بَیْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ یَّفْتِنُوْکَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ اِلَیْکَ اَفَحُکْمَ الْجَاهِلِیَّةِ

اور یہ کہ تم ان کے درمیان حکومت کرو اس ہدایت کے مطابق جو اللہ نے اتاری ہے۔ اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو اور ہوشیار رہو کہ وہ تمہیں فتنہ میں مبتلا کر کے اس ہدایت سے

يَبْغُوْنَ۔ (المائدہ ۷)
کسی جز سے نہ پھیر دیں جو اللہ نے تمہاری طرف نازل کی ہے۔ کیا یہ لوگ جاہلیت کی حکومت چاہتے ہیں؟

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (ص-۲)
اے داؤد! ہم نے تم کو خلیفہ مقرر کیا ہے لہٰذا تم حق کے ساتھ لوگوں کے درمیان حکومت کرو اور اپنی خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ اللہ کے راستہ سے وہ تم کو بھٹکائے جائے گی۔

۴۔ اس کے برعکس ہر وہ حکومت اور ہر وہ عدالت باغیانہ ہے جو خداوند عالم کی طرف سے اس کے پیغمبروں کے لائے ہوئے قانون کے بجائے کسی دوسری بنیاد پر قائم ہوا بلالحاظ اس کے کہ تفصیلات میں ایسی حکومتوں اور عدالتوں کی نوعیتیں باہم کتنی ہی مختلف ہوں۔ ان کے تمام افعال بے اصل، بے وزن اور باطل ہیں۔ ان کے حکم اور فیصلہ کے لئے سرے سے کوئی جائز بنیاد ہی نہیں ہے۔ حقیقی مالک الملک نے جب انہیں سلطان[1] عطا ہی نہیں کیا تو وہ جائز حکومتیں اور عدالتیں کس طرح ہو سکتی ہیں؟ وہ تو جو کچھ کرتی ہیں، خدا کے قانون

[1] چارٹر یا سلطان سے ہماری مراد یہ ہے کہ جو خدا کو مالک الملک اور اپنے آپکو اس کا خلیفہ (نہ کہ خود مختار) تسلیم کرے، پیغمبر کو اس کا پیغمبر اور کتاب کو اس کی کتاب، مانے اور شریعت الٰہی کے تحت رہ کر کام کرنا قبول کرے، صرف ایسی ہی حکومت اور عدالت کو خداوند عالم کا چارٹر حاصل ہے یہ چارٹر خود قرآن میں دیدیا گیا ہے کہ احکم بینہم بما انزل اللہ (لوگوں کے درمیان حکومت کرو اس قانون کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے)

کی رُو سے سب کالعدم ہے۔ اہل ایمان (یعنی خدا کی وفادار رعایا) ان کے وجود کو بطور ایک خارجی واقعہ کے تسلیم کر سکتے ہیں، مگر بطور ایک جائز وسیلۂ انتظام و فصلِ قضایا کے تسلیم نہیں کر سکتے۔ ان کا کام اپنے اصلی فرمانروا (اللہ) کے باغیوں کی اطاعت کرنا اور ان سے اپنے معاملات کا فیصلہ چاہنا نہیں ہے۔ اور جو ایسا کریں وہ ادعائے اسلام و ایمان کے باوجود وفاداروں کے زمرہ سے خارج ہیں۔ یہ بات صریح عقل کے خلاف ہے کہ کوئی حکومت کسی باغی گروہ کو باغی بھی قرار دے اور پھر اپنی رعایا پر ان باغیوں کے اقتدار کو جائز بھی رکھے اور اسے ان کا حکم ماننے کی اجازت بھی دے دے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا؟ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا أُولٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا۔

(الکہف - ۱۲)

اے نبی! ان سے کہو، کیا میں تمہیں بتاؤں کہ اپنے اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ ناکام و نامراد کون ہیں؟ وہ کہ دنیا کی زندگی میں جن کی پوری سعی بھٹک گئی (یعنی انسانی کوششوں کے فطری مقصود رضائے الٰہی سے ہٹ کر دوسرے مقاصد کی راہ میں صرف ہوئی) اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم خوب کام کر رہے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کے احکام ماننے سے انکار کیا اور اس کی ملاقات (یعنی اس کے سامنے حاضر ہو کر حساب دینے) کا عقیدہ قبول نہ کیا۔ اس لئے ان کے سب اعمال حبط (کالعدم) ہو گئے اور قیامت کے روز ہم انہیں کوئی وزن نہ دیں گے۔

تِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا بِآيٰتِ رَبِّهِمْ وَ

یہ عاد ہیں جنہوں نے اپنے رب کے احکام ماننے

عَصَوْا رُسُلَهٗ وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ۔ (ہود-۵)

سے انکار کیا اور اس کے رسولوں کی اطاعت نہ کی اور ہر جبار دشمن حق کے امر کا اتباع کیا۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ۔ (ہود-۹)

اور ہم نے موسیٰ کو اپنی آیات اور واضح و روشن سلطان کے ساتھ فرعون اور اس کے اعیان ریاست کے پاس بھیجا مگر ان لوگوں نے (ہمارے فرستادہ شخص کے بجائے) فرعون کے امر کی پیروی کی حالانکہ فرعون کا امر درست نہ تھا (یعنی مالک الملک کے سلطان پر مبنی نہ تھا)۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔ (الکہف-۴)

اور تو کسی ایسے شخص کی پیروی نہ کر جس کے دل کو ہم نے اپنے ذکر سے (یعنی اس حقیقت کے شعور و ادراک سے کہ ہم اس کے رب ہیں) غافل پایا۔ اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی کی اور جس کا امر حق سے ہٹا ہوا ہے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا (اعراف-۴)

اے نبی کہدو! کہ میرے رب نے حرام کیا ہے فحش کاموں کو خواہ وہ کھلے ہوں یا چھپے اور معصیت کو، اور حق کے بغیر ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کو، اور اس بات کو کہ تم اللہ کے ساتھ (حاکمیت اور الوہیت میں) ان کو شریک کرو جن کے لئے اللہ نے کوئی سلطان نازل نہیں کیا ہے۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ

تم اللہ کو چھوڑ کر جن کی بندگی کرتے ہو وہ محض نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اگلوں نے رکھ لئے ہیں۔ اللہ نے ان کے لئے کوئی سلطان نازل نہیں۔

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ - (یوسف - ۵)

کیا ہے۔ حکم صرف اللہ کے لئے خاص ہے، اس کا فرمان ہے کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّىٰ وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا -

(النساء - ۱۸)

اور جو کوئی رسول سے جھگڑا کرے درآں حالیکہ راہ راست اس کو دکھادی گئی، اور ایمانداروں کا راستہ چھوڑ کر دوسری راہ چلنے لگے، اُس کو ہم اسی طرف چلائیں گے جدھر وہ خود مڑ گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے اور وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ -

(النساء - ۹)

پس تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک کہ اے نبی! تجھ کو اپنے باہمی اختلاف میں فیصلہ کرنے والا نہ تسلیم کریں۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا (النساء - ۹)

اور جب ان سے کہا گیا کہ آؤ اس حکم کی طرف جو اللہ نے اتارا ہے اور آؤ رسول کی طرف، تو تو نے منافقوں کو دیکھا کہ تجھ سے چھڑک رہے ہیں

وَلَنْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِينَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ سَبِيلًا -

(النساء - ۲۰)

اور اللہ نے کافروں (یعنی اپنی سلطنت کے باغیوں) کے لئے اہل ایمان (یعنی اپنی وفادار رعایا) پر کوئی راہ نہیں رکھی۔

یہ قرآن کے محکمات ہیں۔ ان میں کچھ بھی متشابہ نہیں ہے۔ اسلام کے نظامِ فکر، نظامِ اخلاق اور نظامِ تمدن کی بنیاد جس مرکزی عقیدہ پر رکھی گئی ہے وہی اگر متشابہ رہ جاتا تو قرآن کا نزول ہی معاذ اللہ بیکار ہوتا۔ اس لئے

قرآن نے اس کو اتنے صاف اور قطعی طریقہ سے بیان کر دیا ہے کہ اس میں دو رائیں ہونے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اور قرآن کی ایسی تصریح کے بعد ہم کو ضرورت نہیں کہ حدیث یا فقہ کی طرف رجوع کریں۔

پھر جبکہ اسلام کی ساری عمارت ہی اس سنگِ بنیاد پر کھڑی ہے کہ اللہ نے جس چیز کے لئے کوئی سلطان نہ اتارا ہو وہ بے اصل ہے، اور اللہ کے سلطان سے بے نیاز ہو کر جو چیز بھی قائم کی گئی ہو اس کی قانونی حیثیت سراسر کالعدم ہے، تو کسی خاص معاملہ کے متعلق یہ دریافت کرنے کی کوئی حاجت نہیں رہتی کہ اس معاملہ میں بھی کسی غیر الٰہی حکومت کی عدالتوں کا فیصلہ شرعاً نافذ ہوتا ہے یا نہیں۔ جس بچہ کا نطفہ ہی حرام سے قرار پایا ہو اس کے بارے میں یہ کب پوچھا جاتا ہے کہ اس کے بال یا اس کے ناخن بھی حرامی ہیں یا نہیں؟ خنزیر جب پورا حرام ہے تو اس کی کسی خاص بوٹی کے متعلق یہ سوال کب پیدا ہوتا ہے کہ وہ بھی حرام ہے یا نہیں؟ پس یہ سوال کرنا کہ فسخِ نکاح اور تفریق بین الزوجین اور ایقاعِ طلاق کے بارے میں غیر الٰہی عدالتوں کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے یا نہیں، اسلام سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ اور اس سے زیادہ ناواقفیت کی دلیل یہ ہے کہ سوال صرف غیر مسلم ججوں کے بارے میں کیا جائے۔ گویا سائل کے نزدیک جو نام کے مسلمان غیر الٰہی نظامِ عدالت کے پرزوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہوں ان کا فیصلہ تو نافذ ہو ہی جاتا ہوگا۔ حالانکہ خنزیر کے جسم کی بوٹی کا نام "بکرے کی بوٹی" رکھ دینے سے نہ تو وہ بوٹی فی الواقع بکرے کی بوٹی بن جاتی ہے اور نہ حلال ہی ہو

سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اسلام کے اس اصل الاصول کو تسلیم کرنے کے بعد غیر الٰہی حکومت کے تحت مسلمانوں کی زندگی مشکل ہو جاتی ہے لیکن مسلمانوں کی زندگی کو آسان کرنے کے لئے اسلام کے اولین بنیادی اصول میں ترمیم نہیں کی جاسکتی۔ مسلمان اگر غیر الٰہی حکومتوں کے اندر رہنے کی آسانی چاہتے ہیں تو انہیں اصول اسلام میں ترمیم کرنے، یا بالفاظ دیگر اسلام کو غیر اسلام بنانے، کا اختیار حاصل نہیں ہے، البتہ مرتد ہونے کا موقع ضرور حاصل ہے۔ کوئی چیز یہاں ارتداد سے مانع نہیں۔ شوق سے اسلام کو چھوڑ کر کسی آسان طریق زندگی کو قبول کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ مسلمان رہنا ہی چاہتے ہیں تو ان کے لئے صحیح اسلامی طریقہ یہ نہیں ہے کہ غیر الٰہی حکومت میں رہنے کی آسانیاں پیدا کرنے کے لئے ایسے حیلے ڈھونڈتے پھریں جو اسلام کے بنیادی اصولوں سے متعارض ہوں، بلکہ صرف ایک راستہ ان کے لئے کھلا ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ جہاں بھی وہ ہوں، حکومت کے نظریہ کو بدلنے اور اصولِ حکمرانی کو درست کرنے کی سعی میں اپنی پوری پوری قوت صرف کر دیں۔

سلامتی کا راستہ

از

سید ابوالاعلیٰ مودودی

شائع کردہ

مکتبہ جماعت اسلامی دارالاسلام۔ پٹھان کوٹ (پنجاب)

قیمت ۶ر

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر

نے

اتحاد پریس ہل روڈ لاہور میں باہتمام شیخ امین الدین منیجر

طبع کرا کر مکتبہ جماعت اسلامی دارالاسلام

پٹھان کوٹ سے شائع کیا۔

سلامتی کا راستہ

(یہ خطبہ ریاست کپورتھلہ میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے ایک مشترک اجتماع کے سامنے عرض کیا گیا تھا)

ہستی باری تعالیٰ

صاحبو! اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ بازار میں ایک دکان ایسی ہے جس کا کوئی دکاندار نہیں ہے، نہ کوئی اس میں مال لانے والا ہے، نہ بیچنے والا اور نہ کوئی اس کی رکھوالی کرتا ہے، دکان خود بخود چل رہی ہے، خود بخود اس میں مال آجاتا ہے اور خود بخود خریداروں کے ہاتھ فروخت ہو جاتا ہے، تو کیا آپ اس شخص کی بات مان لیں گے؟ کیا آپ تسلیم کر لیں گے کہ کسی دکان میں مال لانے والے کے بغیر خود بھی مال آسکتا ہے؟ مال بیچنے والے کے بغیر خود بخود فروخت بھی ہو سکتا ہے؟ حفاظت کرنے والے کے بغیر خود بخود چوری اور لوٹ سے بھی محفوظ رہ سکتا ہے؟ اپنے دل سے پوچھیے، ایسی بات آپ کبھی مان سکتے ہیں؟ جس کے ہوش حواس ٹھکانے ہوں کیا اس کی عقل میں یہ بات آسکتی ہے کہ کوئی دکان دنیا میں ایسی بھی ہو گی؟

فرض کیجیے، ایک شخص آپ سے کہتا ہے کہ اس شہر میں ایک کارخانہ ہے جس کا نہ کوئی مالک ہے، نہ انجینئر، نہ مستری، سارا کارخانہ خود بخود قائم ہو گیا ہے، ساری مشینیں خود

بن گئی ہیں، خود ہی سارے پرزے اپنی اپنی جگہ لگ بھی گئے، خود ہی سب مشینیں چل بھی رہی ہیں، اور خود ہی ان میں سے عجیب عجیب چیزیں بن بن کر نکل بھی رہی ہیں۔ سچ بتائیے، جو شخص آپ سے یہ بات کہے گا، آپ حیرت سے اس کا منہ نہ تکنے لگیں گے؟ آپ کو یہ شبہ نہ ہوگا کہ اس کا دماغ کہیں خراب تو نہیں ہو گیا ہے؟ کیا ایک پاگل کے سوا ایسی بیہودہ بات کوئی کہہ سکتا ہے؟

دور کی مثالوں کو چھوڑیئے، یہ بجلی کا بلب جو آپ کے سامنے جل رہا ہے، کیا کسی کے کہنے سے آپ یہ مان سکتے ہیں کہ روشنی اس بلب میں آپ سے آپ پیدا ہو جاتی ہے؟ یہ کرسی جو آپ کے سامنے رکھی ہے، کیا کسی بڑے سے بڑے فاضل فلسفی کے کہنے سے بھی آپ یہ باور کر سکتے ہیں کہ یہ خود بخود بن گئی ہے؟ یہ کپڑے جو آپ پہنے ہوئے ہیں، کیا کسی علامہ دہر کے کہنے سے بھی آپ یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے کہ ان کو کسی نے بُنا نہیں ہے یہ خود بُن گئے ہیں؟ یہ گھر جو آپ کے سامنے کھڑے ہیں اگر تمام دنیا کی یونیورسٹیوں کے پروفیسر مل کر بھی آپ کو یقین دلائیں کہ ان گھروں کو کسی نے نہیں بنایا ہے، بلکہ یہ خود بن گئے ہیں، تو کیا ان کے یقین دلانے سے آپ کو ایسی لغو بات پر یقین آ جائیگا؟

یہ چند مثالیں آپ کے سامنے کی ہیں۔ رات دن جن چیزوں کو آپ دیکھتے ہیں انہیں میں سے چند ایک میں نے بیان کی ہیں۔ اب غور کیجئے، ایک معمولی دکان کے متعلق جب آپ کی عقل یہ نہیں مان سکتی کہ وہ کسی قائم کرنے والے کے بغیر چل رہی ہے جب ایک ذرا سے کارخانے کے متعلق آپ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے کہ وہ کسی بنانے والے کے

بغیر بن جائیگا اور کسی چلانے والے کے بغیر چلتا رہیگا، تو یہ زمین و آسمان کا زبردست کارخانہ جو آپ کے سامنے چل رہا ہے، جس میں چاند اور سورج اور بڑے بڑے ستارے گھڑی کے پرزوں کی طرح حرکت کر رہے ہیں جس میں سمندروں سے بھاپیں اُٹھتی ہیں، بھاپوں سے بادل بنتے ہیں، بادلوں کو ہوائیں اُڑا کر زمین کے کونے کونے میں پھیلاتی ہیں، پھر ان کو مناسب وقت پر ٹھنڈک پہنچا کر دوبارہ بھاپ سے پانی بنایا جاتا ہے، پھر وہ پانی بارش کے قطروں کی صورت میں زمین پر گرایا جاتا ہے، پھر اس بارش کی بدولت مردہ زمین کے پیٹ سے طرح طرح کے لہلہاتے ہوئے درخت نکالے جاتے ہیں، قسم قسم کے غلے، رنگ برنگ کے پھل اور وضع وضع کے پھول پیدا کئے جاتے ہیں، اس کارخانے کے متعلق آپ یہ کیسے مان سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ کسی بنانے والے کے بغیر خود بن گیا اور کسی چلانے والے کے بغیر خود چل رہا ہے؟ ایک ذرا سی کرسی، ایک گز بھر کپڑے، ایک چھوٹی سی دیوار کے متعلق کوئی کہہ دے کہ یہ چیزیں خود بنی ہیں تو آپ فوراً فیصلہ کر دیں گے کہ اس کا دماغ چل گیا ہے، پھر بھلا اس شخص کے دماغ کی خرابی میں کیا شک ہو سکتا ہے جو کہتا ہے کہ زمین خود بن گئی، جانور خود پیدا ہو گئے، انسان جیسی حیرت انگیز چیز آپ سے آپ بن کر کھڑی ہو گئی۔

آدمی کا جسم جن اجزا سے مل کر بنا ہے ان سب کو سائنس دانوں نے الگ الگ کر کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کچھ لوہا ہے، کچھ کوئلہ، کچھ گندھک، کچھ فاسفورس، کچھ کیلسیم، کچھ نمک، چند گیسیں اور بس ایسی ہی چند اور چیزیں جن کی مجموعی قیمت چند روپوں سے زیادہ

نہیں ہے یہ چیزیں جتنے جتنے وزن کے ساتھ آدمی کے جسم میں شامل ہیں، اتنے ہی وزن کے ساتھ انھیں لے لیجئے اور جس طرح جی چاہے ملا کر دیکھ لیجئے، آدمی کسی ترکیب سے نہ بن سکے گا۔ پھر کس طرح آپ کی عقل یہ مان سکتی ہے کہ ان چند بے جان چیزوں سے دیکھتا، سنتا، بولتا، چلتا، پھرتا انسان، وہ انسان جو ہوائی جہاز اور ریڈیو بناتا ہے، کسی کاریگر کی حکمت کے بغیر خود بخود بن جاتا ہے؟

کبھی آپ نے غور کیا کہ ماں کے پیٹ کی چھوٹی سی فیکٹری میں کس طرح آدمی تیار ہوتا ہے؟ باپ کی کاریگری کا اس میں کوئی دخل نہیں، ماں کی حکمت کا اس میں کوئی کام نہیں۔ ایک ذرا سی تھیلی میں دو کیڑے جو خوردبین کے بغیر دیکھے تک نہیں جا سکتے نہ معلوم کب آپس میں مل جاتے ہیں۔ ماں کے خون ہی سے ان کو غذا پہنچنی شروع ہوتی ہے، وہیں سے لوہا، گندھک، فاسفورس، وغیرہ تمام چیزیں، جن کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے ایک خاص وزن اور خاص نسبت کے ساتھ وہاں جمع ہو کر لوتھڑا بنتی ہیں، پھر اس لوتھڑے میں جہاں آنکھیں بننی چاہئیں، وہاں آنکھیں بنتی ہیں، جہاں کان بننے چاہئیں وہاں کان بنتے ہیں، جہاں دماغ بننا چاہئے وہاں دماغ بنتا ہے، جہاں دل بننا چاہئے وہاں دل بنتا ہے۔ ہڈی اپنی جگہ پر، گوشت اپنی جگہ پر، غرض ایک ایک پرزہ اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک بیٹھتا ہے پھر اس میں جان پڑتی ہے، دیکھنے کی طاقت، سننے کی طاقت، چکھنے اور سونگھنے کی طاقت، بولنے کی طاقت، سوچنے اور سمجھنے کی طاقت، اور کتنی بے حد و حساب طاقتیں اس میں بھر جاتی ہیں۔ اس طرح جب انسان مکمل

ہو جاتا ہے تو پیٹ کی وہی چھوٹی سی فیکٹری جہاں نو مہینے تک وہ بن رہا تھا، خود زور کر کے اسے باہر دھکیل دیتی ہے۔ اور دنیا یہ دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے کہ اس فیکٹری میں ایک ہی طریقے سے لاکھوں انسان روز بن کر نکلتے رہتے ہیں، مگر ہر ایک کا نمونہ جُدا ہے، شکل جدا، رنگ جدا، آواز جدا، قوتیں اور قابلیتیں جُدا، طبیعتیں اور خیالات جُدا، اخلاق اور صفات جُدا، غرض ایک ہی پیٹ سے نکلے ہوئے دو سگے بھائی تک ایک دوسرے سے نہیں ملتے، یہ ایسا کرشمہ ہے جسے دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس کرشمے کو دیکھ کر بھی جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ کام کسی زبردست حکمت والے، زبردست قدرت والے، زبردست علم اور بے نظیر کمالات رکھنے والے خدا کے بغیر ہو رہا ہے یا ہو سکتا ہے، یقیناً اس کا دماغ درست نہیں ہے۔ اس کو عقلمند سمجھنا عقل کی توہین کرنا ہے۔ کم از کم میں تو ایسے شخص کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ کسی معقول مسئلے پر اس سے گفتگو کروں۔

توحید

اچھا، اب ذرا اور آگے چلئے۔ آپ میں سے ہر شخص کی عقل اس بات کی گواہی دیگی کہ دنیا میں کوئی کام بھی، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کبھی باضابطگی و باقاعدگی سے نہیں چل سکتا جب تک کہ کوئی ایک شخص اس کا ذمہ دار نہ ہو۔ ایک مدرسہ کے دو ہیڈ ماسٹر، ایک محکمہ کے دو ڈائرکٹر، ایک فوج کے دو سپہ سالار، ایک سلطنت کے دو رئیس یا بادشاہ کبھی آپ نے سُنے ہیں؟ اور کہیں ایسا ہو تو کیا آپ سمجھتے ہیں

کہ ایک دن کے لئے بھی انتظام ٹھیک ہو سکتا ہے؟ آپ اپنی زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں اس کا تجربہ کرتے ہیں کہ جہاں ایک کام کو ایک سے زیادہ آدمیوں کی ذمہ داری پر چھوڑا جاتا ہے، وہاں سخت بدانتظامی ہوتی ہے، لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں، اور آخر ساجھے کی ہنڈیا چوراہے میں پھوٹ کر رہتی ہے۔ انتظام، باقاعدگی، ہمواری اور خوش اسلوبی دنیا میں جہاں کہیں بھی آپ دیکھتے ہیں وہاں لازمی طور پر کوئی ایک طاقت کارفرما ہوتی ہے، کوئی ایک ہی وجود با اختیار و اقتدار ہوتا ہے، اور کسی ایک ہی کے ہاتھ میں سررشتۂ کار ہوتا ہے، اس کے بغیر انتظام کا آپ تصور تک نہیں کر سکتے۔

یہ ایسی سیدھی بات ہے کہ کوئی شخص جو تھوڑی سی عقل بھی رکھتا ہو اسے ماننے میں تامل نہ کرے گا۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کر ذرا اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نظر ڈالئے۔ یہ زبردست کائنات جو آپ کے سامنے پھیلی ہوئی ہے، یہ کروڑوں ستارے جو آپ کو اوپر گردش کرتے نظر آتے ہیں، یہ زمین جس پر آپ رہتے ہیں، یہ چاند جو راتوں کو نکلتا ہے، یہ سورج جو ہر روز طلوع ہوتا ہے، یہ زہرہ، یہ مریخ، یہ عطارد، یہ مشتری، اور یہ دوسرے بے شمار تارے جو گیندوں کی طرح گھوم رہے ہیں، دیکھئے! ان سب کے گھومنے میں کیسی سخت باقاعدگی ہے۔ کبھی رات اپنے وقت سے پہلے آتی ہوئی آپنے دیکھی؟ کبھی دن وقت سے پہلے نکلتے دیکھا؟ کبھی چاند زمین سے ٹکرایا؟ کبھی سورج اپنا راستہ چھوڑ کر ہٹا؟ کبھی کسی اور ستارے کو آپنے ایک بال برابر بھی اپنی گردش

کی راہ سے ہٹتے ہوئے دیکھا یا سنا؟ یہ کروڑہا سیارے جن میں سے بعض ہماری زمین سے لاکھوں گنا بڑے ہیں اور بعض سورج سے بھی ہزاروں گنے بڑے، یہ سب گھڑی کے پرزوں کی طرح ایک زبردست ضابطے میں کسے ہوئے اور ایک بندھے ہوئے حساب کے مطابق اپنی اپنی مقررہ رفتار کے ساتھ اپنے اپنے مقررہ راستے پر چل رہے ہیں، نہ کسی کی رفتار میں ذرہ برابر فرق آتا ہے، نہ کوئی اپنے راستے سے بال برابر ٹل سکتا ہے۔ ان کے درمیان جو نسبتیں قائم کردی گئی ہیں، اگر ان میں ایک پل کے لئے بھی ذرا سا فرق آجائے تو سارا نظامِ عالم درہم برہم ہوجائے جس طرح ریلیں ٹکراتی ہیں اس طرح سیارے ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں۔

یہ تو آسمان کی باتیں ہیں۔ ذرا اپنی زمین اور اپنی ذات پر نظر ڈال کر دیکھئے۔ اس مٹی کی گیند پر یہ سارا زندگی کا کھیل جو آپ دیکھ رہے ہیں یہ سب چند بندھے ہوئے ضابطوں کی بدولت قائم ہے۔ زمین کی کشش نے ساری چیزوں کو اپنے حلقے میں باندھ رکھا ہے ایک سکنڈ کے لئے بھی اگر وہ اپنی گرفت چھوڑ دے تو سارا کارخانہ بکھر جائے۔ اس کارخانہ میں جتنے کل پرزے کام کر رہے ہیں، سب کے سب ایک قاعدے کے پابند ہیں اور اس قاعدے میں کبھی فرق نہیں آتا۔ ہوا اپنے قاعدے کی پابندی کر رہی ہے، پانی اپنے قاعدے میں بندھا ہوا ہے، روشنی کے لئے جو قاعدہ ہے اس کی وہ مطیع ہے، گرمی اور سردی کے لئے جو ضابطہ ہے اُس کی وہ غلام ہے، مٹی، پتھر، دھاتیں، بجلی، اسٹیم، درخت، جانور کسی میں یہ مجال نہیں کہ اپنی حد سے بڑھ جائے

یا اپنی خاصیتوں کو بدل دے، یا اس کام کو چھوڑ دے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے، پھر اپنی حد کے اندر، اپنے ضابطہ کی پابندی کرنے کے ساتھ، اس کارخانے کے سارے پرزے ایک دوسرے کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں، اور دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے، سب اسی وجہ سے ہو رہا ہے کہ یہ ساری چیزیں اور ساری قوتیں مل کر کام کر رہی ہیں۔ ایک ذرا سے بیج کی ہی مثال لے لیجئے جس کو آپ زمین میں بوتے ہیں، وہ کبھی پرورش پا کر درخت بن ہی نہیں سکتا جب تک کہ زمین اور آسمان کی ساری قوتیں مل کر اس کی پرورش میں حصّہ نہ لیں۔ زمین اپنے خزانوں سے اس کو غذا دیتی ہے، سورج اس کی ضرورت کے مطابق اسے گرمی پہنچاتا ہے، پانی سے جو کچھ وہ مانگتا ہے وہ پانی دیتا ہے، ہوا سے جو کچھ وہ طلب کرتا ہے وہ ہوا دیتی ہے، راتیں اسے ٹھنڈک اور اوس بہم پہنچاتی ہیں، دن اُسے گرمی پہنچا کر پختگی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس طرح مہینوں اور برسوں تک مسلسل ایک باقاعدگی کے ساتھ یہ سب مل جل کر اُسے پالتے پوستے ہیں، تب جا کر کہیں درخت بنتا ہے، اور اس میں پھل آتے ہیں۔ آپ کی یہ ساری فصلیں جن کے بل بوتے پر آپ جی رہے ہیں، انہی بیشمار مختلف قوتوں کے بالاتفاق کام کرنے ہی کی وجہ سے تیار ہوتی ہیں۔ بلکہ آپ خود زندہ اسی وجہ سے ہیں کہ زمین اور آسمان کی تمام طاقتیں متفقہ طور پر آپ کی پرورش میں لگی ہوئی ہیں۔ اگر تنہا ایک ہوا ہی اس متفقہ کاروبار سے الگ ہو جائے تو آپ ختم ہو جائیں۔ اگر پانی ہوا اور گرمی کے ساتھ موافقت کرنے سے انکار کر دے

تو آپ پر بارش کا ایک قطرہ نہ برس سکے۔ اگر مٹی پانی کے ساتھ اتفاق کرنا چھوڑ دے تو آپ کے باغ سوکھ جائیں۔ آپ کی کھیتیاں کبھی نہ پکیں اور آپ کے مکان کبھی نہ بن سکیں۔ اگر دیا سلائی کی رگڑ سے آگ پیدا ہونے پر راضی نہ ہو تو آپ کے چولھے ٹھنڈے ہو جائیں اور آپ کے سارے کارخانے یکلخت بیٹھ جائیں۔ اگر لوہا آگ کے ساتھ تعلق رکھنے سے انکار کر دے تو آپ ریلیں اور موٹریں تو درکنار ایک سوئی اور چھری تک نہ بنا سکیں۔ غرض یہ ساری دنیا جس میں آپ جی رہے ہیں یہ صرف اسی وجہ سے قائم ہے کہ اس عظیم الشان سلطنت کے سارے محکمے پوری پابندی کے ساتھ ایک دوسرے سے مل کر کام کر رہے ہیں۔ اور کسی محکمے کے کسی اہل کار کی یہ مجال نہیں ہے کہ اپنی ڈیوٹی سے ہٹ جائے یا ضابطہ کے مطابق دوسرے محکموں کے اہل کاروں سے اشتراکِ عمل نہ کرے۔

یہ جو کچھ میں نے آپ سے بیان کیا ہے، کیا اس میں کوئی بات جھوٹ یا خلافِ واقعہ ہے؟ شاید آپ میں سے کوئی بھی اسے جھوٹ نہ کہے گا۔ اچھا اگر یہ سچ ہے تو مجھے بتائیے کہ یہ زبردست انتظام، یہ حیرت انگیز باقاعدگی، یہ کمال درجہ کی ہمواری، یہ زمین و آسمان کی بے حد و حساب چیزوں اور طاقتوں میں کامل موافقت آخر کس وجہ سے ہے؟ کروڑوں برس سے یہ کائنات یونہی قائم چلی آرہی ہے، لکھوکھا سال سے اس زمین پر درخت اُگ رہے ہیں، جانور پیدا ہو رہے ہیں، اور نہ معلوم کب سے انسان اس زمین پر جی رہا ہے کبھی ایسا نہ ہوا کہ چاند زمین پر گر جاتا، یا

زمین سورج سے ٹکراتی۔ کبھی رات اور دن کے حساب میں فرق نہ آیا۔ کبھی ہوا کے محکمے کی پانی کے محکمے سے لڑائی نہ ہوئی، کبھی پانی مٹی سے نہ روٹھا۔ کبھی گرمی نے آگ سے رشتہ نہ توڑا۔ آخر اس سلطنت کے تمام صوبے، تمام محکمے، تمام ہرکارے اور کارندے کیوں اس طرح قانون اور ضابطے کی پابندی کئے چلے جا رہے ہیں؟ کیوں ان میں لڑائی نہیں ہوتی؟ کیوں فساد برپا نہیں ہوتا؟ کس چیز کی وجہ سے یہ سب ایک انتظام میں بندھے ہوئے ہیں؟ اس کا جواب اپنے دل سے پوچھئے۔ کیا وہ یہ گواہی نہیں دیتا کہ ایک ہی خدا اس ساری کائنات کا بادشاہ ہے۔ ایک ہی ہے جس کی زبردست طاقت نے سب کو اپنے ضابطے میں باندھ رکھا ہے؟ اگر دس بیس نہیں دو خدا بھی اس کائنات کے مالک ہوتے تو یہ انتظام اس باقاعدگی کے ساتھ کبھی نہ چل سکتا۔ ایک ذرا سے مدرسے کا انتظام تو دو ہیڈ ماسٹروں کی ہیڈ ماسٹری برداشت نہیں کر سکتا، پھر بھلا اتنی بڑی زمین و آسمان کی سلطنت دو خداؤں کی خدائی میں کیسے چل سکتی تھی؟

پس واقعہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ دنیا کسی بنانے والے کے بغیر نہیں بنی ہے بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ اس کو ایک ہی نے بنایا ہے حقیقت صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اس دنیا کا انتظام کسی حاکم کے بغیر نہیں چل رہا ہے، بلکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ حاکم ایک ہی ہے، انتظام کی باقاعدگی صاف کہہ رہی ہے کہ یہاں ایک کے سوا کسی کے ہاتھ میں حکومت کے اختیارات نہیں ہیں۔ ضابطہ کی پابندی مُنہ سے بول رہی

ہے کہ اس سلطنت میں ایک حاکم کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا۔ قانون کی سخت گیری شہادت دے رہی ہے کہ ایک بادشاہ کی حکومت زمین سے آسمان تک قائم ہے۔ چاند، سورج، اور سیارے اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ زمین اپنی تمام چیزوں کے ساتھ اُسی کی تابعِ فرمان ہے، ہوا اُسی کی غلام ہے، پانی اُسی کا بندہ ہے، دریا اور پہاڑ اُسی کے محکوم ہیں، درخت اور جانور اُسی کے مطیع ہیں۔ انسان کا جینا اور مرنا اُسی کے اختیار میں ہے۔ اُس کی مضبوط گرفت نے سب کو پوری قوت کے ساتھ جکڑ رکھا ہے۔ اور کوئی اتنا زور نہیں رکھتا کہ اس کی حکومت میں اپنا حکم چلا سکے۔ درحقیقت اس مکمل تنظیم میں ایک سے زیادہ حاکموں کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ تنظیم کی فطرت یہ چاہتی ہے کہ حکم میں ایک شمہ برابر بھی کوئی اس کا حصہ دار نہ ہو، تنہا وہی حاکم ہو اور اس کے سوا سب محکوم ہوں۔ کیونکہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں فرمانروائی کے ادنٰے سے اختیارات ہونے کے معنی بھی بدنظمی اور فساد کے ہیں۔ حکم چلانے کے لئے صرف طاقت ہی درکار نہیں ہے، علم بھی درکار ہے۔ اتنی وسیع نظر درکار ہے کہ تمام کائنات کو بیک وقت دیکھ سکے۔ اور اس کی مصلحتوں کو سمجھ کر احکام کر سکے۔ اگر خداوند عالم کے سوا کچھ چھوٹے چھوٹے خدا ایسے ہوتے جو نگاہِ جہاں بیں تو نہ رکھتے، لیکن انھیں دنیا کے کسی حصے یا کسی معاملہ میں اپنا حکم چلانے کا اختیار حاصل ہوتا تو یہ زمین و آسمان کا سارا کارخانہ درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔ ایک معمولی مشین کے متعلق بھی آپ جانتے ہیں کہ اگر کسی ایسے شخص کو اس میں دخل اندازی

کا اختیار دیدیا جائے جو اس سے پوری طرح واقف نہ ہو تو وہ اسے بگاڑ کر رکھ دیگا لہٰذا عقل یہ فیصلہ کرتی ہے، اور زمین و آسمان کے نظام سلطنت کا انتہائی باضابطگی کے ساتھ چلنا اس کی گواہی دیتا ہے کہ اس سلطنت کے اختیاراتِ شاہی میں ایک خدا کے سوا کسی کا ذرہ برابر حصہ نہیں ہے۔

یہ صرف ایک واقعہ ہی نہیں ہے حق یہ ہے کہ خدا کی خدائی میں خود خدا کے سوا کسی کا حکم چلنے کی کوئی وجہ بھی نہیں جن کو اس نے اپنے دستِ قدرت سے بنایا ہے، جو اس کی مخلوق ہیں، جن کی ہستی اس کی عنایت سے قائم ہے، جو اس سے بے نیاز ہو کر خود اپنے بل بوتے پر ایک لمحہ کے لئے بھی موجود نہیں رہ سکتے، ان میں سے کسی کی یہ حیثیت کب ہو سکتی ہے کہ خدائی میں اس کا حصہ دار بن جائے؟ کیا کسی نوکر کو آپ نے ملکیت میں آقا کا شریک ہوتے دیکھا ہے؟ کیا آپ کی عقل میں یہ بات آتی ہے کہ کوئی مالک اپنے غلام کو اپنا ساجھی بنالے؟ کیا خود آپ میں سے کوئی شخص اپنے ملازموں میں سے کسی کو اپنی جائداد میں یا اپنے اختیارات میں حصہ دار بناتا ہے؟ اس بات پر جب آپ غور کرینگے تو آپ کا دل گواہی دیگا کہ خدا کی اس سلطنت میں کسی بندے کو خود مختارانہ فرماں روائی کا کوئی حق حاصل ہی نہیں ہے۔ ایسا ہونا نہ صرف واقعہ کے خلاف ہے، نہ صرف عقل اور فطرت کے خلاف ہے، بلکہ حق کے خلاف بھی ہے۔

انسان کی تباہی کا اصلی سبب

صاحبو! یہ بنیادی حقیقتیں ہیں جن پر اس دنیا کا پورا نظام چل رہا ہے آپ

اس دنیا سے الگ نہیں ہیں، بلکہ اس کے اندر اس کے ایک جز کی حیثیت سے رہتے ہیں لہٰذا آپ کی زندگی کے لئے بھی یہ حقیقتیں اسی طرح بنیادی ہیں، جس طرح کل جہاں کیلئے ہیں۔

آج یہ سوال آپ میں سے ہر شخص کے لئے اور دنیا کے تمام انسانوں کے لئے ایک پریشان کن گتھی بنا ہوا ہے کہ آخر ہم انسانوں کی زندگی سے امن وچین کیوں رخصت ہو گیا؟ کیوں آئے دن یہ مصیبتیں ہم پر نازل ہو رہی ہیں؟ کیوں ہماری زندگی بگڑ گئی ہے؟ قومیں قوموں سے ٹکرا رہی ہیں، ملک ملک میں کھینچا تانی ہو رہی ہے۔ آدمی، آدمی کے لئے بھیڑیا بن گیا ہے۔ لاکھوں انسان لڑائیوں میں برباد ہو رہے ہیں۔ کروڑوں اور اربوں کے کاروبار غارت ہو رہے ہیں۔ بستیوں کی بستیاں اُجڑ رہی ہیں۔ طاقتور کمزوروں کو کھائے جاتے ہیں۔ مالدار غریبوں کو لوٹے لیتے ہیں۔ حکومت میں ظلم ہے۔ عدالت میں بے انصافی ہے۔ دولت میں بدمستی ہے۔ اقتدار میں غرور ہے۔ دوستی میں بے وفائی ہے۔ امانت میں خیانت ہے۔ اخلاق میں راستی نہیں رہی۔ انسان پر سے انسان کا اعتماد اُٹھ گیا۔ مذہب کے جامے میں لامذہبی ہو رہی ہے۔ آدم کے بچے لاتعداد گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اور ہر گروہ دوسرے گروہ کو دغا، ظلم، بے ایمانی، ہر ممکن طریقہ سے نقصان پہنچانا کار ثواب سمجھ رہا ہے۔ یہ ساری خرابیاں آخر کس وجہ سے ہیں؟ خدا کی خدائی میں اور جس طرف بھی ہم دیکھتے ہیں امن ہی امن نظر آتا ہے۔ ستاروں میں امن ہے۔ ہوا میں امن ہے۔ پانی میں امن ہے۔ درختوں اور جانوروں میں امن ہے۔ تمام مخلوقات کا انتظام پورے امن کے ساتھ چل رہا ہے۔ کہیں فساد یا بدنظمی کا

نشان نہیں پایا جاتا۔ مگر ایک انسان ہی کی زندگی کیوں اس نعمت سے محروم ہو گئی!
یہ ایک بڑا سوال ہے، جسے حل کرنے میں لوگوں کو سخت پریشانی پیش آرہی ہے، مگر میں پورے اطمینان کے ساتھ اس کا جواب دینا چاہتا ہوں، میرے پاس اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ آدمی نے اپنی زندگی کو حقیقت اور واقعہ کے خلاف بنا دیا ہے، اس لئے وہ تکلیف اٹھا رہا ہے اور جب تک وہ پھر اسے حقیقت کے مطابق نہ بنائے گا، کبھی چین نہ پا سکے گا۔ آپ چلتی ہوئی ریل کے دروازے کو اپنے گھر کا دروازہ سمجھ بیٹھیں اور اسے کھول کر بے تکلف اس طرح باہر نکل آئیں جیسے اپنے مکان کے صحن میں قدم رکھ رہے ہیں، تو آپ کی اس غلط فہمی سے نہ ریل کا دروازہ گھر کا دروازہ بن جائیگا اور نہ وہ میدان جہاں آپ گریں گے گھر کا صحن ثابت ہو گا۔ آپ کے اپنی جگہ کچھ سمجھ بیٹھنے سے حقیقت ذرا بھی نہ بدلے گی۔ نیز دوڑتی ہوئی ریل کے دروازے سے جب آپ باہر تشریف لائیں گے تو اس کا جو نتیجہ ظاہر ہوتا ہے وہ ظاہر ہو کر ہی رہیگا، خواہ ٹانگ ٹوٹنے اور سر پھٹنے کے بعد بھی آپ یہ تسلیم نہ کریں کہ آپ نے جو کچھ سمجھا تھا غلط تھا۔ بالکل اسی طرح اگر آپ یہ سمجھ بیٹھیں کہ اس دنیا کا کوئی خدا نہیں ہے یا آپ خود اپنے خدا بن بیٹھیں، یا خدا کے سوا کسی اور کی خدائی مان لیں، تو آپ کے ایسا سمجھنے یا مان لینے سے حقیقت ہرگز نہ بدلے گی۔ خدا خدا ہی رہیگا۔ اس کی زبردست سلطنت جس میں آپ محض رعیّت کی حیثیت سے رہتے ہیں، پورے اختیارات کے ساتھ اسی کے قبضہ میں رہے گی۔ البتہ آپ اپنی غلط فہمی کی وجہ سے

جو طرزِ زندگی اختیار کرینگے اس کا نہایت بُرا خمیازہ آپ کو بھگتنا پڑیگا خواہ آپ تکلیفیں اُٹھانے کے بعد بھی اپنی اس غلط زندگی کو بجائے خود صحیح ہی سمجھتے رہیں۔

پہلے میں جو کچھ بیان کرچکا ہوں اسے ذرا اپنی یاد میں پھر تازہ کرلیجئے۔ خداوندِ عالم کسی کے بنائے سے خداوندِ عالم نہیں بنا ہے۔ وہ اس کا محتاج نہیں ہے کہ آپ اس کی خدائی مانیں تو وہ خدا ہو۔ آپ خواہ مانیں یا نہ مانیں وہ تو خود خدا ہے۔ اس کی خدائی خود اپنے زور پر قائم ہے۔ اس نے آپ کو اور اس دنیا کو خود بنایا ہے۔ یہ زمین، یہ چاند اور سورج اور یہ ساری کائنات اس کے حکم کی تابع ہے۔ اس کائنات میں جتنی قوتیں کام کرتی ہیں سب اس کے زیرِ حکم ہیں۔ وہ ساری چیزیں جنکے بل پر آپ زندہ ہیں، اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ خود آپ کا اپنا وجود اس کے اختیار میں ہے۔ اس واقعہ کو آپ کسی طرح بدل نہیں سکتے۔ آپ اس کو نہ مانیں تب بھی یہ واقعہ ہے۔ آپ اس سے آنکھیں بند کرلیں تب بھی یہ واقعہ ہے۔ آپ اس کے سوا کچھ اور سمجھ بیٹھیں تب بھی یہ واقعہ ہے۔ ان سب صورتوں میں واقعہ کا تو کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ البتہ فرق یہ ہوتا ہے کہ اگر آپ اس واقعہ کو تسلیم کرکے اپنی وہی حیثیت قبول کریں جو اس واقعہ کے اندر درحقیقت آپ کی ہے تو آپ کی زندگی درست ہوگی، آپ کو چین ملے گا، امن ملے گا، اطمینان نصیب ہوگا، اور آپ کی زندگی کی ساری کل ٹھیک چلے گی۔ اور اگر آپ نے واقعہ کے خلاف کوئی اور حیثیت اختیار کی تو انجام وہی ہوگا جو چلتی ہوئی ریل کے دروازے کو اپنے گھر کا دروازہ سمجھ کر قدم

باہر نکالنے کا ہوتا ہے، چوٹ آپ خود کھائیں گے۔ ٹانگ آپ کی ٹوٹے گی یا سر آپ کا پھٹے گا، تکلیف آپ کو پہنچے گی۔ واقعہ جیسا تھا ویسا ہی رہے گا۔

آپ سوال کریں گے کہ اس واقعہ کے مطابق ہماری صحیح حیثیت کیا ہے؟ میں چند لفظوں میں اس کی تشریح کر دیتا ہوں۔ اگر کسی نوکر کو آپ تنخواہ دے کر پال رہے ہوں تو بتائیے اس نوکر کی اصلی حیثیت کیا ہے؟ یہی ناکہ آپ کی نوکری بجالائے، آپ کے حکم کی اطاعت کرے، آپ کی مرضی کے مطابق کام کرے، اور نوکری کی حد سے نہ بڑھے۔ نوکر کا کام آخر نوکری کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ آپ اگر افسر ہوں اور کوئی آپ کا ماتحت ہو تو ماتحت کا کام کیا ہے؟ یہی ناکہ وہ ماتحتی کرے، افسری کی ہوا میں نہ رہے۔ اگر آپ کسی جائداد کے مالک ہوں تو اس جائداد میں آپ کی خواہش کیا ہوگی؟ یہی ناکہ اس میں آپ کی مرضی چلے۔ جو کچھ آپ چاہیں وہی ہو اور آپ کی مرضی کے خلاف پتّہ نہ ہل سکے۔ آپ پر اگر کوئی بادشاہی مسلط ہو اور تمام قوتیں اس کے ہاتھ میں ہوں تو ایسی بادشاہی کی موجودگی میں آپ کی حیثیت کیا ہو سکتی ہے؟ یہی ناکہ آپ سیدھی طرح رعیت بن کر رہنا قبول کریں اور شاہی قانون کی فرماں برداری سے قدم باہر نہ نکالیں۔ بادشاہ کی سلطنت کے اندر رہتے ہوئے اگر آپ خود اپنی بادشاہی کا دعویٰ کریں گے یا کسی دوسرے کی بادشاہی مان کر اس کے حکم پر چلیں گے تو آپ باغی ہوں گے۔ اور باغی کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔

ان مثالوں سے آپ خوب سمجھ سکتے ہیں کہ خدا کی اس سلطنت میں آپ کی اصلی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو اس نے بنایا ہے۔ قدرتی طور پر آپ کا کوئی کام اس کے سوا نہیں ہے کہ اپنے بنانے والے کی مرضی پر چلیں۔ آپ کو وہ پال رہا ہے اور اسی کے خزانے سے آپ تنخواہ لے رہے ہیں۔ آپ کی کوئی حیثیت اس کے سوا نہیں ہے کہ آپ اس کے نوکر ہیں۔ آپ کا اور ساری دنیا کا افسر وہ ہے۔ اس کی افسری میں آپ کی حیثیت ماتحتی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے؟ یہ زمین اور آسمان سب اس کی جائداد ہیں۔ اس جائداد میں اُسی کی مرضی چلے گی اور چلنی چاہئے۔ آپ کو یہاں اپنی مرضی چلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اپنی مرضی آپ چلانے کی کوشش کرینگے تو منہ کی کھائیں گے۔ اس سلطنت میں اس کی بادشاہی اس کے اپنے زور پر قائم ہے۔ زمین اور آسمان کے سارے محکمے اس کے قبضہ میں ہیں، اور آپ خواہ راضی ہوں یا ناراض، بہر حال خود آپ اس کی رعیّت ہیں۔ آپ کی اور کسی انسان کی بھی، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا، کوئی دوسری حیثیت رعیّت ہونے کے سوا نہیں ہے۔ اُسی کا قانون اس سلطنت میں قانون ہے۔ اور اسی کا حکم حکم ہے۔ رعیت میں سے کسی کو یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں ہے کہ میں ہز میجسٹی ہوں، یا ہز ہائی نس ہوں، یا ڈکٹیٹر اور خود مختار ہوں۔ نہ کسی شخص یا پارلیمنٹ یا اسمبلی یا کونسل کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اس سلطنت میں خدا کے بجائے خود اپنا قانون بنائے اور خدا کی رعیت سے کہے کہ ہمارے اس قانون کی پیروی کرو۔ نہ کسی انسانی حکومت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ

خدا کے حکم سے بے نیاز ہو کر خود اپنا حکم چلائے۔ اور ان سے کہے کہ ہمارے اس حکم کی اطاعت کرے۔ نہ کسی انسان یا انسانوں کے کسی گروہ کے لئے یہ جائز ہے کہ اصلی بادشاہ کی رعیت بننے کے بجائے بادشاہی کے جھوٹے مدعیوں میں سے کسی کی رعیت بننا قبول کرے۔ اصلی بادشاہ کے قانون کو چھوڑ کر جھوٹے قانون سازوں کا قانون تسلیم کرے، اور اصلی حکمراں سے منہ موڑ کر جھوٹ موٹ کی ان حکومتوں کا حکم ماننے لگے۔ یہ تمام صورتیں بغاوت کی ہیں، بادشاہی کے اختیارات کا دعویٰ کرنا اور ایسے دعویٰ کو قبول کرنا، دونوں حرکتیں رعیت کے لئے بغاوت کا حکم رکھتی ہیں، اور اس کی سزا ان دونوں کو ملنی یقینی ہے خواہ جلدی ملے یا دیر میں۔

آپ کی اور ایک ایک انسان کی پیشانی کے بال خدا کی مٹھی میں ہیں۔ جب چاہے پکڑ کر گھسیٹ لے۔ زمین اور آسمان کی اس سلطنت میں بھاگ جانے کی طاقت کسی میں نہیں ہے۔ آپ اس سے بھاگ کر کہیں پناہ نہیں لے سکتے۔ مٹی میں مل کر آپ کا ایک ایک ذرہ بھی اگر منتشر ہو جائے۔ آگ میں جل کر خواہ آپکی راکھ ہوا میں پھیل جائے۔ پانی میں بہ کر خواہ آپ مچھلیوں کی خوراک بنیں یا سمندر کے پانی میں گھل جائیں، ہر جگہ سے خدا آپ کو پکڑ بلائے گا۔ ہوا اس کی غلام ہے، زمین اس کی بندی ہے، پانی اور اس کی مچھلیاں سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔ ایک اشارے پر سب طرف سے آپ پکڑے ہوئے آجائیں گے اور پھر وہ آپ میں سے ایک ایک کو بلا کر پوچھے گا کہ میری رعیت ہو کر بادشاہی کا دعویٰ کرنے کا حق

تمہیں کہاں سے پہنچ گیا تھا؟ میرے ملک میں اپنا حکم چلانے کے اختیارات تم کہاں سے لائے تھے؟ میری سلطنت میں اپنا قانون جاری کرنے والے تم کون تھے؟ میرے بندے ہو کر دوسروں کی بندگی کرنے پر تم کیسے راضی ہو گئے؟ میرے نوکر ہو کر تم نے دوسروں کا حکم مانا، مجھ سے تنخواہ لے کر دوسروں کو اَن داتا اور رازق سمجھا، میرے غلام ہو کر دوسروں کی غلامی کی، میری بادشاہی میں رہتے ہوئے دوسروں کے قانون کو قانون سمجھا، اور دوسروں کے فرامین کی اطاعت کی، یہ بغاوت کس طرح تمہارے لئے جائز ہو گئی تھی؟ فرمائیے۔ آپ میں سے کسی کے پاس اس الزام کا جواب ہے؟ کون سے وکیل صاحب وہاں اپنے قانونی داؤ پیچ سے بچاؤ کی صورت نکال سکیں گے؟ اور کون سی سفارش پر آپ بھروسہ رکھتے ہیں کہ وہ آپ کو اس بغاوت کے جرم کی سزا بھگتنے سے بچالے گی؟

ظلم کی وجہ

صاحبو! یہاں صرف حق ہی کا سوال نہیں ہے۔ یہ سوال بھی ہے کہ خدا کی اس خدائی میں کیا کوئی انسان بادشاہی یا قانون سازی یا حکمرانی کا اہل ہو سکتا ہے؟ جیسا کہ ابھی عرض کر چکا ہوں۔ ایک معمولی مشین کے متعلق بھی آپ یہ جانتے ہیں کہ اگر کوئی اناڑی شخص جو اس کی مشینری سے واقف نہ ہو، اسے چلائے گا تو بگاڑ دے گا۔ ذرا کسی ناواقف آدمی سے ایک موٹر ہی چلوا کر دیکھ لیجئے، ابھی آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس حماقت کا کیا انجام ہوتا ہے۔ اب خود سوچئے کہ لوہے کی

ایک مشین کا حال جب یہ ہے کہ صحیح علم کے بغیر اس کو استعمال نہیں کیا جا سکتا تو انسان جس کے نفسیات انتہا درجہ کے پیچیدہ ہیں، جس کی زندگی کے معاملات بے شمار پہلو رکھتے ہیں اور ہر پہلو میں لاکھوں گتھیاں ہیں، اس کی پیچ در پیچ مشینری کو وہ لوگ کیا چلا سکتے ہیں جو دوسروں کو جاننا اور سمجھنا تو درکنار خود اپنے آپ کو بھی اچھی طرح نہیں جانتے، نہیں سمجھتے۔ ایسے اناڑی جب قانون ساز بن بیٹھیں گے اور ایسے نادان جب انسانی زندگی کی ڈرائیوری کرنے پر آمادہ ہونگے تو کیا اس کا انجام کسی اناڑی شخص کے موٹر چلانے کے انجام سے کچھ بھی مختلف ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جہاں خدا کے بجائے انسانوں کا بنایا ہُوا قانون مانا جا رہا ہے اور جہاں خدا کی اطاعت سے بے نیاز ہو کر انسان حکم چلا رہے ہیں اور انسان ان کا حکم مان رہے ہیں، وہاں کسی جگہ بھی امن نہیں ہے، کسی جگہ بھی آدمی کو چین نصیب نہیں، کسی جگہ بھی انسانی زندگی کی کل سیدھی نہیں چلتی۔ کشت و خون ہو رہے ہیں، ظلم اور بے انصافی ہو رہی ہے، لوٹ کھسوٹ برپا ہے، آدمی کا آدمی خون چوس رہا ہے۔ اخلاق تباہ ہو رہے ہیں، صحتیں برباد ہو رہی ہیں۔ تمام طاقتیں جو خدا نے انسان کو دی تھیں، انسان کے فائدے کے بجائے اس کی تباہی اور بربادی میں صرف ہو رہی ہیں۔ یہ مستقل دوزخ جو اسی دنیا میں انسان نے اپنے لئے آپ اپنے ہاتھوں بنالی ہے، اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس نے بچوں کی طرح شوق میں آکر اس مشین کو چلانے کی کوشش کی،

جس کے کل پرزوں سے وہ واقف ہی نہیں۔ اس مشین کو جس نے بنایا ہے وہی اس کے رازوں کو جانتا ہے، وہی اس کی فطرت سے واقفیت رکھتا ہے، اُسی کو ٹھیک ٹھیک معلوم ہے کہ یہ کس طرح صحیح چل سکتی ہے۔ اگر آدمی اپنی حماقت سے باز آجائے اور اپنی جہالت تسلیم کر کے اُس قانون کی پابندی کرنے لگے جو خود اس مشین کے بنانے والے نے مقرر کیا ہے، تب تو جو کچھ بگڑا ہے وہ پھر بن سکتا ہے، ورنہ ان مصیبتوں کا کوئی حل ممکن نہیں ہے۔

بے انصافی کیوں ہے؟

آپ ذرا اور گہری نظر سے دیکھیں تو آپ کو جہالت کے سوا اپنی زندگی کے بگاڑ کی ایک اور وجہ بھی نظر آئے گی۔ ذرا سی عقل یہ بات سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ انسان کسی ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک قوم کا نام نہیں ہے، تمام دنیا کے انسان بہر حال انسان ہیں۔ تمام انسانوں کو جینے کا حق ہے۔ سب اس کے حقدار ہیں کہ ان کی ضرورتیں پوری ہوں۔ سب امن کے، انصاف کے، عزّت اور شرافت کے مستحق ہیں۔ انسانی خوش حالی اگر کسی چیز کا نام ہے تو وہ کسی ایک شخص یا خاندان یا قوم کی خوش حالی نہیں، بلکہ تمام انسانوں کی خوش حالی ہے۔ ورنہ ایک خوش حال ہو اور دس بدحال ہوں تو آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسان خوش حال ہے۔ فلاح اگر کسی چیز کو کہتے ہیں تو وہ تمام انسانوں کی فلاح ہے۔ نہ کہ کسی ایک طبقہ کی یا ایک قوم کی۔ ایک کی فلاح اور دس کی بربادی کو آپ انسانی فلاح نہیں کہہ سکتے۔ اس

بات کو اگر آپ صحیح سمجھتے ہیں تو غور کیجئے کہ انسانی فلاح اور خوش حالی کس طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ انسانی زندگی کے لئے قانون وہ بنائے جس کی نظر میں تمام انسان یکساں ہوں۔ سب کے حقوق انصاف کے ساتھ وہ مقرر کرے جو نہ تو خود اپنی کوئی ذاتی غرض رکھتا ہو اور نہ کسی خاندان یا طبقہ کی یا کسی ملک یا قوم کی اغراض سے وابستہ ہو۔ سب کے سب اس کا حکم مانیں جو حکم دینے میں نہ اپنی جہالت کی وجہ سے غلطی کرے، نہ اپنی خواہش کی بنا پر حکمرانی کے اختیارات سے ناجائز فائدہ اُٹھائے، اور نہ ایک کا دشمن اور دوسرے کا دوست، ایک کا طرفدار اور دوسرے کا مخالف، ایک کی طرف مائل اور دوسرے سے منحرف ہو۔ صرف اسی صورت میں عدل قائم ہو سکتا ہے، اسی طرح تمام انسانوں، تمام قوموں، تمام طبقوں اور تمام گروہوں کو ان کے جائز حقوق پہنچ سکتے ہیں، اور یہی ایک صورت ہے جس سے ظلم مٹ سکتا ہے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ دنیا میں کوئی انسان بھی ایسا بے لاگ، ایسا غیر جانبدار، ایسا بے غرض، اور اس قدر انسانی کمزوریوں سے بالاتر ہو سکتا ہے؟ شاید آپ میں سے کوئی شخص میرے اس سوال کا جواب اثبات میں دینے کی جرأت نہ کریگا۔ یہ شان صرف خدا ہی کی ہے، کوئی دوسرا اس شان کا نہیں ہے۔ انسان خواہ کتنے ہی بڑے دل گردے کا ہو، بہرحال وہ اپنی کچھ ذاتی اغراض رکھتا ہے، کچھ دلچسپیاں رکھتا ہے، کسی سے اس کا تعلق زیادہ ہے اور کسی سے کم، کسی سے محبت ہے اور کسی سے نہیں ہے۔ ان کمزوریوں

سے کوئی انسان پاک نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں خدا کے بجائے انسانوں کا قانون مانا جاتا ہے اور خدا کے بجائے انسانوں کے حکم کی اطاعت کی جاتی ہے، وہاں کسی نہ کسی صورت میں ظلم اور بے انصافی ضرور موجود ہے۔

ان شاہی خاندانوں کو دیکھئے جو زبردستی اپنی طاقت کے بل بوتے پر امتیازی حیثیت حاصل کئے ہوئے ہیں، انہوں نے اپنے لئے وہ عزّت، وہ ٹھاٹھ، وہ آمدنی، وہ حقوق، اور وہ اختیارات مخصوص کر رکھے ہیں جو دوسروں کے لئے نہیں ہیں۔ یہ قانون سے بالاتر ہیں، ان کے خلاف کوئی دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ چاہے کچھ کریں ان کے مقابلہ میں کوئی چارہ جوئی نہیں کی جا سکتی، کوئی عدالت ان کے نام سمن نہیں بھیج سکتی۔ دنیا دیکھتی ہے کہ یہ غلطیاں کرتے ہیں، مگر کہا یہ جاتا ہے اور ماننے والے مان بھی لیتے ہیں کہ بادشاہ غلطی سے پاک ہے۔ دنیا دیکھتی ہے کہ یہ معمولی انسان ہیں، جیسے اور سب انسان ہوتے ہیں، مگر یہ خدا بنکر سب سے اونچے بیٹھتے ہیں، اور لوگ ان کے سامنے یوں ہاتھ باندھے سر جھکائے، ڈرے سہمے کھڑے ہوتے ہیں گویا ان کا رزق، ان کی زندگی، ان کی موت سب ان کے ہاتھ میں ہے۔ یہ رعایا کا پیسہ اچھے اور بُرے ہر طریقے سے گھسیٹتے ہیں اور اُسے اپنے محلوں پر، اپنی سواریوں پر، اپنے عیش و آرام، اور اپنی تفریحوں پر بے دریغ لٹاتے ہیں۔ ان کے کتوں کو وہ روٹی ملتی ہے جو کما کر دینے والی رعایا کو نصیب نہیں ہوتی، کیا یہ انصاف ہے؟ کیا یہ طریقہ کسی ایسے عادل کا مقرر کیا ہُوا ہو سکتا ہے جس کی نگاہ میں سب انسانوں کے حقوق اور مفاد یکساں ہوں؟

ان برہمنوں اور پیروں کو دیکھئے، ان نوابوں اور رئیسوں کو دیکھئے، ان جاگیر داروں اور زمینداروں کو دیکھئے ان ساہوکاروں اور مہاجنوں کو دیکھئے، یہ سب طبقے اپنے آپ کو عام انسانوں سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ ان کے زور و اثر سے جتنے قوانین دنیا میں بنے ہیں وہ انھیں ایسے حقوق دیتے ہیں جو عام انسانوں کو نہیں دئے گئے۔ یہ پاک ہیں اور دوسرے ناپاک، یہ شریف ہیں اور دوسرے کمین، یہ اونچے ہیں اور دوسرے نیچے، یہ لوٹنے کے لئے ہیں، اور دوسرے لٹنے کے لئے۔ ان کے نفس کی خواہشوں پر لوگوں کی جان، مال، عزّت آبرو ہر ایک چیز قربان کر دی جاتی ہے۔ کیا یہ ضابطے کسی منصف بنائے ہوئے ہو سکتے ہیں؟ کیا ان میں صریح طور پر خود غرضی اور جانبداری نظر نہیں آتی؟

ان حاکم قوموں کو دیکھئے جو اپنی طاقت کے بل پر دوسری قوموں کو غلام بنائے ہوئے ہیں، ان کا کون سا قانون اور کونسا ضابطہ ایسا ہے جس میں خود غرضی شامل نہیں ہے؟ یہ اپنے آپ کو انسانِ اعلیٰ کہتے ہیں۔ بلکہ درحقیقت صرف اپنے ہی کو انسان سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک کمزور قوموں کے لوگ یا تو انسان ہی نہیں ہیں یا اگر انسان ہیں تو ادنیٰ درجہ کے ہیں۔ یہ ہر حیثیت سے اپنے آپ کو دوسروں سے اونچا ہی رکھتے ہیں اور اپنی اغراض پر دوسروں کے مفاد کو قربان کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ ان کے زور و اثر سے جتنے قوانین اور ضوابط دنیا میں بنے ہیں ان سب میں یہ رنگ موجود ہے۔

یہ چند مثالیں میں نے محض اشارے کے طور پر دی ہیں، تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ میں صرف یہ بات آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں جہاں بھی انسان نے قانون بنایا ہے۔ وہاں بے انصافی ضرور ہوئی ہے۔ کچھ انسانوں کو ان کے جائز حقوق سے بہت زیادہ دیا گیا ہے اور کچھ انسانوں کے حقوق نہ صرف پامال کئے گئے ہیں بلکہ انھیں انسانیت کے درجہ سے گرا دینے میں بھی تامل نہیں کیا گیا۔ اس کی وجہ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ جب کسی معاملہ کا فیصلہ کرنے بیٹھتا ہے تو اس کے دل و دماغ پر اپنی ذات، یا اپنے خاندان، یا اپنی نسل، یا اپنے طبقے، یا اپنی قوم ہی کے مفاد کا خیال مسلّط رہتا ہے۔ دوسروں کے حقوق اور مفاد کیلئے اس کے پاس وہ ہمدردی کی نظر نہیں ہوتی جو اپنوں کے لئے ہوتی ہے۔

مجھے بتائیے، کیا اس بے انصافی کا کوئی علاج اس کے سوا ممکن ہے کہ تمام انسانی قوانین کو دریا بُرد کر دیا جائے، اور اُس خدا کے قانون کو ہم سب تسلیم کر لیں جس کی نگاہ میں ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان کوئی فرق نہیں، فرق اگر ہے تو صرف اُس کے اخلاق، اس کے اعمال، اور اس کے اوصاف (میرٹس Merits) کے لحاظ سے ہے۔ نہ کہ نسل یا طبقہ یا قومیت کے لحاظ سے۔

امن کس طرح قائم ہو سکتا ہے

صاحبو! اس معاملہ میں ایک اور پہلو بھی ہے جسے میں نظر انداز نہیں کر سکتا، آپ جانتے ہیں کہ آدمی کو قابو میں رکھنے والی چیز صرف ذمہ داری کا احساس ہی ہے

اگر کسی شخص کو یہ یقین ہو جائے کہ وہ جو چاہے کرے، کوئی اس سے جواب طلب کرنے والا نہیں ہے اور نہ اس کے اوپر ایسی طاقت ہے جو اسے سزا دے سکے، تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ شتر بے مہار بن جائیگا۔ یہ بات جس طرح ایک شخص کے معاملہ میں صحیح ہے، اسی طرح ایک خاندان، ایک طبقہ، ایک قوم اور تمام دنیا کے انسانوں کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔ ایک خاندان جب یہ محسوس کرتا ہے کہ اس سے کوئی جواب طلب نہیں کر سکتا تو وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے۔ ایک طبقہ بھی جب ذمہ داری اور جواب دہی سے بے خوف ہو جاتا ہے، تو دوسروں پر ظلم ڈھانے میں اُسے کوئی تامل نہیں ہوتا۔ ایک قوم یا ایک سلطنت بھی جب اپنے آپ کو اتنا طاقتور پاتی ہے کہ اپنی زیادتی کے کسی بُرے نتیجہ کا خوف اُسے نہیں ہوتا، تو وہ جنگل کے بھیڑیئے کی طرح کمزور بکریوں کو پھاڑنا شروع کر دیتی ہے۔ دنیا میں جتنی بدامنی پائی جاتی ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے۔ جب تک انسان اپنے سے بالاتر کسی اقتدار کو تسلیم نہ کرے، اور جب تک اسے یقین نہ ہو کہ مجھ سے اوپر کوئی ایسا ہے جس کو مجھے اپنے اعمال کا جواب دینا ہے اور جس کے ہاتھ میں اتنی طاقت ہے کہ مجھے سزا دے سکتا ہے، اس وقت تک یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ظلم کا دروازہ بند ہو، اور صحیح امن قائم ہو سکے۔

اب مجھے بتائیے کہ ایسی طاقت سوائے خداوند عالم کے اور کونسی ہو سکتی ہے؟ خود انسانوں میں سے تو کوئی ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جس انسان، یا جس

انسانی گروہ کو بھی آپ یہ حیثیت دیدیجئے خود اس کے شتر بے مہار ہو جانے کا امکان ہے۔ خود اس سے اندیشہ ہے کہ تمام فرعونوں کا ایک فرعون وہ ہو جائیگا اور خود اس سے یہ خطرہ ہے کہ خود غرضی اور جانبداری سے کام لے کر وہ بعض انسانوں کو گرائے گا اور بعض کو اٹھائے گا۔ یورپ نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے مجلس اقوام بنائی تھی۔ مگر بہت جلدی وہ سفید رنگ والی قوموں کی مجلس بن کر رہ گئی۔ اور اس نے چند طاقتور سلطنتوں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر کمزور قوموں کے ساتھ بے انصافی شروع کردی۔ اس تجربہ کے بعد اس امر میں کوئی شک باقی نہیں رہ سکتا کہ خود انسانوں کے اندر سے کوئی ایسی طاقت برآمد ہونی ناممکن ہے جس کی باز پرس کا خوف فرداً فرداً ایک ایک شخص سے لے کر دنیا کی قوموں اور سلطنتوں کو قابو میں رکھ سکتا ہو۔ ایسی طاقت لامحالہ انسانی دائرہ سے باہر اور اس سے اوپر ہی ہونی چاہیئے۔ اور وہ صرف خداوند عالم ہی کی طاقت ہو سکتی ہے۔ ہم اگر اپنی بھلائی چاہتے ہیں تو ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ خدا پر ایمان لائیں، اس کی حکومت کے آگے اپنے آپ کو فرماں بردار رعیت کی طرح سپرد کردیں، اور اس یقین کے ساتھ دنیا میں زندگی بسر کریں کہ وہ بادشاہ ہمارے چھپے اور کھلے سب کاموں کو جانتا ہے اور ایک دن ہمیں اس کی عدالت میں اپنی پوری زندگی کے کارنامے کا حساب دینا ہے۔ ہمارے شریف اور پُرامن انسان بننے کی بس یہی ایک صورت ہے۔

ایک شبہ

اب میں اپنے خطبہ کو ختم کرنے سے پہلے ایک شبہ کو صاف کر دینا ضروری سمجھتا ہوں جو غالباً آپ میں سے ہر ایک کے دل میں پیدا ہو رہا ہوگا۔ آپ سوچ رہے ہونگے کہ جب خدا کی حکومت اتنی زبردست ہے کہ خاک کے ایک ذرہ سے لے کر چاند اور سورج تک ہر چیز اس کے قابو میں ہے، اور جب انسان اس کی حکومت میں محض ایک رعیت کی حیثیت رکھتا ہے، تو آخر یہ ممکن کس طرح ہؤا کہ انسان اس کی حکومت کے خلاف بغاوت کرے اور خود اپنی بادشاہی کا اعلان کر کے اس کی رعیت پر اپنا قانون چلائے؟ کیوں نہیں خدا اس کا ہاتھ پکڑ لیتا اور کیوں اسے سزا نہیں دیتا؟ اس سوال کا جواب میں چند مختصر الفاظ میں دوں گا۔

اصل یہ ہے کہ خدا کی حکومت میں انسان کی حیثیت قریب قریب ایسی ہے جیسے ایک بادشاہ کسی شخص کو اپنے ملک کے کسی ضلع کا افسر بنا کر بھیجتا ہے۔ ایک بادشاہ ہی کا ہوتا ہے، رعیت بھی اسی کی ہوتی ہے، ریل، ٹیلیفون، تار، فوج اور دوسری تمام طاقتیں بادشاہ ہی کے ہاتھ میں رہتی ہیں۔ اور بادشاہ کی سلطنت اس ضلع پر چاروں طرف سے اس طرح چھائی ہوئی ہوتی ہے کہ اس چھوٹے سے ضلع کا افسر اس کے مقابلہ میں بالکل عاجز ہوتا ہے۔ اگر بادشاہ چاہے تو اس کو پوری طرح مجبور کر سکتا ہے کہ اس کے حکم سے بال برابر منہ نہ

موڑ سکے لیکن بادشاہ اس افسر کی عقل کا، اس کے ظرف کا اور اس کی لیاقت کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ اس لیئے وہ اس پر سے اپنی گرفت اتنی ڈھیلی کر دیتا ہے کہ اسے اپنے اوپر کوئی بالاتر اقتدار محسوس نہیں ہوتا۔ اب اگر وہ افسر عقل مند، نمک حلال، فرض شناس اور وفادار ہے، تو اس ڈھیلی گرفت کے باوجود اپنے آپ کو رعیت اور ملازم ہی سمجھتا رہتا ہے۔ بادشاہ کے ملک میں اسی کے قانون کے مطابق حکومت کرتا ہے اور جو اختیارات بادشاہ نے اسے دیئے ہیں، انھیں خود بادشاہ کی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے۔ اس وفادارانہ طرز عمل سے اس کی اہلیت ثابت ہو جاتی ہے، اور بادشاہ اسے زیادہ بلند مرتبوں کے قابل پاکر ترقیوں پر ترقیاں دیتا چلا جاتا ہے لیکن اگر وہ افسر بے وقوف، نمک حرام اور شریر ہو اور رعیت کے وہ لوگ جو اس ضلع میں رہتے ہیں، جاہل اور نادان ہوں، تو اپنے اوپر سلطنت کی گرفت ڈھیلی پاکر وہ بغاوت پر آمادہ ہو جاتا ہے، اس کے دماغ میں خود مختاری کی ہوا بھر جاتی ہے، اور وہ خود اپنے آپ کو ضلع کا مالک سمجھ کر خود سرانہ حکومت کرنے لگتا ہے۔ اور جاہل رعیت کے لوگ محض یہ دیکھ کر اس کی خود مختارانہ حکومت تسلیم کر لیتے ہیں کہ تنخواہ یہ دیتا ہے، پولیس اس کے پاس ہے، عدالتیں اس کے ہاتھ میں ہیں، جیل کی ہتھکڑیاں اور پھانسی کے تختے اس کے قبضے میں ہیں، اور ہماری قسمت کو بنانے، یا بگاڑنے کے اختیارات یہ رکھتا ہے۔ بادشاہ اس اندھی رعیت اور اس باغی افسر دونوں کے طرز عمل کو دیکھتا رہتا ہے

ہے، چاہے تو فوراً پکڑ لے اور ایسی سزا دے کہ ہوش ٹھکانے نہ رہیں مگر وہ ان دونو
کی پوری آزمائش کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ نہایت تحمل اور بردباری کے ساتھ
انھیں ڈھیل دیتا چلا جاتا ہے تاکہ جتنی نالائقیاں ان کے اندر بھری ہوئی ہیں،
پوری طرح ظاہر ہو جائیں۔ اس کی طاقت اتنی زبردست ہے کہ اسے اس بات
کا کوئی خوف ہی نہیں ہے کہ یہ افسر کبھی زور پکڑ کر اس کا تخت چھین لے گا۔ اسے
اس بات کا بھی کوئی اندیشہ نہیں کہ یہ باغی اور نمک حرام لوگ اس کی گرفت سے نکل کر
کہیں بھاگ جائیں گے اس لئے اسے جلد بازی کے ساتھ فیصلہ کر دینے کی
کوئی ضرورت نہیں وہ سالہا سال بلکہ صدیوں تک ڈھیل دیتا رہتا ہے،
یہاں تک کہ جب یہ لوگ اپنی پوری خباثت کا اظہار کر چکتے ہیں، اور کوئی
کسر اس کے اظہار میں باقی نہیں رہتی، تب وہ ایک روز اپنا عذاب ان پر بھیجتا ہے
اور وہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ کوئی تدبیر اس وقت انھیں ان کے عذاب سے نہیں بچا سکتی۔

صاحبو! میں اور آپ اور خدا کے بنائے ہوئے یہ افسر، سب کے سب اسی
آزمائش میں مبتلا ہیں۔ ہماری عقل کا، ہمارے ظرف کا، ہماری فرض شناسی کا،
ہماری وفاداری کا سخت امتحان ہو رہا ہے۔ اب ہم میں سے ہر شخص کو خود
فیصلہ کرنا چاہیئے کہ وہ اپنے اصلی بادشاہ کا نمک حلال افسر یا رعیت بننا پسند
کرتا ہے، یا نمک حرام۔ میں نے اپنی جگہ نمک حلالی کا فیصلہ کیا ہے۔ اور میں ہر اس شخص سے
باغی ہوں جو خدا سے باغی ہے۔ آپ اپنے فیصلہ میں مختار ہیں چاہے یہ راستہ اختیار کریں
یا وہ۔ ایک طرف وہ نقصانات، اور وہ فائدے ہیں جو خدا کے یہ باغی ملازم پہنچا سکتے
ہیں، اور دوسری طرف وہ نقصانات اور وہ فائدے ہیں جو خود خدا پہنچا سکتا ہے۔ دونو
میں سے جس کو آپ انتخاب کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔

دینِ حق

از

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

شائع کردہ

مکتبہ جماعت اسلامی لاہور۔

(پاکستان)

قیمت ۶ آنے

سید ابوالاعلیٰ مودودی طابع و ناشر نے
کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور
میں چھپوا کر مکتبہ جماعت اسلامی لاہور
پاکستان سے شائع کیا

تعداد اشاعت — بار چہارم — ۲۰۰۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دینِ حق

(یہ خطبہ ۲۱- مارچ ۱۹۴۳ء کو جامعہ ملیہ دہلی میں دیا گیا تھا)

قرآن جس دعوے کے ساتھ نوع انسانی کو اپنے پیش کردہ مسلک کی طرف دعوت دیتا ہے وہ خود اس کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:-

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ

یہی ذرا سا فقرہ میری اس تقریر کا موضوع ہے۔ زیادہ تفصیل کا موقع نہیں۔ بہت اختصار کے ساتھ میں پہلے اس کے معنی کی تشریح کروں گا جس سے واضح ہو جائے گا کہ اس فقرہ میں دراصل کس چیز کا دعویٰ کیا گیا ہے، پھر اس سوال پر بحث کروں گا کہ یہ دعویٰ تسلیم کیا جانا چاہئے یا نہیں۔ اور آخر میں یہ بیان کروں گا کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس تسلیم کر لینے کے مقتضیات کیا ہیں۔

عموماً اس فقرہ کا جو سیدھا سادہ مفہوم بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ "سچا مذہب تو اللہ کے نزدیک بس اسلام ہی ہے" اور "اسلام" کا جو تصور عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ ایک مذہب کا نام ہے جو اب سے تیرہ سو برس پہلے عرب میں پیدا ہوا تھا اور جس کی بنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈالی تھی --- "بنا ڈالی تھی" کا لفظ میں قصداً اس لئے استعمال

کر رہا ہوں کہ صرف غیر مسلم ہی نہیں بلکہ بکثرت مسلمان اور اچھے خاصے ذی علم مسلمان بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "بانیٔ اسلام" کہتے اور لکھتے ہیں، گویا ان کے نزدیک اسلام کی ابتداء آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم ہی سے ہوئی ہے اور آپ ہی اس کے بانی د ہیں۔ لہٰذا جب ایک غیر مسلم قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے اس فقرے پر پہنچتا ہے تو وہ یہ گمان کر کے سرسری طور پر اس سے گذر جاتا ہے کہ جس طرح ہر مذہب صرف اپنے ہی برحق ہونے اور دوسرے مذہبوں کے باطل ہونے کا مدعی ہے اسی طرح قرآن نے بھی اپنے پیش کردہ مذہب کے برحق ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے اور جب ایک مسلمان اسے پڑھتا ہے تو وہ اس وجہ سے اس پر غور کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھتا کہ جس مذہب کو اس فقرے میں برحق کہا گیا ہے اُسے وہ خود بھی برحق مانتا ہے، یا اگر غور و فکر کے لئے اس کے ذہن میں کوئی تحریک پیدا ہوتی بھی ہے تو وہ بالعموم یہ رُخ اختیار کر لیتی ہے کہ عیسائیت، ہندو مت، بودھ مت اور ایسے ہی دوسرے مذاہب سے اسلام کا مقابلہ کر کے اس کی حقانیت ثابت کی جائے۔ لیکن درحقیقت قرآن میں یہ مقام ایسا ہے جس پر ایک سنجیدہ طالب علم کو ٹھیر کر بہت غور کرنا چاہیے، اُس سے زیادہ غور کرنا چاہیئے جتنا اب تک اس پر کیا گیا ہے۔

قرآن کے اس دعوے کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں "الدِّین" اور "الاسلام" کا مفہوم متعین کر لینا چاہیئے۔

الدین کا مفہوم

عربی زبان میں لفظ "دین" کئی معنوں میں آتا ہے۔ اس کے ایک معنی غلبہ اور اقتدار کے ہیں۔ دوسرے معنی اطاعت و غلامی کے تیسرے معنی جزا اور بدلہ کے۔ چوتھے معنی طریقہ اور مسلک کے، یہاں یہ لفظ اسی چوتھے

معنی میں استعمال ہُوا ہے، یعنی دین سے مراد وہ طریقِ زندگی یا طرزِ فکر و عمل ہے کہ جس کی پیروی کی جائے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ قرآن محض دین نہیں کہہ رہا ہے بلکہ اَلدِّین کہہ رہا ہے۔ اس سے معنی میں وہی فرق واقع ہو جاتا ہے جو انگریزی زبان میں (This is a way) کہنے کے بجائے (This is the way) کہنے سے واقع ہوتا ہے یعنی قرآن کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام ایک طریقِ زندگی ہے، بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام ہی ایک حقیقی اور صحیح طریقِ زندگی یا طرزِ فکر و عمل ہے۔

پھر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ قرآن اس لفظ کو کسی محدود معنی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ وسیع ترین معنی میں استعمال کرتا ہے۔ طریقِ زندگی سے اس کی مراد زندگی کے کسی خاص پہلو یا کسی خاص شعبہ کا طریق نہیں بلکہ پوری زندگی کا طریق ہے۔ الگ الگ ایک ایک شخص کی انفرادی زندگی ہی کا طریق نہیں بلکہ بحیثیت مجموعی سوسائٹی کا طریق بھی ہے۔ ایک خاص ملک، یا ایک خاص قوم یا ایک خاص زمانہ کی زندگی کا طریق نہیں بلکہ تمام زمانوں میں تمام انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا طریق ہے۔ لہٰذا قرآن کے دعوے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اللہ کے نزدیک پوجا پاٹ اور عالمِ بالا کے اعتقاد اور حیات بعد الممات کے تصور کا ایک صحیح مجموعہ وہی ہے جس کا نام اسلام ہے، نہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ افرادِ انسانی کے مذہبی طرزِ خیال و عمل (جیسا کہ لفظ "مذہبی" کا مفہوم آجکل کی مغربی اصطلاح میں لیا جاتا ہے) کی ایک صحیح صورت وہی ہے جسے اسلام سے تعبیر کیا گیا ہے، نہ اس کا مفہوم یہ ہے

کہ عرب کے لوگوں، یا فلاں صدی تک کے انسانوں، یا فلاں دور مثلاً صنعتی انقلاب سے پہلے تک کے آدمیوں کے لئے ایک صحیح نظام زندگی وہی ہے جس کو اسلام سے موسوم کیا گیا ہے، بلکہ صریح طور پر اس کا دعویٰ یہ ہے کہ "ہر زمانہ اور ہر دور میں پوری نوع انسانی کے لئے زمین پر زندگی بسر کرنے کا ایک ہی ڈھنگ اللہ کے نزدیک صحیح ہے، اور وہ ڈھنگ وہی ہے جس کا نام الاسلام ہے۔"

مجھے یہ سُن کر بڑا تعجب ہُوا کہ ایشیا اور یورپ کے درمیان کسی مقام پر قرآن کی کوئی نئی تفسیر کی گئی ہے جس کی رو سے "دین" کا مفہوم صرف بندے اور خدا کے انفرادی تعلق تک محدود ہے اور تمدن و ریاست کے نظام سے اس کا کوئی علاقہ نہیں ہے[1]۔ یہ تفسیر اگر خود قرآن سے اخذ کی گئی ہے تو یقیناً بڑی دلچسپ چیز ہوگی، لیکن میں نے اٹھارہ سال تک قرآن کا جو تحقیقی مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں بلاخوف۔ تردید کہتا ہوں کہ قرآن اپنے تمام جدید مفسرین کی خواہشات کے علی الرغم "الدّین" کے لفظ کو کسی محدود معنی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ اس سے تمام زمانوں کے تمام انسانوں کے لئے ان کی پوری زندگی کا نظام فکر و عمل مراد لیتا ہے۔

الاسلام کا مفہوم

اب لفظ "اسلام" کو لیجئے، عربی زبان میں اس کے معنی ہیں سپرد ڈال دینا، جُھک جانا، اطاعت قبول کر لینا، اپنے آپ کو سپرد کر دینا۔ مگر قرآن محض "اسلام" نہیں بولتا بلکہ "الاسلام" بولتا ہے جو اس کی خاص اصطلاح ہے۔ اس مخصوص اصطلاحی لفظ سے اس کی مراد خدا کے آگے

[1] اشارہ ہے ترکی اخبار نویسوں کے اُس وفد کی طرف جو ۱۹۴۳ء میں ہندوستان آیا تھا اور جس کے صدر وفد نے یہاں ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔

جھک جانا، اس کی اطاعت قبول کر لینا، اس کے مقابلہ میں اپنی آزادی سے دست بردار ہو جانا، اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینا ہے۔ اس تسلیم و اطاعت اور سپردگی و حوالگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قانون طبیعت (Law of Nature) کے آگے سپر ڈال دی جائے، جیسا کہ بعض لوگوں نے اس کا مفہوم قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ نہ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے تخیل یا اپنے مشاہدات و تجربات سے خدا کی مرضی اور اس کے منشاء کا جو تصور بطور خود اخذ کر لے اسی کی اطاعت کرنے لگے، جیسا کہ کچھ اور لوگوں نے غلطی سے سمجھ لیا ہے۔ بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے خود اپنے رسولوں کے ذریعہ سے انسان کے لئے جس طریق فکر و عمل کی طرف رہنمائی کی ہے اس کو وہ قبول کر لے اور اپنی آزادی فکر و عمل ـــــــ یا بالفاظ صحیح تر، آوارگی فکر و عمل ـــــــ چھوڑ کر اس کی پیروی و اطاعت اختیار کر لے۔ اسی چیز کو قرآن "الاسلام" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔ اور یہ درحقیقت کوئی جدید العہد مذہب نہیں ہے جس کی بنا اب سے ۱۳۶۲ برس پہلے عرب میں محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے ڈالی ہو، بلکہ جس روز پہلی مرتبہ اس کرۂ زمین پر انسان کا ظہور ہوا اسی روز خدا نے انسان کو بتا دیا تھا کہ تیرے لئے صرف یہ "الاسلام" ہی ایک صحیح طرز عمل ہے، اور اس کے بعد دنیا کے مختلف گوشوں میں وقتاً فوقتاً جو پیغمبر بھی خدا کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لئے مامور ہوئے ہیں ان سب کی دعوت بھی بلا استثناء اسی "الاسلام" کی طرف رہی ہے جس کی طرف بالآخر محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو دعوت دی۔ یہ اور بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے پیروؤں نے بعد میں بہت سی مختلف چیزوں کی آمیزش کر کے

ایک نظام یہودیت کے نام سے۔ اور مسیح علیہ السلام کے پیروؤں نے ایک دوسرا نظام مسیحیت کے نام سے، اور اسی طرح ہندوستان، ایران، چین، اور دوسرے ممالک کے پیغمبروں کی امتوں نے مختلف مخلوط و مرکب نظامات دوسرے ناموں سے بنا لئے ہوں، لیکن موسیٰ اور مسیح اور دوسرے تمام معروف و غیر معروف انبیاء علیہم السلام جس دین کی دعوت دینے آئے تھے وہ خالص اسلام تھا نہ کچھ اور۔

قرآن کا دعویٰ کیا ہے

اس تشریح کے بعد قرآن کا دعویٰ بالکل صاف اور واضح صورت میں ہمارے سامنے آجاتا ہے، اور وہ یہ ہے:-

"نوعِ انسان کے لئے خدا کے نزدیک صرف یہی ایک صحیح طریقِ زندگی ہے کہ وہ خدا کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے اور فکر و عمل کی اُس راہ پر چلے جس کی طرف خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے رہنمائی کی ہے۔"

یہ ہے قرآن کا دعویٰ۔ اب ہمیں یہ تحقیق کرنا ہے کہ آیا یہ دعویٰ قبول کیا جانا چاہئے۔ خود قرآن نے اپنے اس دعوے کی تائید میں جو دلائل قائم کئے ہیں، اُن پر تو ہم غور کریں گے ہی۔ مگر کیوں نہ اس سے پہلے خود اپنی جگہ تلاش و تجسس کر کے یہ دریافت کر لیں کہ آیا ہمارے لئے اس دعویٰ کو قبول کرنے کے سوا کوئی اور چارۂ کار بھی ہے۔

"طریقِ زندگی" کی ضرورت

یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں انسان کو زندگی بسر کرنے کے لئے بہر حال ایک طریقِ زندگی درکار ہے جسے وہ اختیار کرے۔ انسان دریا نہیں ہے جس کا راستہ زمین کے نشیب و فراز

سے خود معین ہو جاتا ہے۔ انسان درخت نہیں ہے جس کے لئے قوائین فطرت ایک راہ طے کر دیتے ہیں۔ انسان نرا جانور نہیں ہے جس کی رہنمائی کے لئے تنہا جبلت ہی کافی ہو جاتی ہے۔ اپنی زندگی کے ایک بڑے حصے میں قوانین طبیعت کا محکوم ہونے کے باوجود انسان زندگی کے بہت سے ایسے پہلو رکھتا ہے جن میں اسے کوئی لگا بندھا راستہ نہیں ملتا کہ حیوانات کی طرح بے اختیار اس پر چلتا رہے۔ بلکہ اس کو اپنے انتخاب سے خود ایک راہ اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اس کو فکر کی ایک راہ چاہیئے جس پر وہ اپنے اور کائنات کے ان بہت سے مسائل کو حل کرے جنہیں فطرت اس کے سوچنے والے دماغ کے سامنے پیش کرتی ہے مگر ان کا کوئی حل غیر مشتبہ زبان میں نہیں بتاتی۔ اس کو علم کی ایک راہ چاہیئے جس پر وہ اُن معلومات کو منظم کرے جنہیں فطرت اس کے حواس کے ذریعہ سے اس کے ذہن تک پہنچاتی ہے۔ مگر انہیں بطور خود منظم کر کے اس کے حوالے نہیں کر دیتی۔ اس کو شخصی برتاؤ کے لئے ایک راہ چاہیئے جس پر وہ اپنی ذات کے بہت سے اُن مطالبات کو پورا کرے جن کے لئے فطرت تقاضا تو کرتی ہے مگر انہیں پورا کرنے کا کوئی مہذب طریقہ معین کر کے نہیں دے دیتی۔ اس کو گھریلو زندگی کے لئے خاندانی تعلقات کے لئے، معاشی معاملات کے لئے، ملکی انتظام کے لئے، بین الاقوامی ربط و تعلق کے لئے اور زندگی کے بہت سے دوسرے پہلوؤں کے لئے بھی ایک راہ درکار ہے جس پر وہ محض ایک شخص کی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ایک جماعت، ایک قوم، ایک نوع کی حیثیت سے بھی چلے اور اُن مقاصد تک پہنچ سکے جو اگرچہ فطرۃً اس کے

مقصود و مطلوب ہیں مگر فطرت نے نہ تو ان مقاصد کو صریح طور پر اس کے سامنے نمایاں کیا ہے اور نہ ان تک پہنچنے کا ایک راستہ معین کر دیا ہے۔

زندگی کا انقسام پذیر نہ ہونا

زندگی کے یہ مختلف پہلو جن میں کوئی ایک طریق اختیار کرنا انسان کے لئے ناگزیر ہے، بجائے خود مستقل اور ایک دوسرے سے بے نیاز شعبے یا محکمے نہیں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے لئے آدمی الگ الگ راہیں اختیار کر سکتا ہو جن کی سمتیں الگ ہوں، جن کے زادِ راہ الگ ہوں، جن پر چلنے کے ڈھنگ اور انداز الگ ہوں، جن کی راہ نوردی کے مقتضیات الگ ہوں اور جن کی منازل مقصود الگ ہوں۔ انسان اور اس کی زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی ایک ذراسی دانشمندانہ کوشش ہی آدمی کو اس پر مطمئن کرنے کے لئے کافی ہے کہ زندگی بحیثیت مجموعی ایک کلُ ہے جس کا ہر جزء دوسرے جزء سے اور ہر پہلو دوسرے پہلو سے گہرا ربط رکھتا ہے، ایسا ربط رکھتا ہے جو توڑا نہیں جا سکتا، ہر ایک دوسرے پر اثر ڈالتا ہے اور اس سے اثر قبول کرتا ہے، ایک ہی خون سب کی رگوں میں گردش کرتا ہے، ایک ہی روح سب میں سرایت کئے ہوئے ہوتی ہے اور سب مل کر وہ چیز بناتے ہیں جسے انسانی زندگی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا فی الواقع جو چیز انسان کو درکار ہے وہ زندگی کے مقاصد نہیں بلکہ مقصد ہے۔ جس کے ضمن میں سارے چھوٹے بڑے مقاصد پوری موافقت کے ساتھ اپنی اپنی جگہ رہ سکیں اور جس کے حصول کی کوشش میں وہ سب حاصل

ہو جائیں۔ اس کو راستے نہیں بلکہ راستہ درکار ہے جس پر وہ اپنی پوری زندگی کو اُس کے تمام پہلوؤں سمیت کامل ہم آہنگی کے ساتھ اپنے مقصود حیات کی طرف لے چلے۔ اُس کو فکر، علم، ادب، آرٹ، تعلیم، مذہب، اخلاق معاشرت، معیشت، سیاست، قانون وغیرہ کے لئے الگ الگ نظامات نہیں بلکہ ایک جامع نظام درکار ہے جس میں یہ سب ہمواری کے ساتھ سموئے جا سکیں، جس میں ان سب کے لئے ایک ہی مزاج اور ایک ہی طبیعت رکھنے والے مناسب اصول موجود ہوں، اور جس کی پیروی کر کے آدمی اور آدمیوں کا مجموعہ، اور من حیث الکل پوری آدمیت اپنے بلند ترین مقصود تک پہنچ سکے۔ وہ جاہلیت کا تاریک دَور تھا جب زندگی کو مستقل جداگانہ شعبوں میں تقسیم کرنا ممکن خیال کیا جاتا تھا۔ اب اگر کچھ لوگ اس طرزِ خیال کی مہمل گفتگو کرنے والے موجود ہیں تو وہ بیچارے یا تو اخلاص کے ساتھ پُرانے خیالات کی فضا میں اب تک سانس لے رہے ہیں اس لئے قابلِ رحم ہیں، یا پھر وہ ظالم حقیقت کو خوب جانتے ہیں مگر جان بوجھ کر یہ گفتگو صرف اس لئے کر رہے ہیں کہ جس "دین" کو وہ کسی انسانی آبادی میں رائج کرنا چاہتے ہیں[1] اس کے اصولوں سے اختلاف رکھنے والوں کو انہیں یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہے کہ ہمارے اس دین کے تحت تمہیں زندگی کے فلاں فلاں شعبوں میں،

[1] یعنی دینِ قومیت جس میں خدا اور کتاب اور رسالت سے بے تعلق ہو کر خالص دنیوی مادی بنیادوں پر ایک مملکت کے باشندوں کے لئے ایک نظامِ زندگی بنایا جائے۔

جو بد قسمتی سے تم کو عزیز تر ہیں، پورا تحفظ حاصل رہے گا؛ حالانکہ یہ تحفظ عقلاً محال، فطرۃً ممتنع، عملاً ناممکن ہے اور اس طرح کی گفتگو کرنے والے غالباً خود بھی جانتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے۔ ہر دین غالب زندگی کے تمام شعبوں کو اپنی روح اور اپنے مزاج کے مطابق ڈھال کر ہی رہتا ہے جس طرح ہر کانِ نمک ان تمام چیزوں کو مبدّل بہ نمک کر کے ہی رہتی ہے جو اس کے حدود میں داخل ہو جائیں۔

زندگی کی جغرافی و نسلی تقسیم

پھر جس طرح یہ بات مہمل ہے کہ انسانی زندگی کو جداگانہ شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ مہمل بات یہ ہے کہ اسے جغرافی حلقوں یا نسلی دائروں میں تقسیم کیا جائے۔ انسان بلاشبہ زمین کے بہت سے حصوں میں پایا جاتا ہے جن کو دریاؤں نے، پہاڑوں نے، جنگلوں اور سمندروں نے یا مصنوعی سرحدوں نے تقسیم کر رکھا ہے، اور انسان کی بہت سی مختلف نسلیں اور قومیں بھی ضرور پائی جاتی ہیں جن کے درمیان تاریخی، نفسیاتی اور دوسرے اسباب سے انسانیت کے نشو و ارتقاء نے مختلف صورتیں اختیار کی ہیں، لیکن اس اختلاف کو حجت قرار دے کر جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہر نسل، ہر قوم، اور ہر جغرافی آبادی کے لئے "دین" یعنی نظام زندگی الگ ہونا چاہئے وہ سراسر ایک مہمل بات کہتا ہے۔ اس کی محدود نگاہ مظاہر اور عوارض کے اختلافات میں الجھ کر رہ گئی، اس ظاہری کثرت کے اندر جوہر انسانیت کی

ؔ اس مسئلے پر مفصل بحث کے لئے "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ اول و دوم کا مطالعہ مفید ہوگا خصوصاً حصہ دوم میں بنیادی حقوق کی بحث۔

وحدت کو وہ نہیں پا سکا۔ اگر فی الواقع یہ اختلافات اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کی بنا پر دین الگ الگ ہونے چاہئیں تو میں کہوں گا کہ زیادہ سے زیادہ جو اختلافات ایک ملک اور دوسرے ملک، ایک نسل اور دوسری نسل کے درمیان آپ پاتے ہیں اُن سب کو جس قدر مبالغہ کے ساتھ چاہیں قلمبند کر لیں، اور پھر اُن اختلافات کا خالص علمی جائزہ لیں، جو عورت اور مرد میں پائے جاتے ہیں، جو ہر انسان اور دوسرے انسان میں پائے جاتے ہیں، جو ایک ہی ماں اور باپ کے دو بچوں میں پائے جاتے ہیں شاید میں مبالغہ نہ کروں گا۔ اگر یہ دعویٰ کروں کہ علمی تحلیل و تجزیہ میں پہلی قسم کے اختلافات سے یہ دوسری قسم کے اختلافات بہر حال شدید تر ہی نکلیں گے پھر کیوں نہ کہہ دیجئے کہ ہر فرد کا نظام زندگی الگ ہونا چاہیئے؟ مگر جب آپ انفرادی، جنسی، خاندانی کثرتوں کے اندر وحدت کا ایک عنصر اور پائیدار عنصر ایسا پاتے ہیں جس کی بنیاد پر قوم، وطن یا نسل کا تصور قائم ہو سکتا ہے اور اس تصور کی بنا پر ایک قوم یا ایک ملک کی کثیر آبادی کے لئے ایک نظام زندگی ہونا ممکن خیال کیا جاتا ہے۔ تو آخر کس چیز نے آپ کو روک دیا ہے کہ قومی، نسلی، وطنی کثرتوں کے درمیان ایک بڑی اور بنیادی وحدت کا عنصر آپ نہیں پا سکتے جس پر انسانیت کا تصور قائم ہو اور جس کی بنا پر تمام عالم انسانی کا ایک دین یا نظام زندگی ہونا ممکن خیال کیا جائے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ تمام جغرافی، نسلی اور قومی اختلافات کے باوجود وہ قوانین طبعی یکساں ہیں جن کے تحت انسان دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے، وہ نظام جسمانی

یکساں ہے جس پر انسان کی تخلیق ہوئی ہے، وہ خصوصیات یکساں ہیں جن کی بنا پر انسان دوسری موجودات سے الگ ایک مستقل نوع قرار پاتا ہے، وہ فطری داعیات اور مطالبات یکساں ہیں جو انسان کے اندر ودیعت کئے گئے ہیں، وہ قوتیں یکساں ہیں جن کے مجموعہ کو ہم نفس انسانی کہتے ہیں اور بنیادی طور پر وہ تمام طبیعی، نفسیاتی، تاریخی، تمدنی، معاشی عوامل بھی یکساں ہیں جو انسانی زندگی میں کارفرما ہیں؟ اگر یہ واقعہ ہے —— اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ واقعہ نہیں ہے —— تو جو اصول انسان بحیثیت انسان کی فلاح کے لئے صحیح ہوں اُن کو عالمگیر ہونا چاہئے، اُن کے قومی، یا نسلی یا وطنی ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ قومیں اور نسلیں ان اصولوں کے تحت اپنی خصوصیات کا اظہار اور جزوی طور پر اپنے معاملات زندگی کا بندوبست مختلف طریقوں سے کر سکتی ہیں، اور اُن کو ایسا کرنا چاہئے، مگر انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے جس صحیح دین یا نظام زندگی کی ضرورت ہے وہ بہر حال ایک ہی ہونا چاہئے۔ عقل یہ باور کرنے سے انکار کرتی ہے کہ جو چیز ایک قوم کے لئے حق ہو وہ دوسری قوم کے لئے باطل ہو جائے اور جو ایک قوم کے لئے باطل ہو وہ دوسری قوم کے لئے حق ہو جائے۔

زندگی کی زمانی تقسیم

ان مہملات اور جدید زمانہ کے عالمانہ مہملات میں سے ایک اور بات جو حقیقت کے اعتبار سے مہمل ترین ہے، مگر حیرت ہے کہ تیقیت کے پورے وثوق کے ساتھ

پیش کی جاتی ہے، انسانی زندگی کی زمانی تقسیم ہے۔ یعنی کہا جاتا ہے کہ جو نظامِ زندگی ایک دَور میں حق ہوتا ہے وہ دوسرے دور میں باطل ہو جاتا ہے، کیونکہ زندگی کے مسائل و معاملات ہر دور میں بدل جاتے ہیں، اور نظامِ زندگی کا حق یا باطل ہونا سراسر اِن مسائل و معاملات ہی کی نوعیت پر منحصر ہے۔ یہ بات اسی انسانی زندگی کے متعلق کہی جاتی ہے جس کے متعلق ساتھ ہی ساتھ ارتقاء کی گفتگو بھی کی جاتی ہے، جس کی تاریخ میں کارفرما قوانین بھی تلاش کئے جاتے ہیں، جس کے گذشتہ تجربات سے حال کے لئے سبق اور مستقبل کے لئے احکام بھی مستنبط کئے جاتے ہیں، اور جس کے لئے "انسانی فطرت" نامی ایک چیز بھی ثابت کی جاتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کیا آپ کے پاس کوئی ایسا آلۂ پیمائش ہے جس سے آپ نوعِ انسانی کی اس مسلسل تاریخی حرکت کے درمیان دَور، یا زمانے یا عہد کی واقعی حد بندیاں کر سکتے ہوں؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ اِن حد بندیوں میں سے کسی ایک خط پر انگلی رکھ کر آپ کہہ سکتے ہوں کہ اس خط کے اُس پار جو مسائلِ زندگی تھے وہ اِس پار آکر بالکل تبدیل ہو گئے اور جو حالات اُس پار تھے وہ اِس پار باقی نہیں رہے؟ اگر فی الواقع انسانی سرگذشت ایسے ہی الگ الگ زمانی ٹکڑوں میں منقسم ہے تب تو یوں سمجھنا چاہئے کہ ایک ٹکڑا جو گذر چکا ہے وہ بعد والے ٹکڑے کے لئے محض ایک فضول و لایعنی چیز ہو گیا، اُس کے گذرتے ہی وہ سب کچھ ضائع ہو گیا جو انسان نے اُس حصۂ دہر میں کیا تھا، اُس زمانہ میں جو تجربات انسان کو ہوئے وہ

بعد والے زمانہ کے لئے کوئی سبق اپنے اندر نہیں رکھتے، کیونکہ وہ حالات و مسائل ہی فنا ہو گئے جن میں انسان نے بعض طریقوں کا، بعض اصولوں کا، بعض قدروں کے لئے سعی و جہد کا تجربہ کیا تھا۔ پھر یہ ارتقاء کی گفتگو کیوں؟ یہ قوانینِ حیات کی تلاش کس لئے؟ یہ تاریخی استنباط کس بنا پر؟ جب آپ ارتقاء کا نام لیتے ہیں تو لامحالہ یہ اس بات کو متضمن ہے کہ وہاں کوئی چیز ضرور ہے جو تمام تغیرات کا موضوع بنتی ہے، اور ان تغیرات کے اندر اپنے آپ کو باقی رکھتے ہوئے پیہم حرکت کرتی ہے۔ جب آپ قوانینِ حیات پر بحث کرتے ہیں تو یہ اس بات کو مستلزم ہے کہ ان ناپائیدار حالات میں، ان زوال و دوال مظاہر میں، ان بننے اور بگڑنے والی صورتوں میں کوئی پائیدار اور زندہ حقیقت بھی ہے جو اپنی ایک ذاتی فطرت اور اپنے کچھ مستقل قوانین بھی رکھتی ہے۔ جب آپ تاریخی استنباط کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تاریخ کے اس طول طویل رستے پر جو مسافر مختلف مرحلوں سے گذرتا ہوا آ رہا ہے، اور منزلوں پر منزلیں طے کرتا چلا جا رہا ہے۔ وہ خود اپنی کوئی شخصیت اور اپنا کوئی مستقل مزاج رکھتا ہے جس کے متعلق یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مخصوص حالات میں مخصوص طور پر کام کرتا ہے، ایک وقت میں بعض چیزوں کو قبول کرتا ہے اور دوسرے وقت میں انہیں رد کر دیتا ہے اور بعض دوسری چیزوں کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ زندہ حقیقت، یہ پائیدار موضوعِ تغیرات، یہ شاہ راہِ تاریخ کا مستقل مسافر ہی تو ہے

جیسے آپ غالباً "انسانیت" کہتے ہیں۔ مگر کیا بات ہے کہ جب آپ راستہ کی منزلوں اور اُن میں پیش آنے والے حالات اور اُن سے پیدا ہونے والے مسائل پر گفتگو شروع کرتے ہیں تو اس گفتگو میں ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ خود مسافر آپ کو یاد نہیں رہتا؟ کیا یہ سچ ہے کہ منزلیں اور اُن کے حالات اور اُن کے مسائل بدل جانے سے مسافر اور اس کی حقیقت بھی بدل جاتی ہے؟ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک اس کی ساخت بالکل نہیں بدلی، اس کے عناصر ترکیبی وہی ہیں جو اب سے ہزاروں برس پہلے تھے، اس کا مزاج وہی ہے، اس کی فطرت کے تقاضے وہی ہیں، اس کی صفات و خصوصیات وہی ہیں، اس کے رجحانات و میلانات وہی ہیں، اس کی قوتیں اور صلاحیتیں وہی ہیں، اس کی کمزوریاں اور قابلیتیں وہی ہیں، اس کے فعل و انفعال اور تاثیر و تاثر کے قاعدے وہی ہیں اس پر کارفرمائی کرنے والی قوتیں وہی ہیں، اور اس کا کائناتی ماحول بھی وہی ہے۔ ان میں سے کسی چیز میں بھی ابتدائے آفرینش سے آج تک ذرہ برابر فرق نہیں آیا ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ تاریخ کے دوران میں حالات اور اُن سے پیدا ہونے والے مسائل زندگی کے تغیر سے خود انسانیت بھی بدلتی چلی آئی ہے یا وہ بنیادی چیزیں بھی متغیر ہوتی رہی ہیں جو انسانیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ پھر جب حقیقت یہ ہے تو اس دعوے میں کیا وزن ہو سکتا ہے کہ انسان

کے لئے جو چیز کل تریاق تھی وہ آج زہر ہے، جو چیز کل حق تھی وہ آج باطل ہے، جو چیز کل قدر رکھتی تھی وہ آج بے قدر ہے۔

انسان کیسے طریق زندگی کا حاجت مند ہے؟

اصل یہ ہے کہ انسانی افراد اور جماعتوں نے تاریخ کے دوران میں نفس انسانیت کو اور اس سے تعلق رکھنے والی بنیادی چیزوں کو سمجھنے میں غلطی کھا کر اور بعض حقیقتوں کے اعتراف میں مبالغہ اور بعض کے ادراک میں قصور کر کے جو غلط نظام زندگی وقتاً فوقتاً اختیار کئے اور جنہیں انسانیت کبریٰ نے (Humanity at large) تجربہ کے بعد غلط پا کر دوسرے ایسے ہی نظامات کے لئے جگہ خالی کرنے پر مجبور کر دیا، اُن کی سرگذشت کے مشاہدے سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا گیا ہے کہ انسانیت کے لئے لازماً ہر دور میں ایک الگ نظام زندگی درکار ہے جو صرف اسی دور کے حالات و مسائل سے پیدا ہو اور انہی کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ حالانکہ زیادہ صحت کے ساتھ اس سرگذشت سے اگر کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اس قسم کے زمانی و دوری نظاماتِ زندگی، یا بالفاظ دیگر موسمی حشرات الارض کو بار بار آزمانے اور ہر ایک کی ناکامی کے بعد اس کے دوسرے جانشین کا تجربہ کرنے میں انسانیت کبریٰ کا وقت ضائع ہوتا ہے، اس کی راہ ماری جاتی ہے، اُس کے نشو و ارتقاد اور اپنے کمال مطلوب کی طرف

اُس کے سفر میں سخت رُکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ وہ درحقیقت محتاج اور سخت محتاج ہے ایسے نظامِ زندگی کی جو خود اس کو اور اس سے تعلق رکھنے والی تمام حقیقتوں کو جان کر عالمگیر، دائمی اور پائیدار اصولوں پر قائم کیا جائے، جیسے لے کر وہ حال و مستقبل کے تمام متغیر حالات سے بخیریت گذر سکے، ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کر سکے، زندگی کے راستے پر افتاں و خیزاں نہیں بلکہ رواں اور دواں اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھ سکے۔

کیا انسان ایسا نظام خود بنا سکتا ہے؟

یہ ہے اس "دین" یا طریقِ زندگی یا نظامِ زندگی کی نوعیت جس کا انسان حاجت مند ہے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ اگر انسان خدا کی مدد سے بے نیاز ہو کر خود اپنے لئے اس نوعیت کا ایک دین بنانا چاہے تو کیا وہ اس کوشش میں کامیاب ہو سکتا ہے؟ یہ سوال میں آپ کے سامنے پیش نہ کروں گا کہ آیا انسان اب تک ایسا دین خود بنانے میں کامیاب ہوا ہے؟ کیونکہ اس کا جواب تو قطعاً نفی میں ہے۔ خود وہ لوگ بھی، جو آج بڑے بڑے بلند بانگ دعووں کے ساتھ اپنے دین پیش کر رہے ہیں اور ان کے لئے ایک دوسرے سے لڑے مر رہے ہیں، یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کسی کا پیش کردہ دین ان ضرورتوں کو پورا کرتا ہے جن کے لئے انسان من حیث الانسان ایک

"الدین" کا محتاج ہے۔ کسی کا دین نسلی و قومی ہے، کسی کا جغرافی، کسی کا طبقاتی، اور کسی کا دین پیدا ہی اُس دَور کے تقاضوں سے ہُوا ہے جو ابھی کل ہی گذر چکا ہے، رہا وہ دَور جو کل آنے والا ہے اُس کے حالات و مسائل کے متعلق کچھ پیشگی نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں بھی وہ کام دے سکے گا یا نہیں، کیونکہ جو دَور اب گذر رہا ہے، ابھی تو اُسی کے تاریخی تقاضوں کا جائزہ لینا باقی ہے۔ اسی لئے میں یہ سوال یہ نہیں کر رہا ہوں کہ انسان ایسا دین بنانے میں کامیاب ہُوا ہے یا نہیں، بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ کامیاب ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟

یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس سے سرسری طور پر بحث کرنا مناسب نہیں۔ یہ انسانی زندگی کے فیصلہ کن سوالات میں سے ایک ہے۔ اس لئے پہلے خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ وہ چیز کیا ہے جسے وضع کرنے کا سوال درپیش ہے، اور اس شخص کی قابلیتیں کیا ہیں جس کے متعلق یہ پوچھا جا رہا ہے کہ وہ اس کو وضع کر سکتا ہے یا نہیں۔

الدّین کی نوعیّت

انسان کے لئے جس "الدین" کی ضرورت میں نے ابھی ثابت کی ہے اس سے مراد کوئی ایسا تفصیلی ضابطہ نہیں ہے جس میں ہر زمانے اور ہر قسم کے حالات کے لئے تمام چھوٹے بڑے جزئیات تک مرتب ہوں اور

جس کی موجودگی میں انسان کا کام صرف اس کے مطابق عمل کرنا ہو۔
بلکہ در اصل اس سے مراد ایسے ہمہ گیر ازلی و ابدی اصول ہیں جو
تمام حالات میں انسان کی رہنمائی کر سکیں، اس کی فکر و نظر، سعی و
جہد اور پیش قدمی کے لئے صحیح رُخ متعین کر سکیں اور اسے غلط
تجربات میں وقت اور محنت اور قوت ضائع کرنے سے بچا سکیں۔
اس غرض کے لئے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ انسان کو اس بات
کا علم ــــــ قیاس و گمان نہیں بلکہ علم ــــــ ہو کہ اس کی اور
کائنات کی حقیقت کیا ہے اور کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے۔
پھر وہ اس بات کے جاننے کا ــــــ سمجھ بیٹھنے کا نہیں بلکہ جاننے
کا ــــــ حاجت مند ہے کہ آیا زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے
یا یہ پوری زندگی کا ایک ابتدائی حصہ ہے، آیا سفر بس پیدائش سے
لے کر موت تک کی مسافت کا ہے یا یہ پورے سفر میں سے محض
ایک مرحلہ ہے۔ پھر اس کے لئے ناگزیر ہے کہ ایک ایسا مقصد زندگی
اس کے لئے متعین ہو جو حقیقت کے اعتبار سے ــــــ نہ کہ محض
خواہش کی بنا پر ــــــ واقعی حیاتِ انسانی کا مقصود ہو، جس
کے لئے در اصل انسان پیدا کیا گیا ہو، اور جس کے ساتھ ہر فرد،
ہر مجموعۂ افراد، اور بحیثیت کلی تمام انسانیت کے مقاصد تمام زمانوں
میں بلا کسی تصادم و مزاحمت کے ہم آہنگ ہو سکیں۔ پھر اس کو
اخلاق کے ایسے پختہ اور ہمہ گیر اصولوں کی ضرورت ہے جو اس

کی فطرت کی تمام خصوصیات کے ساتھ مناسبت بھی رکھتے ہوں اور تمام ممکن حالات پر نظری و عملی حیثیت سے منطبق بھی ہو سکتے ہوں تاکہ وہ انہی اصولوں کی بنیاد پر اپنی سیرت کی تعمیر کر سکے، انہی کی رہنمائی میں سفرِ زندگی کی ہر منزل اور اس کے حالات میں پیش آمدہ مسائل کو حل کر سکے، اور اس خطرے میں مبتلا نہ ہو کہ تغیر پذیر حالات و مسائل کے ساتھ ساتھ اخلاق کے اصول بناتا اور بدلتا چلا جائے، یعنی بالفاظِ دیگر ایک بے اصولا، نرا ابن الوقت (Characterless, mere opportunist) بن کر رہ جائے۔ پھر اس کو تمدن کے ایسے جامع اور وسیع اصولوں کی ضرورت ہے جو انسانی اجتماع کی حقیقت و غایت اور اس کے فطری تقاضوں کو سمجھ کر بنائے جائیں، جن میں افراط و تفریط اور بے اعتدالی نہ ہو، جن میں تمام انسانوں کی مجموعی مصلحت ملحوظ رکھی گئی ہو، اور جن کی پیروی کر کے ہر زمانے میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کی تشکیل، تعمیر اور ترقی کے لئے سعی کی جا سکے۔ پھر اسے شخصی کردار، اور اجتماعی رویہ، اور انفرادی و اجتماعی سعی و عمل کو صحیح سمتِ سفر کا پابند اور بے راہ روی سے محفوظ رکھنے کے لئے ایسے جامع حدود کی ضرورت ہے جو شاہراہِ زندگی پر نشاناتِ راہ کا کام دیں اور ہر موڑ، ہر دوراہے، ہر خطرناک مرحلے پر اسے آگاہ کر دیں کہ تیرا راستہ اُدھر نہیں بلکہ اِدھر ہے۔ پھر اس کو چند ایسے عملی ضابطوں کی ضرورت ہے جو اپنی نوعیت کے

اعتبار سے دائمی اور عالمگیر پیروی کے قابل ہوں اور انسانی زندگی کو اُس حقیقتِ نفس الامری، اُس مآلِ زندگی، اُس مقصدِ حیات، اُن اُصولِ اخلاق، اُن اصولِ تمدّن اور اُن حدودِ عمل سے ہمیشہ وابستہ رکھیں جن کی تعیین اُس "الدّین" میں کی گئی ہو۔

یہ ہے وُہ چیز جسے وضع کرنے کا سوال درپیش ہے۔ اب غور کیجئے کیا انسان ایسے ذرائع رکھتا ہے جن سے وہ خود اپنے لئے ایک ایسا الدّین وضع کر سکے۔

انسانی ذرائع کا جائزہ

انسان کے پاس اپنا "دین" یا طریقِ زندگی اخذ کرنے کے ذرائع چار سے زیادہ نہیں ہیں۔ پہلا ذریعہ خواہش ہے۔ دوسرا ذریعہ عقل ہے تیسرا ذریعہ مشاہدہ و تجربہ ہے۔ چوتھا ذریعہ پچھلے تجربات کا تاریخی ریکارڈ ہے۔ غالباً ان کے سوا کسی پانچویں ذریعہ کی نشان دہی نہیں کی جا سکتی۔ ان چاروں ذرائع کا جتنا مکمل جائزہ لے کر آپ دیکھ سکتے ہوں، دیکھئے کہ آیا یہ "الدین" کے ایجاد کرنے میں انسان کی مدد کر سکتے ہیں؟ میں نے اپنی عمر کا معتدبہ حصّہ اس کی تحقیق میں صرف کیا ہے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ ذرائع "الدین" کی ایجاد میں تو مدد نہیں دے سکتے، البتہ اگر کوئی غیر انسانی رہنما "الدین" کو پیش کر دے تو اسے سمجھنے، پرکھنے، پہچاننے اور اس کے مطابق زندگی کے تفصیلی نظام کو وقتاً فوقتاً مرتب کرتے رہنے میں

ضرور مددگار بن سکتے ہیں۔

خواہش پہلے خواہش کو لیجئے۔ کیا یہ انسان کی رہنما بن سکتی ہے؟ اگرچہ یہ انسان کے اندر اصلی محرک عمل ہے مگر اس کی عین فطرت میں جو کمزوریاں موجود ہیں ان کی بنا پر یہ رہنمائی کے قابل ہرگز نہیں ہو سکتی۔ تنہا رہنمائی کرنا تو درکنار، عقل اور علم کو بھی اکثر اس نے گمراہ کیا ہے۔ اس کو تربیت سے خواہ کتنا ہی روشن خیال بنا دیا جائے، بہرحال آخری فیصلہ جب کبھی اس پر چھوڑا جائے گا، یہ بلا مبالغہ ۹۹ فیصدی حالات میں غیر مستقیم ہی فیصلہ کرے گی، کیونکہ اس کے اندر جو تقاضے پائے جاتے ہیں وہ اس کو صحیح فیصلہ کرنے کے بجائے ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں جس سے مطلوب کسی نہ کسی طرح جلدی اور بآسانی حاصل ہو جائے۔ یہ نفس "خواہش انسانی" کی طبعی کمزوری ہے۔ لہٰذا خواہ ایک فرد کی خواہش ہو، یا ایک طبقہ کی ہو، یا وہ خواہش عام (General will) ہو جس کا روسونے ذکر کیا ہے، بہرحال کسی قسم کی انسانی خواہش میں بھی فطرۃً یہ صلاحیت نہیں ہے کہ ایک "الدّین" کے وضع کرنے میں مددگار بن سکے۔ بلکہ جہاں تک مسائل عالیہ (Ultimate problems) مثلاً حیاتِ انسانی کی حقیقت، اس کے مآل اور اس کی غائت کا تعلق ہے، ان کو حل کرنے میں تو وہ کسی طرح مددگار بن ہی نہیں سکتی۔

عقل پھر عقل کو لیجئے۔ اس کی تمام بہترین صلاحتیں مسلم، انسانی زندگی

میں اس کی اہمیت بھی ناقابل انکار، اور یہ بھی تسلیم کہ انسان کے اندر یہ بہت بڑی رہنما طاقت ہے۔ لیکن قطع نظر اس سوال کے کہ انسان کے لئے "الدین" کس کی عقل وضع کرے گی، زید کی؟ بکر کی؟ تمام انسانوں کی؟ یا انسانوں کے کسی خاص گروہ کی؟ اس زمانہ کے لوگوں کی؟ یا کسی پچھلے زمانہ والوں کی؟ یا آئندہ آنے والوں کی؟ سوال صرف یہ ہے کہ نفس "عقل انسانی" کے حدود کا جائزہ لینے کے بعد کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ "الدین" کے وضع کرنے میں اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ اس کے تمام فیصلے منحصر ہیں اُس مواد پر جو حواس اُس کو فراہم کر کے دیں۔ وہ غلط مواد فراہم کر کے دیں گے تو یہ غلط فیصلہ کر دے گی، وہ ناقص مواد فراہم کر کے دیں گے تو یہ ناقص فیصلہ کر دے گی۔ اور جن امور میں وہ کوئی مواد فراہم کر کے نہ دیں گے ان میں اگر یہ خود شناس ہے تو کوئی فیصلہ نہ کرے گی اور اگر بر خود غلط ہے تو اندھیرے میں چھ بائی تیر چلاتی رہے گی۔ یہ محدودیتیں جس بے چاری عقل کے ساتھ لگی ہوئی ہیں وہ آخر کس طرح اس کی اہل ہو سکتی ہے کہ نوع انسانی کے لئے "الدین" بنانے کی تکلیف اسے دی جائے۔ "الدین" بنانے کا انحصار جن مسائل عالیہ کے حل پر ہے، ان میں حواس سرے سے کوئی مواد فراہم ہی نہیں کرتے۔ پھر کیا ان مسائل کا فیصلہ تخیلات، لاطائل قیاسات اور مجرد اوہام سے کیا جائے گا؟ "الدین" بنانے کے لئے جن مستقل اخلاقی

قدروں کا تعین ناگزیر ہے ان کے لئے حواس بہت ہی ناقص مواد فراہم کرتے ہیں۔ پھر کیا عقل سے اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ ناقص مواد پر صحیح و کامل قدریں متعین کرے گی؟ اسی طرح دو الدّین کے جو دوسرے اجزائے ترکیبی میں نے بیان کئے ہیں ان میں سے کسی ایک جز کے لئے بھی حواس سے بالکل صحیح اور مکمل مواد حاصل نہیں ہو سکتا جس کی بنا پر عقل ایک جامع اور مکمل نظام بنا سکے۔ اور اس پر مزید یہ ہے کہ عقل کے ساتھ خواہش کا عنصر مستقل طور پر لگا ہوا ہے جو اسے ٹھیٹھ عقلی فیصلے دینے سے روکتا ہے اور اس کی راست روی کو کچھ نہ کچھ ٹیڑھ کی طرف مائل کر کے ہی چھوڑتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ عقل انسانی حواس کے فراہم کردہ مواد کی ترتیب اور اس سے استدلال کرنے میں کوئی غلطی نہ کرے گی، تب بھی اپنی کمزوریوں کی بنا پر وہ اتنا اہل ہوتا نہیں رکھتی کہ اتنے بڑے کام کا بوجھ اس پر ڈالا جا سکے۔ یہ بوجھ اس پر ڈالنا اس پر بھی ظلم کرنا ہے اور خود اپنے اوپر بھی۔

سائنس اب تیسرے ذریعہ کو لیجئے، یعنی وہ علم جو مشاہدات و تجربات سے حاصل ہوتا ہے۔ میں اس علم کی قدر و قیمت کا اعتراف کرنے میں کسی طالب علم سے پیچھے نہیں ہوں اور نہ ذرہ برابر اس کی تحقیر کرنا پسند کرتا ہوں، لیکن اس کی محدودیتوں کو نظر انداز کر کے اسے وہ وسعت دینا، جو فی الواقع اسے حاصل نہیں

ہے، میرے نزدیک بے علمی ہے۔ "علم انسانی" کی حقیقت پر جس شخص کی بھی نظر ہوگی وہ اس بات کو ماننے سے انکار نہ کرے گا کہ جہاں تک مسائلِ عالیہ کا تعلق ہے، ان کی کنہ تک اس کی رسائی محال ہے کیونکہ انسان کو وہ ذرائع حاصل ہی نہیں ہیں جن سے وہ اس تک پہنچ سکے۔ نہ وہ اس کا براہ راست مشاہدہ کر سکتا ہے اور نہ مشاہدہ و تجربہ کے تحت آنے والی اشیاء سے استدلال کرکے اس کے متعلق ایسی رائے قائم کر سکتا ہے جس پر "علم" کا اطلاق ہو سکتا ہو۔ لہٰذا "الدین" وضع کرنے کے لئے جن مسائل کا حل معلوم کرنا سب سے پہلی ناگزیر ضرورت ہے وہ تو علم کی دسترس سے باہر ہی ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اخلاقی قدریں، تمدّن کے اصول، اور بے راہ روی سے بچانے والے حدود معیّن کرنے کا کام آیا علم کے حوالے کیا جا سکتا ہے یا نہیں، تو اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ یہ کام کس شخص یا کس گروہ یا کس زمانہ کا علم انجام دے گا۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ علمی طور پر یہ کام انجام دینے کے لئے ناگزیر شرائط کیا ہیں۔ اس کے لئے اولین شرط یہ ہے کہ اُن تمام قوانین فطرت کا علم حاصل ہو جن کے تحت انسان اس دنیا میں جی رہا ہے۔ اس کے لئے دوسری شرط یہ ہے کہ خود انسان کی اپنی زندگی سے جو علوم تعلق رکھتے ہیں وہ مکمل ہوں۔ اس کے لئے تیسری شرط یہ ہے کہ ان دونوں قسم کے علوم یعنی کائناتی اور انسانیاتی علوم کی معلومات یکجا ہوں اور کوئی ذہنِ کامل

ان کو صحیح ترتیب دے کر، اُن سے صحیح استدلال کر سکے۔ انسان کے لئے اخلاقی قدروں، تمدّن کے اصُولوں، اور بے راہ روی سے بچانے والی حدوں کا تعین کرے۔ یہ شرائط نہ اس وقت تک پوری ہوئی ہیں، نہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ پانچ ہزار برس بعد پوری ہو جائیں گی ممکن ہے کہ انسانیت کی وفات سے ایک دن پہلے یہ پوری ہو جائیں۔ مگر اُس وقت اس کا فائدہ ہی کیا ہو گا۔

تاریخ آخر میں اُس ذریعہ علم کو لیجئے جسے ہم پچھلے انسانی تجربات کا تاریخی ریکارڈ یا انسانیت کا نامۂ اعمال کہتے ہیں۔ اس کی اہمیّت اور اس کے فائدوں سے مجھے انکار نہیں ہے، مگر میں کہتا ہوں اور غور کریں گے تو آپ بھی مان لیں گے کہ "الدین" وضع کرنے کا عظیم الشان کام انجام دینے کے لئے یہ بھی ناکافی ہے۔ میں یہ سوال نہیں کرتا کہ یہ ریکارڈ ماضی سے حال کے لوگوں تک صحت اور جامعیت کے ساتھ پہنچا بھی ہے یا نہیں؟ میں یہ بھی نہیں پوچھتا کہ اس ریکارڈ کی مدد سے "الدین" وضع کرنے کے لئے انسانیت کا نمائندہ کس ذہن کو بنایا جائے گا؟ ہیگل کے ذہن کو؟ مارکس کے ذہن کو؟ ارنسٹ ہیکل کے ذہن کو؟ یا کسی اور ذہن کو؟ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ماضی، حال، یا مستقبل میں کس تاریخ تک کا ریکارڈ ایک "الدین" وضع کرنے کے لئے کافی مواد فراہم کر سکے گا؟ اُس تاریخ کے بعد پیدا ہونے والے خوش قسمت ہیں، باقی

رہے اس سے پہلے گذر جانے والے، تو اُن کا بس اللہ ہی حافظ ہے۔

مایوس کُن نتیجہ

یہ مختصر اشارات جو میں نے کئے ہیں، مجھے توقع ہے کہ میں نے ان میں کوئی علمی یا استدلالی غلطی نہیں کی ہے۔ اور اگر انسان کے ذرائع کا یہ جائزہ، جو مَیں نے لیا ہے، صحیح ہے تو پھر ہمیں کوئی چیز اس یقین تک پہنچنے سے باز نہیں رکھ سکتی کہ انسان اپنے لئے کوئی کچا پکا، غلط سلط، وقتی اور مقامی "دین" تو وضع کر سکتا ہے، لیکن وہ چاہے کہ "الدین" وضع کر سکے، تو یہ قطعی محال ہے۔ پہلے بھی محال تھا، آج بھی محال ہے، اور آئندہ کے لئے بھی اس کے امکان سے پوری مایوسی ہے۔

اب اگر کوئی خدا رہنمائی کے لئے موجود نہیں ہے۔ جیسا کہ منکرین خدا کا خیال ہے تو انسان کے لئے مناسب یہ ہے کہ خود کشی کر لے۔ جس مُسافر کے لئے نہ کوئی رہنما موجود ہو اور نہ جس کے اپنے پاس راستہ معلوم کرنے کے ذرائع موجود ہوں، اس کے لئے یاس اور کامل یاس کے سوا کچھ مقدر نہیں، اس کا کوئی ہمدرد اس کے سوا اسے اور کیا مشورہ دے سکتا ہے کہ سرِ راہ ایک پتھر سے اپنی مشکل آسان کر لے۔ اور اگر خدا ہے لیکن رہنمائی کرنے والا خدا نہیں ہے جیسا کہ بعض فلسفیانہ اور سائنٹفک طرز کے مُثبتینِ خدا کا گمان ہے تو یہ اور بھی زیادہ افسوسناک صورتِ حال ہے۔ جس خدا نے موجوداتِ عالم کے بقا و نشو و نما کے لئے ہر اس چیز کی فراہمی کا انتظام کیا ہے

جس کی ضرورت کا تصور کیا جا سکتا ہو، لیکن نہیں ایک کیا تو صرف انسان کی اُس سب سے بڑی ضرورت کا انتظام جس کے بغیر پُوری نوع کی زندگی غلط ہوئی جاتی ہے، اس کی بنائی ہوئی دنیا میں رہنا ایک مصیبت ہے، ایسی سخت مصیبت جس سے بڑھ کر کسی دوسری مصیبت کا تصور ممکن نہیں۔ آپ غریبوں اور مفلسوں، بیماروں اور زخمیوں، مظلوموں اور دُکھی جنتاؤں کی مصیبت پر کیا روتے ہیں، روئیے اس پُوری نوع کی مصیبت پر جو اس بیچارگی کے عالم میں چھوڑ دی گئی ہے کہ بار بار غلط تجربے کر کے ناکام ہوتی ہے، ٹھوکریں کھا کر گرتی ہے اور پھر اُٹھ کر چلتی ہے تاکہ پھر ٹھوکر کھائے، ہر ٹھوکر پر ملک کے ملک اور قومیں کی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں، اس غریب کو اپنے مقصد زندگی تک کی خبر نہیں ہے، کچھ نہیں جانتی کہ کاہے کے لئے سعی و عمل کرے اور کس ڈھنگ پر کرے۔ یہ سب کچھ وہ خدا دیکھ رہا ہے جو اسے زمین پر وجود میں لایا ہے، مگر وہ بس پیدا کرنے سے مطلب رکھتا ہے، رہنمائی کی پرواہ نہیں کرتا۔

اُمید کی ایک ہی کِرن

اس تصویر کے بالکل برعکس قرآن ہمارے سامنے صورتِ حال کا ایک دوسرا نقشہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا محض پیدا ہی کر دینے والا نہیں ہے بلکہ رہنمائی کرنے والا بھی ہے۔ اس نے موجوداتِ عالم میں سے ہر چیز کو وہ ہدایت بخشی ہے جو اس کی فطرت کے لحاظ سے

اس کے لئے ضروری ہے (اَلَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی)
اگر اس کا ثبوت چاہو تو جس چیونٹی، جس مکھی، جس مکڑی کو چاہو پکڑ کر دیکھ لو۔ وُہی خدا انسان کی بھی رہنمائی کرنے والا ہے۔ لہٰذا انسان کے لئے صحیح طریق کار یہ ہے کہ خود سری چھوڑ کر اس کے آگے سر تسلیم خم کر دے اور جس جامع و مکمل نظام زندگی یا "الدین" کی ہدایت اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے بھیجی ہے اس کی پیروی اختیار کر لے۔

دیکھئے! ایک طرف تو وہ نتیجہ ہے جو انسان کی قوتوں اور اس کے ذرائع کا جائزہ لینے سے ہم کو حاصل ہوتا ہے، اور دوسری طرف قرآن کا یہ دعوےٰ ہے۔ ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ یا تو اس دعوے کو قبول کریں، یا پھر اپنے آپ کو مایوسی اور اس مایوسی کے حوالے کر دیں جس کے اندھیرے میں کہیں برائے نام بھی اُمید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ در اصل صورت حال یہ ہے ہی نہیں کہ "الدین" حاصل ہونے کے دو وسیلے موجود ہوں، اور سوال یہ ہو کہ ہم ان میں سے کس وسیلہ سے مدد لیں۔ اصلی صورت حال یہ ہے کہ "الدین" جس وسیلے سے ہم کو مل سکتا ہے وہ صرف ایک ہے اور انتخاب کا سوال صرف اس امر میں ہے کہ آیا ہم اس تنہا وسیلے سے مدد لیں یا اس کی دستگیری کا فائدہ اٹھانے کے بجائے تاریکی میں بھٹکتے پھرنے کو ترجیح دیں۔

قرآن کے دلائل

یہاں تک جو استدلال میں نے کیا ہے وہ تو ہم کو محض اس حد تک پہنچاتا ہے کہ ہماری فلاح کے لئے قرآن کے اس دعوے کو قبول کئے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ یعنی بالفاظ دیگر کافر نتوانی شد، ناچار مسلماں شو۔ لیکن قرآن اپنے دعوے کی تائید میں جو دلائل پیش کرتا ہے وہ اس سے بہت زیادہ اعلیٰ و اشرف ہیں، کیونکہ وہ ہمیں با دل ناخواستہ مسلمان ہونے کے بجائے برضا و رغبت مسلمان ہونے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس کی بہت سی دلیلوں میں چار سب سے زیادہ پُر زور ہیں اور انہی کو اس نے بار بار بتکرار پیش کیا ہے۔

(۱) انسان کے لئے اسلام ہی ایک صحیح طریق زندگی ہے اس لئے کہ یہی حقیقت نفس الامری کے مطابق ہے اور اس کے سوا ہر دوسرا رویہ خلاف حقیقت ہے۔

أَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّإِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۔ (آل عمران: ۹)

کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں حالانکہ وہ سب چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور وہ جو زمین میں ہیں چار و ناچار اُسی کے آگے سرِ تسلیم خم کئے ہوئے ہیں، اور اُسی کی طرف انہیں پلٹ کر جانا ہے۔

(۲) انسان کے لئے یہی ایک صحیح طریق زندگی ہے کیونکہ یہی حق ہے اور از روئے انصاف اس کے سوا کوئی دوسرا رویہ صحیح نہیں ہو سکتا

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِی خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِی سِتَّةِ أَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی اللَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِأَمْرِهٖ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ - (الاعراف: ۷)

حقیقت میں تمہارا رب (مالک، فرمانروا) تو اللہ ہی جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دوروں میں پیدا کیا اور پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ گر ہوا، جو دن کو رات کا لباس اڑھاتا ہے اور پھر رات کے تعاقب میں دن تیزی کے ساتھ دوڑا آتا ہے سورج اور چاند اور تارے سب کے سب جس کے تابع فرمان ہیں۔ سنو! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا۔ بڑا برکت والا ہے وہ کائنات کا رب

(۳) انسان کے لئے یہی رویہ صحیح ہے، کیونکہ تمام حقیقتوں کا صحیح علم صرف خدا ہی کو ہے اور بے خطا ہدایت صرف وہی کر سکتا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰی عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْأَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ

درحقیقت اللہ سے نہ زمین کی کوئی چیز چھپی ہوئی ہے اور نہ آسمان کی۔

یَعْلَمُ مَا بَیْنَ أَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ إِلَّا بِمَا شَآءَ

جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے، اور لوگ اس کی معلومات میں سے کسی چیز پر بھی حاوی نہیں ہو سکتے بجز ان چیزوں کے جن کا علم وہ خود ان کو دینا چاہے۔

قُلْ إِنَّ هُدَی اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰی -

اے پیغمبر کہدو کہ اصلی ہدایت صرف خدا ہی کی ہدایت ہے۔

(۴) انسان کے لئے یہی ایک راہ راست ہے کیونکہ اس کے بغیر

عدل ممکن نہیں، اس کے سوا جس راہ پر بھی انسان چلے گا وہ بالآخر ظلم ہی کی طرف جائے گی۔

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ	جو اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کرتے ہیں وہی ظالم ہیں۔
وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ	جو اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی ظالم ہیں۔

یہ دلائل ہیں جن کی بنا پر معقول انسان کے لئے لازم ہے کہ وہ اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دے اور ہدایت کے لئے اس کی طرف رجوع کرے۔

خدائی ہدایت کے پرکھنے کا معیار

اب آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک سوال کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں جو لازماً اس مرحلہ پر پہنچ کر ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اپنی تحقیق کے دوران میں خود میرے دل میں بھی پیدا ہو چکا ہے وہ سوال یہ ہے کہ کیا ہم ہر اُس شخص کی بات مان لیں جو ایک دین ہمارے سامنے اس دعوے کے ساتھ پیش کر دے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو آخر ہمارے پاس وہ کیا معیار ہے جس سے ہم انسانی ساخت کے دین اور خدائی ہدایت کے دین میں فرق کر سکیں؟ اس کا جواب اگرچہ بڑی مفصل تحقیقی بحث چاہتا ہے، مگر میں یہاں مختصر اشاروں میں وہ چار بڑے معیار بیان کروں گا جو

انسانی فکر اور خدائی فکر کو ممیّز کرتے ہیں۔

انسانی فکر کی پہلی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علم کی غلطی اور محدودیت کا اثر لازماً پایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس خدائی فکر میں غیر محدود علم اور صحیح علم کی شان بالکل نمایاں ہوتی ہے۔ جو چیز خدا کی طرف سے ہوگی اُس میں آپ ایسی کوئی چیز نہیں پا سکتے جو کبھی کسی زمانہ میں کسی ثابت شدہ علمی حقیقت کے خلاف ہو، یا جس کے متعلق یہ ثابت کیا جا سکے کہ اس کے مصنف کی نظر سے حقیقت کا فلاں پہلو اوجھل رہ گیا۔ مگر اس معیار تحقیق کو استعمال کرتے ہوئے یہ بات نہ بھول جائیے کہ علم اور علمی قیاس اور نظریۂ علمی میں بڑا فرق ہے۔ ایک وقت میں جو علمی قیاسات اور علمی نظریات دماغوں پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں، اکثر غلطی سے ان کو "علم" سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ ان کے غلط ہونے کا بھی اتنا ہی امکان ہوتا ہے جتنا ان کے صحیح ہونے کا، اور تاریخ علم میں ایسے بہت کم قیاسات و نظریات کی نشان دہی کی جا سکتی ہے جو بالآخر "علم" ثابت ہوئے ہیں۔

انسانی فکر کی دوسری بڑی کمزوری نقطۂ نظر کی تنگی ہے، اس کے برخلاف خدائی فکر میں وسیع ترین نقطۂ نظر پایا جاتا ہے۔ جب آپ خدائی فکر سے نکلی ہوئی کسی چیز کو دیکھیں گے تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے اس کا مصنف ازل سے ابد تک دیکھ رہا ہے، پوری

کائنات کو دیکھ رہا ہے، تمام حقیقتوں کو بیک نگاہ دیکھ رہا ہے۔
اس کے مقابلہ میں بڑے سے بڑے فلسفی اور مفکر کی فکر بھی ایک
بچے کی فکر محسوس ہوگی۔

انسانی فکر کا تیسرا اہم خاصہ یہ ہے کہ اس میں حکمت و دانش،
جذبات و خواہشات کے ساتھ کہیں نہ کہیں سازباز اور مصالحت کرتی
نظر آ ہی جاتی ہے۔ بخلاف اس کے خدائی فکر میں بے لاگ حکمت
اور خالص دانشمندی کی شان اتنی نمایاں ہوتی ہے کہ اس کے احکام
میں کہیں آپ جذباتی جھکاؤ کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔

انسانی فکر کی ایک اور کمزوری یہ ہے کہ جو نظام زندگی وہ خود
تصنیف کرے گا اس میں جانبداری، انسان اور انسان کے درمیان غیر
عقلی امتیاز، اور غیر عقلی بنیادوں ہی پر ترجیح بعض علیٰ بعض کا عنصر
لازماً پایا جائے گا، کیونکہ ہر انسان کی کچھ ذاتی دلچسپیاں ہوتی ہیں، جو
بعض انسانوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں اور بعض کے ساتھ وابستہ
نہیں ہوتیں، برخلاف اس کے خدائی فکر سے نکلا ہوا نظام زندگی
ایسے ہر عنصر سے بالکل پاک ہوگا۔

اس معیار پر آپ ہر اس نظام زندگی کو جانچ کر دیکھئے جو اپنے
آپ کو خدا کی طرف سے "الدّین" کہتا ہو۔ اگر وہ انسانی فکر کی
ان تمام خصوصیات سے خالی ہو اور پھر جامعیت اور ہمہ گیری کی وہ
شان بھی رکھتا ہو جو اس سے پہلے میں نے "الدین" کی ضرورت ثابت

کرتے ہوئے بیان کی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس پر ایمان لانے میں تامل کریں۔

ایمان کے تقاضے

اب مجھے اپنے خطبہ کے بنیادی سوالات میں سے آخری سوال پر کچھ گفتگو کرنی ہے، اور وہ یہ ہے کہ آدمی جب قرآن کے اس دعوے کو تسلیم کرلے اور اُس "الدّین" پر ایمان لے آئے جس کے من جانب اللہ ہونے کا اطمینان اُسے حاصل ہو گیا، تو اس تسلیم کرنے اور ایمان لانے کے مقتضیات کیا ہیں۔

میں ابتداء میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلام کے معنی جھک جانے، سپر ڈال دینے، اپنے آپ کو سپرد کر دینے کے ہیں۔ اس جھکاؤ، سپردگی اور سپر اندازی کے ساتھ خود رائی، خود مختاری اور فکر و عمل کی آزادی ہرگز نہیں نبھ سکتی۔ جس دین پر بھی آپ ایمان لائیں، آپ کو اپنی پوری شخصیت اس کے حوالے کر دینی ہوگی، اپنی کسی چیز کو بھی آپ اس کی پیروی سے مستثنیٰ نہیں کر سکتے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ آپ کے دل اور دماغ کا دین ہو، آپ کی آنکھ اور کان کا دین ہو، آپ کے ہاتھ اور پاؤں کا دین ہو، آپ کے پیٹ اور دھڑ کا دین ہو، آپ کے قلم اور زبان کا دین ہو، آپ کے اوقات اور آپ کی محنتوں کا دین ہو، آپ کی سعی اور عمل کا دین ہو، آپ کی محبت اور نفرت کا دین ہو، آپ کی دوستی اور دشمنی

کا دین ہو، غرض آپ کی شخصیت کا کوئی جزو اور کوئی پہلو بھی اُس دین سے خارج نہ ہو۔ جس چیز کو بھی جتنا اور جس حیثیت سے آپ اُس دین کے احاطہ سے باہر اور اُس کی پیروی سے مستثنےٰ رکھیں گے، سمجھ لیجئے کہ اُسی قدر آپ کے دعوائے ایمان میں جھوٹ شامل ہے۔ اور ہر راستی پسند انسان کا فرض ہے کہ اپنی زندگی کو جھوٹ سے پاک رکھنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔

پھر یہ بھی میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ انسانی زندگی ایک کُل ہے جسے شعبوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا انسان کی پوری زندگی کا ایک ہی دین ہونا چاہیئے۔ دو دو اور تین تین دینوں کی بیک وقت پیروی بجز اس کے کچھ نہیں کہ ایمان کے ڈانواں ڈول اور عقلی فیصلے کے مضطرب ہونے کا ثبوت ہے۔ جب فی الواقع کسی دین کے "الدین" ہونے کا اطمینان آپ حاصل کر لیں اور اس پر ایمان لے آئیں تو لازماً اس کو آپ کی زندگی کے تمام شعبوں کا دین ہونا چاہیئے۔ اگر وہ شخصی حیثیت سے آپ کا دین ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہی آپ کے گھر کا دین بھی نہ ہو، آپ کی تربیت اولاد کا، آپ کی تعلیم اور آپ کے مدرسہ کا، آپ کے کاروبار اور کسب معاش کا، آپ کی مجلسی زندگی اور قومی طرزِ عمل کا، آپ کے تمدن اور سیاست کا، آپ کے ادب اور آرٹ کا دین بھی نہ ہو۔ جس طرح یہ بات محال ہے کہ ایک ایک موتی اپنی جگہ تو موتی ہو، مگر جب

تسبیح کے رشتہ میں بہت سے موتی منظم ہوں تو سب مل کر دانۂ نخود بن جائیں۔ اسی طرح یہ بات بھی میرے دماغ کو اپیل نہیں کرتی کہ انفرادی حیثیت سے تو ہم ایک دین کے پیرو ہوں مگر جب اپنی زندگی کو منظم کریں تو اس منظم زندگی کا کوئی پہلو اس دین کی پیروی سے مستثنیٰ رہ جائے۔

ان سب سے بڑھ کر ایمان کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ جس دین کے "الدین" ہونے پر آپ ایمان لائیں، اس کی برکتوں سے اپنے ابنائے نوع کو بہرہ ور کرنے کی کوشش کریں اور آپ کی تمام سعی و جہد کا مرکز و محور یہ ہو کہ یہی "الدین" تمام دُنیا کا دین بن جائے، جس طرح حق کی فطرت یہ ہے کہ وہ غالب ہو کر رہنا چاہتا ہے، اسی طرح حق پرستی کی بھی یہ عین فطرت ہے کہ وہ حق کو جان لینے کے بعد باطل پر اسے غالب کرنے کی سعی کئے بغیر چین نہیں لے سکتی۔ جو شخص دیکھ رہا ہو کہ باطل ہر طرف زمین اور اس کے باشندوں پر چھایا ہُوا ہے اور پھر یہ منظر اس کے اندر کوئی بے کلی، کوئی چبھن، کوئی تڑپ پیدا نہیں کرتا، اس کے دل میں اگر حق پرستی ہے بھی تو سوئی ہوئی ہے۔ اسے فکر کرنی چاہئے کہ یہ نیند کا سکوت کہیں موت کے سکوت میں تبدیل نہ ہو جائے۔

فہرست مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
رسالہ دینیات	۸ر عہ	روداد جماعت اسلامی حصہ اول	عہ ر
خطبات	۸ر عہ	،، ،، حصہ دوم	۹ر
مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول	۸ر عہ	،، ،، حصہ سوم	عہ ر
،، ،، ،، حصہ دوم	۸ر عہ	**تبلیغی پمفلٹ**	
،، ،، ،، حصہ سوم	عا	سلامتی کا راستہ	۶ر
تنقیحات	۸ر عا	اسلام کا نظریہ سیاسی	۶ر
تفہیمات	۸ر ہے	اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟	۶ر
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	عہ ر		
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۸ر عہ	اسلام اور جاہلیت	۶ر
مسئلہ جبر و قدر	عہ ر	نیا نظام تعلیم	۶ر
مسئلہ قومیت	۸ر عہ	دینِ حق	۶ر
حقیقت توحید	۲ر عہ	مذہب کا انقلابی تصور	۶ر
پردہ	۸ر عا	نشانِ راہ	۶ر
تجدید و احیائے دین	عہ ر	اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	۶ر
اشتراکیت اور نظام اسلام	زیر طبع	جہاد فی سبیل اللہ	۶ر
اسلام اور ضبط ولادت	عہ ر	تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں	۶ر
حقوق الزوجین	۸ر عہ	حقیقت شرک	۲ر عہ

تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بُنیادیں

از

ابوالاعلیٰ مودودی

شائع کردہ

مکتبہ جماعتِ اسلامی لاہور

(پاکستان)

قیمت ۶/

سید ابوالاعلیٰ مودودی طابع و ناشر نے

کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور

مکتبہ جماعت اسلامی لاہور (پاکستان)

سے شائع کیا

تعداد اشاعت - باردوم - ۲۰۰۰

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحریکِ اسلامی کی اخلاقی بنیادیں

(یہ تقریر سیّد ابوالاعلیٰ مودودی، امیر جماعت اسلامی نے ۲۱ اپریل ۱۹۴۵ء کو دارالاسلام، جمال پور، پٹھان کوٹ میں جماعت اسلامی کے پہلے کل ہند اجتماع کے آخری اجلاس میں ارشاد فرمائی)

حمد و صلوٰۃ اور تمہیدی فقروں کے بعد فرمایا:۔

رفقاء و حاضرین! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ہماری جدوجہد کا آخری مقصود انقلاب امامت ہے، یعنی دنیا میں ہم جس انتہائی منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ فسّاق و فجّار کی امامت و قیادت ختم ہو کر امامتِ صالحہ کا نظام قائم ہو، اور اس سعی و جہد کو ہم دنیا و آخرت میں رضائے الٰہی کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ چیز جسے ہم نے اپنا مقصد قرار دیا ہے افسوس ہے کہ آج اس کی اہمیت

سے مسلم اور غیر مسلم سبھی غافل ہیں۔ مسلمان اس کو محض سیاسی مقصد سمجھتے ہیں اور اُن کو کچھ احساس نہیں ہے کہ دین میں اس کی کیا اہمیت ہے۔ غیر مسلم کچھ تعصب کی بنا پر اور کچھ ناواقفیت کی وجہ سے اس حقیقت کو جانتے ہی نہیں کہ در اصل فساق و فجار کی قیادت ہی نوع انسانی کے مصائب کی جڑ ہے اور انسان کی بھلائی کا سارا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ دُنیا کے معاملات کی سربراہ کاری صالح لوگوں کے ہاتھوں میں ہو۔ آج دنیا میں جو فسادِ عظیم برپا ہے، جو ظلم اور طغیان ہو رہا ہے، انسانی اخلاق میں جو عالمگیر بگاڑ رونما ہے، انسانی تمدن و معیشت و سیاست کی رگ رگ میں جو زہر سرایت کر گئے ہیں، زمین کے تمام وسائل اور انسانی علوم کی دریافت کردہ ساری قوتیں جس طرح انسان کی فلاح و بہبود کے بجائے اُس کی تباہی کے لئے استعمال ہو رہی ہیں، ان سب کی ذمّہ داری اگر کسی چیز پر ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ دنیا میں چاہے نیک لوگوں اور شریف انسانوں کی کمی نہ ہو مگر دُنیا کے معاملات اُن کے ہاتھ میں نہیں ہیں بلکہ خدا سے پھرے ہوئے اور مادہ پرستی و بد اخلاقی میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ اب اگر کوئی شخص دُنیا کی اصلاح چاہتا ہو اور فساد کو صلاح سے۔ اضطراب کو امن سے، بداخلاقیوں کو اخلاقِ صالحہ سے اور برائیوں کو بھلائیوں سے بدلنے کا خواہشمند ہو تو اُس کے لئے محض نیکیوں کا وعظ اور خدا پرستی کی تلقین اور حسنِ اخلاق کی ترغیب ہی کافی نہیں ہے بلکہ اُس کا فرض ہے کہ نوعِ انسانی

ہیں جتنے صالح عناصر اس کو مل سکیں انہیں ملا کر وہ اجتماعی قوت بہم پہنچائے جس سے تمدن کی زمامِ کار فاسقوں سے چھینی جا سکے اور امامت کے نظام میں تغیر کیا جا سکے۔

زمامِ کار کی اہمیت

انسانی زندگی کے مسائل میں جس کو تھوڑی سی بصیرت بھی حاصل ہوگی وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہو سکتا کہ انسانی معاملات کے بناؤ اور بگاڑ کا آخری فیصلہ جس مسئلے پر منحصر ہے وہ یہ سوال ہے کہ معاملات انسانی کی زمامِ کار کس کے ہاتھ میں ہے۔ جس طرح گاڑی ہمیشہ اسی سمت چلا کرتی ہے جس سمت پر ڈرائیور اس کو لے جانا چاہتا ہے اور دوسرے لوگ جو گاڑی میں بیٹھے ہوں خواستہ و ناخواستہ اسی سمت پر سفر کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں، اسی طرح انسانی تمدن کی گاڑی بھی اسی سمت پر سفر کیا کرتی ہے جس سمت پر وہ لوگ جانا چاہتے ہیں جن کے ہاتھ میں تمدن کی باگیں ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ زمین کے سارے ذرائع جن کے قابو میں ہوں، قوت و اقتدار کی باگیں جن کے ہاتھ میں ہوں، عام انسانوں کی زندگی جن کے دامن سے وابستہ ہو، خیالات و افکار اور نظریات کو بنانے اور ڈھالنے کے وسائل جن کے قبضے میں ہوں، انفرادی سیرتوں کی تعمیر اور اجتماعی نظام کی تشکیل اور اخلاقی قدروں کی تعیین جن کے اختیار میں ہو، اُن کی رہنمائی و فرمانروائی

کے تحت رہتے ہوئے انسانیت بحیثیت مجموعی اُس راہ پر چلنے سے کسی طرح باز نہیں رہ سکتی جس پر وہ اُسے چلانا چاہتے ہوں۔ یہ رہنما و فرمانروا اگر خدا پرست اور صالح لوگ ہوں تو لامحالہ زندگی کا سارا نظام خدا پرستی اور خیر و صلاح پر چلے گا، بُرے لوگ بھی اچھے بننے پر مجبور ہونگے بھلائیوں کو نشوونما نصیب ہوگا اور برائیاں اگر مٹیں گی نہیں تو کم از کم پروان بھی نہ چڑھ سکیں گی۔ لیکن اگر رہنمائی و قیادت اور فرمانروائی کا یہ اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو خدا سے برگشتہ اور فسق و فجور میں سرگشتہ ہوں تو آپ سے آپ سارا نظام زندگی خدا سے بغاوت اور ظلم و بداخلاقی پر چلے گا، خیالات و نظریات، علوم و آداب، سیاست و معیشت، تہذیب و معاشرت، اخلاق و معاملات عدل و قانون، سب کے سب بحیثیت مجموعی بگڑ جائیں گے۔ برائیاں خوب نشوونما پائیں گی اور بھلائیوں کو زمین اپنے اندر جگہ دینے سے اور ہوا اور پانی ان کو غذا دینے سے انکار کر دیں گے اور خدا کی زمین ظلم و جور سے لبریز ہو کر رہے گی۔ ایسے نظام میں برائی کی راہ پر چلنا آسان اور بھلائی کی راہ پر چلنا کیا معنی قائم رہنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ جس طرح آپ نے کسی بڑے مجمع میں دیکھا ہوگا کہ سارا مجمع جس طرف جا رہا ہو، اس طرف چلنے کے لئے تو آدمی کو کچھ قوت لگانے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ مجمع کی قوت سے خود بخود اسی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے، لیکن اگر اس کی مخالف سمت میں کوئی چلنا چاہے تو وہ بہت زور مار کر بھی بمشکل ایک آدھ قدم چل سکتا ہے اور جتنے قدم وہ چلتا ہے مجمع کا ایک ہی ریلا اس سے کئی گنے زیادہ قدم اسے پیچھے

دھکیل دیتا ہے۔ اسی طرح اجتماعی نظام بھی جب غیر صالح لوگوں کی قیادت میں کفر وفسق کی راہوں پر چل پڑتا ہے تو افراد اور گروہوں کے لئے غلط راہ پر چلنا تو اتنا آسان ہو جاتا ہے کہ انہیں بطور خود اس پر چلنے کے لئے کچھ زور لگانے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی، لیکن اگر وہ اس کے خلاف چلنا چاہیں تو اپنے جسم وجان کا سارا زور لگانے پر بھی ایک آدھ قدم ہی راہ راست پر بڑھ سکتے ہیں اور اجتماعی رو اُن کی مزاحمت کے باوجود انہیں دھکیل کر میلوں پیچھے ہٹا لے جاتی ہے۔

یہ بات جو میں عرض کر رہا ہوں، یہ اب کوئی ایسی نظری حقیقت نہیں رہی ہے جسے ثابت کرنے کے لئے دلائل کی ضرورت ہو، بلکہ واقعات نے اسے ایک بدیہی حقیقت بنا دیا ہے جس سے کوئی صاحب دیدۂ بینا انکار نہیں کر سکتا آپ خود ہی دیکھ لیں کہ پچھلے سو برس کے اندر آپ کے اپنے ملک میں کس طرح خیالات ونظریات بدلے ہیں، مذاق اور مزاج بدلے ہیں، سوچنے کے انداز اور دیکھنے کے زاویئے بدلے ہیں، تہذیب واخلاق کے معیار اور قدر وقیمت کے پیمانے بدلے ہیں، اور کونسی چیز رہ گئی ہے جو بدل نہ گئی ہو، یہ سارا تغیر جو دیکھتے دیکھتے آپ کی اسی سرزمین میں ہوا اس کی اصلی وجہ آخر کیا ہے؟ کیا آپ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور تبلا سکتے ہیں کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں زمام کار تھی، اور راہنمائی وفرمانروائی کی باگوں پر جن کا قبضہ تھا انہوں نے پورے ملک کے اخلاق، اذہان، نفسیات، معاملات اور نظام تمدن کو اس سانچے میں ڈھال کر رکھ دیا جو اُن کی اپنی پسند کے مطابق تھا؛ پھر جن طاقتوں نے اس

تغیّر کی مزاحمت کی، ذرا ناپ کر دیکھئے کہ اُنہیں کامیابی کتنی ہوئی اور ناکامی کتنی۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ کل جو مزاحمت کی تحریک کے پیشوا تھے آج اُن کی اولاد وقت کی رَو میں بہی چلی جارہی ہے اور اُن کے گھروں تک میں وہی سب کچھ پہنچ گیا ہے جو گھروں سے باہر پھیل چکا تھا؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ مقدس ترین مذہبی پیشواؤں تک کی نسل سے وہ لوگ اُٹھ رہے ہیں جنہیں خدا کے وجود اور وحی و رسالت کے امکان میں بھی شک ہے؟ اس مشاہدے اور تجربے کے بعد بھی کیا کسی کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامّل ہو سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے مسائل میں اصل فیصلہ کُن مسئلہ زمامِ کار کا مسئلہ ہے؟ اور یہ اہمیت اس مسئلے نے کچھ آج ہی اختیار نہیں کی ہے بلکہ ہمیشہ سے اس کی یہی اہمیت رہی ہے۔ اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِهِمْ بہت پرانا مقولہ ہے، اور اسی بنا پر حدیث میں قوموں کے بناؤ اور بگاڑ کا ذمہ دار اُن کے علماء اور اُمرا کو قرار دیا گیا ہے کیونکہ لیڈرشپ اور زمامِ کار انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔

امامتِ صالحہ کا قیام دین کا حقیقی مقصود ہے

اس تشریح کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ دین میں اس مسئلے کی کیا اہمیت ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ کا دین اوّل تو یہ چاہتا ہے کہ لوگ بالکلیہ بندۂ حق بن کر رہیں اور ان کی گردن میں اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی کا حلقہ نہ ہو پھر وہ چاہتا ہے کہ اللہ ہی کا قانون لوگوں کی زندگی کا قانون بن کر رہے۔ پھر اس کا مطالبہ یہ ہے کہ زمین سے فساد مٹے اور ان مُنکرات کا استیصال کیا جائے جو اہلِ زمین پر اللہ کے غضب کا موجب ہوتے ہیں اور اُن خیرات و حسنات کو فروغ

دیا جائے جو اللہ کو پسند ہیں۔ ان تمام مقاصد میں سے کوئی مقصد بھی اس طرح پورا نہیں ہو سکتا کہ نوعِ انسانی کی رہنمائی و قیادت اور معاملاتِ انسانی کی سربراہ کاری ائمہ کفر و ضلال کے ہاتھوں میں ہو اور دینِ حق کے پیرو محض اُن کے ماتحت رہ کر اُن کی دی ہوئی رعایتوں اور گنجائشوں سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے یادِ خدا کرتے رہیں۔ یہ مقاصد تو لازمی طور پر اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ تمام اہلِ خیر و صلاح جو اللہ کی رضا کے طالب ہوں، اجتماعی قوت پیدا کریں اور سر دھڑ کی بازی لگا کر ایک ایسا نظامِ حق قائم کرنے کی سعی کریں جس میں امامت و رہنمائی اور قیادت و فرمانروائی کا منصب مومنین صالحین کے ہاتھوں میں ہو۔ اس چیز کے بغیر وُہ مدعا حاصل ہی نہیں ہو سکتا جو دین کا اصل مدعا ہے۔ اسی لئے دین میں امامتِ صالحہ کے قیام اور نظامِ حق کی اقامت کو مقصدی اہمیت حاصل ہے اور اس چیز سے غفلت برتنے کے بعد کوئی عمل ایسا نہیں ہو سکتا جس سے انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کو پہنچ سکے۔ غور کیجئے، آخر قرآن و حدیث میں التزامِ جماعت اور سمع و اطاعت پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص جماعت سے خروج اختیار کرلے تو وہ واجب القتل ہے خواہ وہ کلمۂ توحید کا قائل اور نماز روزہ کا پابند ہی کیوں نہ ہو؟ کیا اس کی وجہ یہ اور صرف یہی نہیں ہے، کہ امامتِ صالحہ اور نظامِ حق کا قیام و بقا دین کا حقیقی مقصود ہے، اور اس مقصد کا حصول اجتماعی طاقت پر موقوف ہے۔ لہٰذا جو شخص اجتماعی طاقت کو نقصان پہنچاتا ہے وہ اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کرتا ہے جس کی تلافی نہ نماز سے ہو سکتی ہے اور نہ اقرارِ توحید سے؟ پھر دیکھئے کہ آخر اس دین میں جہاد کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی ہے کہ اس سے جی چرانے اور منہ موڑنے والوں پر قرآن مجید

نفاق کا حکم لگاتا ہے؟ جہاد، نظامِ حق کی سعی کا ہی تو دوسرا نام ہے۔ اور قرآن اسی جہاد کو وہ کسوٹی قرار دیتا ہے جس پر آدمی کا ایمان پرکھا جاتا ہے بالفاظِ دیگر جس کے دل میں ایمان ہوگا وہ نہ تو نظامِ باطل کے تسلط پر راضی ہو سکتا ہے اور نہ نظامِ حق کے قیام کی جدوجہد میں جان و مال سے دریغ کر سکتا ہے، اور کوئی اس معاملہ میں کمزوری دکھاتا ہے تو اس کا ایمان ہی مشتبہ ہے۔ پھر بھلا کوئی دوسرا عمل اسے کیا نفع پہنچا سکتا ہے؟

اس وقت اتنا موقع نہیں ہے کہ میں آپ کے سامنے اس مسئلہ کی پوری تفصیل بیان کروں، مگر جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ اس حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے لئے بالکل کافی ہے کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے امامتِ صالحہ کا قیام مرکزی اور مقصدی اہمیت رکھتا ہے، اور جو شخص اس دین پر ایمان لایا ہو اُس کا کام صرف اُتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتا کہ اپنی زندگی کو حتی الامکان اسلام کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے، بلکہ عین اس کے ایمان ہی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنی تمام سعی و جہد کو اس ایک مقصد پر مرکوز کر دے کہ زمامِ کار کفار و فساق کے ہاتھ سے نکل کر صالحین کے ہاتھ میں آئے اور وہ نظامِ حق قائم ہو جو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق دُنیا کے انتظام کو درست رکھے۔ پھر چونکہ یہ مقصدِ اعلیٰ اجتماعی کوشش کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اس لئے ایک ایسی جماعتِ صالحہ کا وجود ضروری ہے جو خود اُصولِ حق کی پابند ہو اور نظامِ حق کو قائم کرنے، باقی رکھنے اور ٹھیک ٹھیک چلانے کے سوا دنیا میں کوئی دوسری غرض پیشِ نظر نہ رکھے۔ روئے زمین پر اگر صرف ایک ہی آدمی مومن ہو تب بھی اُس کے لئے یہ

درست نہیں ہے کہ اپنے آپ کو اکیلا پاکر اور ذرائع مفقود دیکھ کر نظامِ باطل کے تسلط پر راضی ہو جائے، یا "اَهْوَنُ الْبَلِیَّتَیْن" کے شرعی حیلے تلاش کر کے غلبۂ کفر و فسق کے ماتحت کچھ آدھی پونی مذہبی زندگی کا سودا چکانا شروع کر دے، بلکہ اُس کے لئے سیدھا اور صاف راستہ صرف یہی ایک ہے کہ بندگانِ خدا کو اُس طریقِ زندگی کی طرف بلائے جو خدا کو پسند ہے، پھر اگر کوئی اس کی بات سُن کر نہ دے تو اس کا ساری عمر صراطِ مستقیم پر کھڑے ہو کر لوگوں کو پکارتے رہنا اور پکارتے پکارتے مر جانا اس سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ وہ اپنی زبان سے وہ صدائیں بلند کرنے لگے جو ضلالت میں بھٹکی ہوئی دُنیا کو مرغوب ہوں اور اُن راہوں پر چل پڑے جن پر کُفّار کی امامت میں دنیا چل رہی ہو، اور اگر کچھ اللہ کے بندے اس کی بات سُننے پر آمادہ ہو جائیں تو اس کے لئے لازم ہے کہ ان کے ساتھ مل کر ایک جتھا بنائے اور یہ جتھا اپنی تمام اجتماعی قوت اُس مقصدِ عظیم کے لئے جدّ و جہد کرنے میں صرف کر دے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔

حضرات! مجھے خدا نے دین کا جو تھوڑا بہت علم دیا ہے اور قرآن و حدیث کے مطالعہ سے جو کچھ بصیرت مجھے حاصل ہوئی ہے اس سے میں دین کا تقاضا یہی کچھ سمجھا ہوں۔ یہی میرے نزدیک کتابِ الٰہی کا مطالبہ ہے، یہی انبیاء کی سنت ہے اور میں اپنی رائے سے نہیں ہٹ سکتا جب تک کوئی خدا کی کتاب اور رسول کی سُنّت ہی سے مجھ پر یہ ثابت نہ کر دے کہ دین کا یہ تقاضا نہیں ہے۔

امامت کے باب میں خدا کی سُنّت

اپنی سعی کے اس مقصد و منتہا کو سمجھ لینے کے بعد اب ہمیں اس سُنّت اللہ

کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیئے جس کے تحت ہم اپنے اس مقصود کو پا سکتے ہیں - یہ کائنات جس میں ہم رہتے ہیں، اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک "قانون" پہ بنایا ہے اور اس کی ہر چیز ایک لگے بندھے ضابطہ پر چل رہی ہے - یہاں کوئی سعی محض پاکیزہ خواہشات اور اچھی نیتوں کی بنا پہ کامیاب نہیں ہو سکتی اور نہ محض نفوس قدسیہ کی برکتیں ہی اس کو بار آور کر سکتی ہیں، بلکہ اس کے لئے اُن شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے جو ایسی مساعی کی بار آوری کے لئے قانونِ الٰہی میں مقرر ہیں - آپ اگر زراعت کریں تو خواہ آپ کتنے ہی بزرگ صفت انسان ہوں اور تسبیح و تہلیل میں کتنا ہی مبالغہ کرتے ہوں، لیکن آپ کا پھینکا ہوا کوئی بیج بھی برگ و بار نہیں لا سکتا جب تک آپ اپنی سعی کاشتکاری میں اس "قانون" کی پوری پوری پابندی ملحوظ نہ رکھیں جو اللہ تعالیٰ نے کھیتوں کی بار آوری کے لئے مقرر کر دیا ہے اسی طرح نظامِ امامت کا وہ انقلاب بھی جو اس وقت آپ کے پیشِ نظر ہے، کبھی محض دعاؤں اور پاک تمناؤں سے رُونما نہ ہو سکے گا بلکہ اس کے لئے بھی ناگزیر ہے کہ آپ اس "قانون" کو سمجھیں اور اُس کی ساری شرطیں پوری کریں جس کے تحت دنیا میں "امامت" قائم ہوتی ہے، کسی کو ملتی ہے اور کسی سے چھنتی ہے اگرچہ اس سے پہلے بھی میں اس مضمون کو اپنی تحریروں اور تقریروں میں اشارۃً بیان کرتا رہا ہوں، لیکن آج میں اُسے مزید تفصیل و تشریح کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں، کیونکہ یہ وہ مضمون ہے جسے پوری طرح سمجھے بغیر ہمارے سامنے اپنی راہ عمل واضح نہیں ہو سکتی -

انسان کی ہستی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے اندر دو

مختلف حیثیتیں پائی جاتی ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں اور باہم دگر ملی جُلی بھی۔

۹ اس کی ایک حیثیت تو یہ ہے کہ وہ اپنا ایک طبعی و حیوانی وجود رکھتا ہے جس پر وہی قوانین جاری ہوتے ہیں جو تمام طبعیات و حیوانات پر فرمانروائی کر رہے ہیں۔ اس وجود کی کارکردگی منحصر ہے اُن آلات و وسائل پر، ان مادی ذرائع پر، اور اُن طبعی حالات پر جن پر دوسری تمام طبعی اور حیوانی موجودات کی کارکردگی کا انحصار ہے۔ یہ وجود جو کچھ کر سکتا ہے قوانین طبعی کے تحت، آلات و وسائل کے ذریعہ سے اور طبعی حالات کے اندر ہی رہتے ہوئے کر سکتا ہے اور اس کے کام پر عالمِ اسباب کی تمام قوتیں مخالف یا موافق اثر ڈالتی ہیں۔

دوسری حیثیت جو انسان کے اندر نمایاں نظر آتی ہے وہ اس کے انسان ہونے یا بالفاظِ دیگر ایک اخلاقی وجود ہونے کی حیثیت ہے۔ یہ اخلاقی وجود طبعیات کا تابع نہیں ہے بلکہ ان پر ایک طرح سے حکومت کرتا ہے۔ یہ خود انسان کے طبعی و حیوانی وجود کو بھی آلے کے طور پر استعمال کرتا ہے اور خارجی دُنیا کے اسباب کو بھی اپنا تابع بنانے اور اُن سے کام لینے کی کوشش کرتا ہے اس کی کارکُن قوتیں وُہ اخلاقی اوصاف ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انسان میں ودیعت فرمائے ہیں، اور اس پر فرمانروائی بھی طبعی قوانین کی نہیں بلکہ اخلاقی قوانین کی ہے

انسانی عروج و زوال کا مدار اخلاق پر ہے

یہ دونوں حیثیتیں انسان کے اندر ملی جُلی کام کر رہی ہیں اور مجموعی طور پر

اُس کی کامیابی و ناکامی اور اُس کے عروج و زوال کا مدار مادی اور اخلاقی دونوں قسم کی قوتوں پر ہے۔ وہ بے نیاز تو نہ مادی قوت ہی سے ہو سکتا ہے اور نہ اخلاقی قوت ہی سے۔ اسے عروج ہوتا ہے تو دونوں کے بل پر ہوتا ہے اور وہ گرتا ہے تو اُسی وقت گرتا ہے جب یہ دونوں طاقتیں اس کے ہاتھ سے جاتی رہتی ہیں، یا ان میں وہ دوسروں کی بہ نسبت کمزور ہو جاتا ہے، لیکن اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ انسانی زندگی میں اصل فیصلہ کُن اہمیت اخلاقی طاقت کی ہے نہ کہ مادی طاقت کی۔ اس میں شک نہیں کہ مادی وسائل کا حصول طبعی ذرائع کا استعمال اور اسبابِ خارجی کی موافقت بھی کامیابی کے لئے شرط لازم ہے اور جب تک انسان اس عالمِ طبعی ر ہیں رہتا ہے یہ شرط کسی طرح ساقط نہیں ہو سکتی، مگر وہ اصل چیز جو انسان کو گراتی اور اٹھاتی ہے اور جسے اُس کی قسمت کے بنانے اور بگاڑنے میں سب سے بڑھ کر دخل حاصل ہے، وہ اخلاقی طاقت ہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم جس چیز کی وجہ سے انسان کو انسان کہتے ہیں وہ اُس کی جسمانیت یا حیوانیت نہیں بلکہ اُس کی اخلاقیت ہے، آدمی دوسری موجودات سے جس خصوصیت کی بنا پر ممیز ہوتا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ جگہ گھیرتا ہے یا سانس لیتا ہے یا نسل کشی کرتا ہے بلکہ اس کی وہ امتیازی خصوصیت جو اُسے ایک مستقل نوع ہی نہیں، خلیفۃ اللہ فی الارض بناتی ہے، وہ اُس کا اخلاقی اختیار اور اخلاقی ذمہ داری کا حامل ہونا ہے۔ پس جب اصل جوہرِ انسانیت اخلاق ہے تو لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ اخلاقیات ہی کو انسانی زندگی کے بناؤ اور بگاڑ میں فیصلہ کُن مقام حاصل ہے اور اخلاقی قوانین ہی انسان کے عروج و

زوال پر فرمانروا ہیں۔

اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد جب ہم اخلاقیات کا تجزیہ کرتے ہیں تو وہ اصولی طور پر ہمیں دو بڑے شعبوں میں منقسم نظر آتے ہیں۔

ایک بنیادی انسانی اخلاقیات، دوسرے اسلامی اخلاقیات۔

بنیادی انسانی اخلاقیات

بنیادی انسانی اخلاقیات سے مراد وہ اوصاف ہیں جن پر انسان کے اخلاقی وجود کی اساس قائم ہے، اور ان میں وہ تمام صفات شامل ہیں جو دنیا میں انسان کی کامیابی کے لئے بہر حال شرط لازم ہیں خواہ وہ صحیح مقصد کے لئے کام کر رہا ہو یا غلط مقصد کے لئے۔ ان اخلاقیات میں اس سوال کا کوئی دخل نہیں ہے کہ آدمی خدا اور وحی اور رسول اور آخرت کو مانتا ہے یا نہیں۔ طہارتِ نفس اور نیّتِ خیر اور عملِ صالح سے آراستہ ہے یا نہیں، اچھے مقصد کے لئے کام کر رہا ہے، یا بُرے مقصد کے لئے۔ قطع نظر اس سے کہ کسی میں ایمان ہو یا نہ ہو، اور اُس کی زندگی پاک ہو یا ناپاک، اور اس کی سعی کا مقصد اچھا ہو یا بُرا، جو شخص اور جو گروہ بھی اپنے اندر وہ اوصاف رکھتا ہوگا جو دُنیا میں کامیابی کے لئے ناگزیر ہیں وہ یقیناً کامیاب ہوگا اور اُن لوگوں سے بازی لے جائے گا جو ان اوصاف کے لحاظ سے اس کے مقابلہ میں ناقص ہونگے۔

مومن ہو یا کافر، نیک ہو یا بد، مصلح ہو یا مُفسد، غرض جو بھی ہو، وہ اگر کارگر انسان ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں جبکہ اُس کے اندر ارادے کی

طاقت اور فیصلے کی قوت ہو، عزم اور حوصلہ ہو، صبر و ثبات اور استقلال ہو، تحمل اور برداشت ہو، ہمت اور شجاعت ہو، مستعدی اور جفاکشی ہو، اپنے مقصد کا عشق اور اس کے لئے ہر چیز قربان کر دینے کا بل بوتا ہو، حزم و احتیاط اور معاملہ فہمی و تدبر ہو، حالات کو سمجھنے اور ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے اور مناسب تدبیر کرنے کی قابلیت ہو، اپنے جذبات و خواہشات اور ہیجانات پر قابو ہو، اور دوسرے انسانوں کو موہنے اور ان کے دل میں جگہ پیدا کرنے اور اُن سے کام لینے کی صلاحیت ہو

پھر ناگزیر ہے کہ اُس کے اندر وہ شریفانہ خصائل بھی کچھ نہ کچھ موجود ہوں جو فی الحقیقت جوہرِ آدمیت ہیں اور جن کی بدولت آدمی کا وقار و اعتبار دنیا میں قائم ہوتا ہے، مثلاً خودداری، فیاضی، رحم، ہمدردی، انصاف، وسعتِ قلب و نظر، سچائی، امانت، راستبازی، پاسِ عہد، معقولیت، اعتدال، شائستگی، طہارت و نظافت اور ذہن و نفس کا انضباط۔

یہ اوصاف اگر کسی قوم یا گروہ کے بیشتر افراد میں موجود ہوں تو گویا یوں سمجھئے کہ اس کے پاس وُہ سرمایۂ انسانیت موجود ہے جس سے ایک طاقتور اجتماعیت وجود میں آسکتی ہے۔ لیکن یہ سرمایہ مجتمع ہو کر بالفعل ایک مضبوط و مستحکم اور کارگر اجتماعی طاقت نہیں بن سکتا جب تک کچھ دوسرے اخلاقی اوصاف بھی اس کی مدد پر نہ آئیں، مثلاً تمام یا بیشتر افراد کسی اجتماعی نصب العین پر متفق ہوں اور اس نصب العین کو اپنی انفرادی اغراض بلکہ اپنی جان، مال اور اولاد سے بھی عزیز تر رکھیں، ان کے اندر آپس کی محبت اور ہمدردی ہو، انہیں مل کر کام کرنا آتا ہو، وہ اپنی خودی و نفسانیت کو کم از کم اس حد تک قربان کر سکیں جو منظم سعی کے لئے

ناگزیر ہے، وہ صحیح و غلط رہنماؤں میں تمیز کر سکتے ہوں اور موزوں آدمیوں ہی کو اپنا رہنما بنائیں، اُن کے رہنماؤں میں اخلاص اور حُسنِ تدبیر اور رہنمائی کی دوسری ضروری صفات موجود ہوں، اور خود قوم یا جماعت اپنے رہنماؤں کی اطاعت کرنا جانتی ہو، ان پر اعتماد رکھتی ہو، اور اپنے تمام ذہنی، جسمانی، اور مادّی ذرائع اُن کے تصرف میں دے دینے پر تیار ہو۔ نیز پوری قوم کے اندر ایسی زندہ اور حسّاس رائے عام پائی جاتی ہو جو کسی ایسی چیز کو اپنے اندر پنپنے نہ دے جو اجتماعی فلاح کے لئے نقصان دہ ہو۔

یہ ہیں وہ اخلاقیات جن کو میں "بنیادی انسانی اخلاقیات" کے لفظ سے تعبیر کرتا ہوں، کیونکہ فی الواقع یہی اخلاقی اوصاف انسان کی اخلاقی طاقت کا اصل منبع ہیں اور انسان کسی مقصد کے لئے بھی دُنیا میں کامیاب سعی نہیں کر سکتا جب تک کہ ان اوصاف کا زور اس کے اندر موجود نہ ہو۔ ان اخلاقیات کی مثال ایسی ہے جیسے فولاد کہ وہ اپنی ذات میں مضبوطی و استحکام رکھتا ہے اور اگر کوئی کارگر ہتھیار بن سکتا ہے تو اسی سے بن سکتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ غلط مقصد کے لئے استعمال ہو یا صحیح مقصد کے لئے۔ آپ کے پیشِ نظر صحیح مقصد ہو تب بھی آپ کے لئے مفید وہی ہتھیار ہو سکتا ہے جو فولاد سے بنا ہو نہ کہ سڑی ہوئی پھُس پھُسی لکڑی سے جو ایک ذرا سے بوجھ اور معمولی سی چوٹ کی تاب بھی نہ لا سکتی ہو۔ یہی وہ بات ہے جسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے کہ خیارکم فی الجاھلیۃ خیارکم فی الاسلام۔ "تم میں جو لوگ جاہلیت میں اچھے تھے وہی اسلام میں بھی اچھے ہیں"۔ یعنی زمانہ جاہلیت میں جو لوگ اپنے اندر جوہرِ قابل رکھتے تھے وہی

زمانۂ اسلام میں مردانِ کار ثابت ہوئے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان کی قابلیتیں پہلے غلط راہوں میں صرف ہو رہی تھیں اور اسلام نے آکر انہیں صحیح راہ پر لگا دیا۔ مگر بہر حال ناکارہ انسان نہ جاہلیت کے کسی کام کے تھے نہ اسلام کے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں جو زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور جس کے اثرات تھوڑی ہی مدت گزرنے کے بعد دریائے سندھ سے لیکر اٹلانٹک کے ساحل تک دنیا کے ایک بڑے حصہ نے محسوس کر لئے، اس کی وجہ یہی تو تھی کہ آپ کو عرب میں بہترین انسانی مواد مل گیا تھا جس کے اندر کیرکٹر کی زبردست طاقت موجود تھی۔ اگر خدانخواستہ آپ کو بودے، کم ہمت، ضعیف الارادہ اور ناقابلِ اعتماد لوگوں کی بھیڑ مل جاتی تو کیا پھر بھی وہ نتائج نکل سکتے تھے؟

اسلامی اخلاقیات

اب اخلاقیات کے دوسرے شعبہ کو لیجئے جسے میں "اسلامی اخلاقیات" کے لفظ سے تعبیر کر رہا ہوں۔ یہ بنیادی انسانی اخلاقیات سے الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اسی کی تصحیح اور تکمیل ہے۔

اسلام کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ بنیادی انسانی اخلاقیات کو ایک صحیح مرکز و محور مہیا کر دیتا ہے جس سے وابستہ ہو کر وہ سراپا خیر بن جاتے ہیں۔ اپنی ابتدائی صورت میں تو یہ اخلاقیات مجرد ایک قوت ہیں جو خیر بھی ہو سکتی ہیں اور شر بھی۔ جس طرح تلوار کا حال ہے کہ وہ بس ایک کاٹ ہے جو ڈاکو کے ہاتھ میں جاکر آلۂ ظلم بھی بن سکتی ہے اور مجاہد فی سبیل اللہ کے ہاتھ میں جاکر وسیلۂ خیر بھی، اسی طرح اُن اخلاقیات کا بھی کسی شخص یا گروہ میں ہونا بجائے خود خیر نہیں ہے بلکہ اس کا خیر ہونا موقوف ہے اس امر

پر کہ یہ قوت صحیح راہ میں صرف ہو اور اُس کو صحیح راہ پر لگانے کی خدمت اسلام انجام دیتا ہے۔ اسلام کی دعوتِ توحید کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دُنیا کی زندگی میں انسان کی تمام کوششوں اور محنتوں کا اور اُس کی دوڑ دھوپ کا مقصد وحید اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہو۔[1] وَاِلَیْکَ نَسْعٰی وَنَحْفِدُ۔ اور اس کا پورا دائرۂ فکر و عمل اُن حدود سے محدود ہو جائے جو اللہ نے اس کے لئے مقرر کر دی ہیں۔[2] اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَلَکَ نُصَلِّیْ وَنَسْجُدُ،

اِس اساسی اصلاح کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمام بنیادی اخلاقیات جن کا ابھی میں نے آپ سے ذکر کیا ہے صحیح راہ پر لگ جاتے ہیں اور وہ قوت جو اِن اخلاقیات کی موجودگی سے پیدا ہوتی ہے، بجائے اس کے کہ نفس یا خاندان یا قوم یا ملک کی سربلندی پر ہر ممکن طریقہ سے صرف ہو، خالص حق کی سربلندی پر صرف جائز طریقوں ہی سے صرف ہونے لگتی ہے۔ یہی چیز اُس کو ایک مجرّد قوت کے مرتبہ سے اُٹھا کر ایجاباً ایک بھلائی اور دنیا کے لئے ایک رحمت بنا دیتی ہے۔

دوسرا کام جو اخلاق کے باب میں اسلام کرتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بنیادی انسانی اخلاقیات کو مستحکم بھی کرتا ہے اور پھر اِن کے اطلاق کو انتہائی حدود تک وسیع بھی کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر صبر کو لیجئے۔ بڑے سے بڑے صابر آدمی میں بھی جو صبر دُنیوی اغراض کے لئے ہو اور جسے شرک یا مادّہ پرستی کی فکری جڑوں سے غذا مل رہی ہو اُس کی برداشت اور اس کے ثبات و قرار کی بس ایک حد ہوتی ہے جس کے بعد وہ گھبرا اُٹھتا ہے۔ لیکن جس صبر کو توحید کی جڑ سے غذا ملے اور جو دُنیا کے لئے نہیں بلکہ اللہ

---

[1] خدایا، ہماری ساری کوششیں اور ساری دوڑ دھوپ تیری ہی خوشنودی کے لئے ہے۔

[2] خدایا ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور تیرے ہی لئے نماز اور سجدہ کرتے ہیں۔

ربُّ العالمین کے لئے ہو، وہ تحمّل و برداشت اور پامردی کا ایک انتھاہ خزانہ ہوتا ہے جسے دُنیا کی تمام ممکن مشکلات مل کر بھی لوٹ نہیں سکتیں پھر غیر مسلم کا صبر نہایت محدود نوعیت کا ہوتا ہے۔ اُس کا حال یہ ہوتا ہے کہ ابھی تو گولوں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں نہایت استقلال کے ساتھ ڈٹا ہوا تھا اور ابھی جو جذبات شہوانی کی تسکین کا کوئی موقع سامنے آیا تو نفس امارہ کی ایک معمولی تحریک کے مقابلہ میں بھی نہ ٹھہر سکا لیکن اسلام صبر کو انسان کی پوری زندگی میں پھیلا دیتا ہے اور اسے صرف چند مخصوص قسم کے خطرات، مصائب اور مشکلات ہی کے مقابلہ میں نہیں بلکہ ہر اُس لالچ، ہر اُس خوف، ہر اُس اندیشے اور ہر اُس خواہش کے مقابلہ میں ٹھہراؤ کی ایک زبردست طاقت بنا دیتا ہے جو آدمی کو راہ راست سے ہٹانے کی کوشش کرے۔ درحقیقت اسلام مومن کی پوری زندگی کو ایک صابرانہ زندگی بناتا ہے جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ عمر بھر صحیح طرزِ خیال اور صحیح طرزِ عمل پر قائم رہو خواہ اس میں کتنے ہی خطرات و نقصانات اور مشکلات ہوں اور اس دُنیا کی زندگی میں اس کا کوئی مفید نتیجہ نکلتا نظر نہ آئے اور کبھی فکر و عمل کی برائی نہ اختیار کرو خواہ فائدوں اور اُمیدوں کا کیسا ہی خوشنما سبز باغ تمہارے سامنے لہلہا رہا ہو۔ یہ آخرت کے قطعی نتائج کی توقع پر دُنیا کی ساری زندگی میں بدی سے رُکنا اور خیر کی راہ پر جم کر چلنا اسلامی صبر ہے اور اس کا ظہور لازماً ان شکلوں میں بھی ہوتا ہے جو بہت محدود پیمانہ پر کفار کی زندگی میں نظر آتی ہیں۔ اسی مثال پر دوسرے تمام بنیادی اخلاقیات کو بھی آپ قیاس کر سکتے ہیں جو کفار کی زندگی میں صحیح فکری بنیاد نہ ہونے کی وجہ سے ضعیف اور محدود ہوتے ہیں اور اسلام ان سب کو ایک صحیح بنیاد دے کر محکم بھی کرتا ہے اور وسیع

بھی کر دیتا ہے۔

اسلام کا تیسرا کام یہ ہے کہ وہ بنیادی اخلاقیات کی ابتدائی منزل پر اخلاقِ فاضلہ کی ایک نہایت شاندار بالائی منزل تعمیر کرتا ہے جس کی بدولت انسان اپنے شرف کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے۔ وہ اس کے نفس کو خود غرضی سے، نفسانیت سے، ظلم سے، بیحیائی اور خلاعت و بے قیدی سے پاک کر دیتا ہے، اس میں خدا ترسی تقویٰ و پرہیزگاری اور حق پرستی پیدا کرتا ہے، اُس کے اندر اخلاقی ذمہ داریوں کا شعور و احساس اُبھارتا ہے، اُس کو ضبطِ نفس کا خوگر بناتا ہے، اسے تمام مخلوقات کے لئے کریم، فیاض، رحیم، ہمدرد، امین، بے غرض، خیر خواہ، بے لوث منصف، اور ہر حال میں صادق و راست باز بنا دیتا ہے۔ اور اُس میں ایک ایسی بلند پایہ سیرت پرورش کرتا ہے جس سے ہمیشہ صرف بھلائی ہی متوقع ہو اور بُرائی کا کوئی اندیشہ نہ ہو، پھر اسلام آدمی کو محض نیک ہی بنانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ حدیثِ رسول کے الفاظ میں وہ اسے مِفْتَاحٌ لِلْخَيْرِ مِغْلَاقٌ لِلشَّرِ یعنی بھلائی کا دروازہ کھولنے والا اور بُرائی کا دروازہ بند کرنے والا بناتا ہے، یعنی وہ ایجاباً یہ مشن اُس کے سپرد کرتا ہے کہ دُنیا میں بھلائی پھیلائے اور بُرائی کو روکے۔ اس سیرت و اخلاق میں فطرتاً وہ حُسن ہے، وہ کشش ہے، وہ بلا کی قوتِ تسخیر ہے کہ اگر کوئی منظم جماعت اِس سیرت کی حامل ہو اور عملاً اپنے اُس مشن کے لئے سعی کرے جو اسلام نے اُس کے سپرد کیا ہے، تو اس کی جہانگیری کا مقابلہ کرنا دنیا کی کسی قوت کے بس کا کام نہیں ہے

سُنّتُ اللہ دربابِ امامت کا خلاصہ

اب میں چند الفاظ میں اُس سنت اللہ کو بیان کئے دیتا

ہوں جو امامت کے باب میں ابتدائے آفرینش سے جاری ہے اور جب تک نوع انسانی اپنی موجودہ فطرت پر زندہ ہے اُس وقت تک برابر جاری رہے گی، اور وہ یہ ہے کہ:-

اگر دُنیا میں کوئی منظم انسانی گروہ ایسا موجود نہ ہو جو اسلامی اخلاقیات اور بنیادی انسانی اخلاقیات دونوں سے آراستہ ہو اور پھر مادی اسباب و وسائل بھی استعمال کرے تو دُنیا کی امامت و قیادت، لا محالہ کسی ایسے گروہ کے قبضہ میں دے دی جاتی ہے جو بنیادی انسانی اخلاقیات اور مادی اسباب و وسائل کے اعتبار سے دوسروں کی بہ نسبت زیادہ بڑھا ہوا ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ بہر حال اپنی دُنیا کا انتظام چاہتا ہے۔ اور یہ انتظام اُسی گروہ کے سپرد کیا جاتا ہے جو موجود الوقت گروہوں میں اہل تر ہو۔

لیکن اگر کوئی منظم گروہ ایسا موجود ہو جو اسلامی اخلاقیات اور بنیادی انسانی اخلاقیات دونوں میں باقی ماندہ انسانی دُنیا پر فضیلت رکھتا ہو اور وہ مادّی اسباب و وسائل کے استعمال میں بھی کوتاہی نہ کرے، تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا گروہ دُنیا کی امامت و قیادت پر قابض رہ سکے۔ ایسا ہونا فطرت کے خلاف ہے، اللہ کی اُس سنت کے خلاف ہے جو انسانوں کے معاملہ میں اُس نے مقرر کر رکھی ہے، اُن وعدوں کے خلاف ہے جو اللہ نے اپنی کتاب میں مومنین صالحین سے کئے ہیں، اور اللہ ہر گز فساد پسند نہیں کرتا کہ اس کی دُنیا میں ایک صالح گروہ انتظامِ عالم کو ٹھیک اُس کی رضا کے مطابق دُرست رکھنے والا موجود ہو اور پھر بھی وہ مفسدوں ہی کے ہاتھ میں اس انتظام کی باگ ڈور رہنے دے۔

مگر یہ خیال رہے کہ اس نتیجہ کا ظہور صرف اُسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ

ایک جماعتِ صالحہ ان اوصاف کی موجود ہو۔ کسی ایک صالح فرد، یا متفرق طور پر بہت سے صالح افراد کے موجود ہونے سے استخلاف فی الارض کا نظام تبدیل نہیں ہو سکتا، خواہ وہ افراد اپنی جگہ کیسے ہی زبردست اولیاء اللہ بلکہ پیغمبر ہی کیوں نہ ہوں، اللہ نے استخلاف کے متعلق جتنے وعدے بھی کئے ہیں، منتشر و متفرق افراد سے نہیں، بلکہ ایک ایسی جماعت سے کئے ہیں جو دنیا میں اپنے آپ کو عملاً خَیْرُ اُمَّۃٍ اور اُمَّۃً وَّسَطًا ثابت کر دے۔

نیز یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ایسے ایک گروہ کے محض وجود میں آجانے ہی سے نظامِ امامت میں تغیّر واقع نہ ہو جائے گا کہ ادھر وہ بنے اور ادھر اچانک آسمان سے کچھ فرشتے اتریں اور فسّاق و فجار کو اقتدار کی گدّی سے ہٹا کر انہیں مسند نشین کر دیں، بلکہ اس جماعت کو کفر و فسق کی طاقتوں سے زندگی کے ہر میدان میں ہر ہر قدم پر کشمکش اور مجاہدہ کرنا ہوگا اور اقامتِ حق کی راہ میں ہر قسم کی قربانیاں دے کر اپنی محبّتِ حق اور اپنی اہلیّت کا ثبوت دینا پڑیگا یہ ایسی شرط ہے جس سے انبیاء تک مستثنیٰ نہ رکھے گئے کجا کہ آج کوئی اس سے مستثنیٰ ہونے کی توقع کرے۔

بنیادی اخلاقیات اور اسلامی اخلاقیات کی طاقت کا فرق

مادّی طاقت اور اخلاقی طاقت کے تناسب کے باب میں قرآن اور تاریخ کے غائر مطالعہ سے جو سُنّت اللہ میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ جہاں اخلاقی طاقت کا سارا انحصار صرف بنیادی انسانی اخلاقیات پر ہو وہاں مادّی وسائل بڑی

اہمیت رکھتے ہیں، حتیٰ کہ اس امر کا بھی امکان ہے کہ اگر ایک گروہ کے پاس مادّی وسائل کی طاقت بہت زیادہ ہو تو وہ تھوڑی اخلاقی طاقت سے بھی دُنیا پر چھا جاتا ہے اور دوسرے گروہ اخلاقی طاقت میں فائق تر ہونے کے باوجود محض وسائل کی کمی کے باعث دبے رہتے ہیں۔ لیکن جہاں اخلاقی طاقت میں اسلامی اور بنیادی دونوں قسم کے اخلاقیات کا پورا زور شامل ہو وہاں مادّی وسائل کی انتہائی کمی کے باوجود اخلاق کو آخر کار ان تمام طاقتوں پر غلبہ حاصل ہو کر رہتا ہے جو مجرّد بنیادی اخلاقیات اور مادّی سرو سامان کے بل بوتے پر اُٹھی ہوں۔ اس نسبت کو یوں سمجھئے کہ بنیادی اخلاقیات کے ساتھ اگر سو درجے مادّی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے تو اسلامی اور بنیادی اخلاقیات کی مجموعی قوّت کے ساتھ صرف ۲۵ درجے مادّی طاقت کافی ہو جاتی ہے، باقی ۷۵ فیصدی قوت کی کمی کو محض اسلامی اخلاق کا زور پورا کر دیتا ہے۔ بلکہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے عہد کا تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ اسلامی اخلاق اگر اُس پیمانہ کا ہو جو حضور اور آپ کے صحابہ کا تھا تو صرف پانچ فیصدی مادّی طاقت سے بھی کام چل جاتا ہے یہی حقیقت ہے جس کی طرف آیت[1] اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

یہ آخری بات جو میں نے عرض کی ہے اُسے محض خوش عقیدگی پر محمول نہ کیجئے اور نہ یہ گمان کیجئے کہ میں کسی معجزہ و کرامت کا آپ سے ذکر کر رہا ہوں نہیں، یہ بالکل فطری حقیقت ہے جو اسی عالمِ اسباب میں قانونِ علت و معلول کے تحت پیش آتی ہے اور ہر وقت رونما ہو سکتی ہے۔ اگر اس کی علت

[1] اگر تم میں سے بیس صابر آدمی ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے (الانفال رکوع ۹)

موجود ہو۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ آگے بڑھنے سے پہلے چند الفاظ میں اس کی تشریح کر دوں کہ اسلامی اخلاقیات سے جن میں بنیادی اخلاقیات خود بخود شامل ہیں، مادی اسباب کی پچھتر فیصدی تک بلکہ ۹۵ فیصدی تک کمی کس طرح پوری ہو جاتی ہے۔

اس چیز کو سمجھنے کے لئے آپ ذرا خود اپنے زمانہ ہی کی بین الاقوامی صورت حال پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھئے۔ ابھی آپ کے سامنے وہ فسادِ عظیم جو آج سے ساڑھے پانچ سال پہلے شروع ہوا تھا، جرمنی کی شکست پر ختم ہوا ہے اور جاپان کی شکست بھی قریب نظر آ رہی ہے۔ جہاں تک بنیادی اخلاقیات کا تعلق ہے اُن کے اعتبار سے اس فساد کے دونوں فریق تقریباً مساوی ہیں، بلکہ بعض پہلوؤں سے جرمنی اور جاپان نے اپنے حریفوں کے مقابلہ میں زیادہ زبردست اخلاقی طاقت کا ثبوت دیا ہے۔ جہاں تک علومِ طبیعی اور اُن کے عملی استعمال کا تعلق ہے اس میں بھی دونوں فریق برابر ہیں، بلکہ اس معاملہ میں کم از کم جرمنی کی فوقیت تو کسی سے مخفی نہیں ہے۔ مگر صرف ایک چیز ہے جس میں ایک فریق دوسرے فریق سے بہت زیادہ بڑھا ہوا ہے، اور وہ ہے مادی اسباب کی موافقت اس کے پاس آدمی اپنے دونوں حریفوں سے کئی گنے زیادہ ہیں۔ اس کو مادی وسائل ان کی نسبت بدرجہا زیادہ حاصل ہیں، اُس کی جغرافی پوزیشن اُن سے بہتر ہے، اور اس کو تاریخی اسباب نے اُن کے مقابلہ میں بہت زیادہ بہتر حالات فراہم کر دیئے ہیں۔ اسی وجہ سے اس کو فتح نصیب ہوئی ہے اور اسی وجہ سے آج کسی ایسی قوم کے لئے بھی، جس کی تعداد کم ہو اور جس کی دسترس میں مادی وسائل کم

ہوں، اس امر کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ وہ کثیر التعداد اور کثیر الوسائل قوموں کے مقابلہ میں سر اٹھا سکے، خواہ وہ بنیادی اخلاقیات میں اور طبیعی علوم کے استعمال میں اِن سے کچھ بڑھ ہی کیوں نہ جائے۔ اس لئے کہ بنیادی اور اخلاق اور طبیعی علوم کے بل پر اُٹھنے والی قوم کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہو سکتا، یا تو وہ خود اپنی قومیت کی پرستار ہوگی اور دُنیا کو اپنے لئے مسخر کرنا چاہے گی، یا پھر وہ کچھ عالمگیر اصُولوں کی حامی بنکر اُٹھے گی اور دوسری قوموں کو اُن کی طرف دعوت دے گی۔ پہلی صورت میں تو اُس کے لئے کامیابی کی کوئی شکل بجز اس کے ہے ہی نہیں کہ وہ مادی طاقت اور وسائل میں دوسروں سے فائق تر ہو، کیونکہ وہ تمام قومیں جن پر اُس کی اس حرص واقتدار کی زد پڑ رہی ہوگی، انتہائی غصہ و نفرت کے ساتھ اس کی مزاحمت کریں گی، اور اس کا راستہ روکنے میں اپنی حد تک کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گی، رہی دوسری صورت تو اس میں بلاشبہ اس کا امکان تو ضرور ہے کہ قوموں کے دل اور دماغ خود بخود اس کی اصُولی دعوت سے مسخر ہوتے چلے جائیں اور اسے مزاحمتوں کو راستے سے ہٹانے میں بہت تھوڑی قوت استعمال کرنی پڑے، لیکن یہ یاد رہنا چاہیئے کہ دل صرف چند خوش آئند اصُولوں ہی سے مسخر نہیں ہو جایا کرتے بلکہ انہیں مسخر کرنے کے لئے وہ حقیقی خیر خواہی، نیک نیتی، راستبازی، بے غرضی، فراخدلی، فیاضی، ہمدردی اور شرافت وعدالت درکار ہے جو جنگ اور صلح، فتح اور شکست، دوستی اور دشمنی، تمام حالات کی کڑی آزمائشوں میں کھری اور بے لوث ثابت ہو، اور یہ چیز اخلاق فاضلہ کی اس بلند منزل سے تعلق رکھتی ہے جس کا مقام بنیادی اخلاقیات سے بہت برتر ہے، یہی وجہ ہے کہ مجرد بنیادی اخلاقیات اور مادی طاقت کے بل پر اُٹھنے والے خواہ کُھلے

قوم پرست ہوں یا پوشیدہ قوم پرستی کے ساتھ کچھ عالمگیر اصُولوں کی دعوت وحمایت کا ڈھونگ رچائیں، آخر کار اُن کی ساری جدوجہد اور کشمکش خالص شخصی یا طبقاتی یا قومی خودغرضی ہی پر آٹھیرتی ہے، جیسا کہ آج آپ امریکہ، برطانیہ اور روس کی سیاست خارجیہ میں نمایاں طور پر دیکھ سکتے ہیں۔ ایسی کشمکش میں یہ ایک بالکل فطری امر ہے کہ ہر قوم دوسری قوم کے مقابلہ میں ایک مضبوط چٹان بن کر کھڑی ہو جائے اور اپنی پوری اخلاقی ومادی طاقت اُس کی مزاحمت میں صرف کر دے اور اپنے حدود میں اُس کو ہرگز راہ دینے کے لئے تیار نہ ہو جب تک کہ مخالف کی برتر مادی قوت اُس کو پیس کر نہ رکھ دے۔

اچھا، اب ذرا تصور کیجئے کہ اسی ماحول میں ایک ایسا گروہ (خواہ وہ ابتداءً ایک ہی قوم میں سے اُٹھا ہو، مگر "قوم" کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک "جماعت" کی حیثیت سے اُٹھا ہو) پایا جاتا ہے، جو شخصی، طبقاتی اور قومی خودغرضیوں سے بالکل پاک ہے، اُس کی سعی وجہد کی کوئی غرض اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ نوع انسانی کی فلاح چند اصُولوں کی پیروی میں دیکھتا ہے اور انسانی زندگی کا نظام ان پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ اُن اصولوں پر جو سوسائٹی وہ بناتا ہے اُس میں قومی ووطنی اور طبقاتی ونسلی امتیازات بالکل مفقود ہیں، تمام انسان اس میں یکساں حقوق اور مساوی حیثیت سے شامل ہو سکتے ہیں۔ اس میں رہنمائی وقیادت کا منصب ہر اس شخص یا مجموعۂ اشخاص کو حاصل ہو سکتا ہے جو ان اصُولوں کی پیروی میں سب پر فوقیت لے جائے قطع نظر اس سے کہ اس کی نسلی ووطنی قومیت کچھ ہی ہو، حتیٰ کہ اس میں اس امر کا بھی امکان ہے کہ اگر مفتوح ایمان لا کر اپنے آپ کو صالح تر ثابت کر دے تو فاتح اپنی سرفروشیوں اور

جانفشانیوں کے سارے ثمرات اُس کے قدموں میں لاکر رکھدے اور اس کو امام مان کر خود مقتدی بننا قبول کرلے۔ یہ گروہ جب اپنی دعوت لے کر اُٹھتا ہے تو وہ لوگ جو اس کے اصولوں کو چلنے دینا نہیں چاہتے، اس کی مزاحمت کرتے ہیں اور اس طرح فریقین میں کشمکش شروع ہو جاتی ہے، مگر اس کشمکش میں جتنی شدت بڑھتی جاتی ہے یہ گروہ اپنے مخالفوں کے مقابلہ میں اُتنے ہی زیادہ افضل و اشرف اخلاق کا ثبوت دیتا چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے طرزِ عمل سے ثابت کر دیتا ہے کہ واقعی وہ خلق اللہ کی بھلائی کے سوا کوئی دوسری غرض پیش نظر نہیں رکھتا، اس کی دشمنی اپنے مخالفوں کی ذات یا قومیت سے نہیں بلکہ صرف اُن کی ضلالت و گمراہی سے ہے جسے وہ چھوڑ دیں تو وہ اپنے خون کے پیاسے دشمن کو بھی سینے سے لگا سکتا ہے، اور اُسے لالچ اُن کے مال و دولت یا اُن کی تجارت و صنعت کا نہیں بلکہ خود انہی کی اخلاقی و روحانی فلاح کا ہے۔ جو حاصل ہو جائے تو اُن کی دولت اُنہیں کو مبارک رہے، وہ سخت سے سخت آزمائش کے موقعوں پر بھی جھوٹ، دغا اور مکر و فریب سے کام نہیں لیتا، ٹیڑھی چالوں کا جواب بھی سیدھی تدبیروں سے دیتا ہے، انتقام کے جوش میں بھی ظلم و زیادتی پر آمادہ نہیں ہوتا، جنگ کے سخت لمحوں میں بھی اپنے اصولوں کی پیروی نہیں چھوڑتا، جن کی دعوت دینے کے لئے وہ اُٹھا ہے۔ سچائی، وفائے عہد اور حسن معاملت پر ہر حال میں قائم رہتا ہے، بے لاگ انصاف کرتا ہے اور امانت و دیانت کے اُس معیار پر پورا اترتا ہے جسے ابتداً اُس نے دُنیا کے سامنے معیار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ مخالفین کی زانی، شرابی، جواری اور سنگدل و بے رحم فوجوں سے جب اس گروہ کے خدا ترس، پاکباز، عبادت گذار، نیک دل اور رحیم و کریم مجاہدوں کا مقابلہ پیش آتا ہے تو فرداً فرداً ان کی انسانیت اُن کی

درندگی و حیوانیت پر فائق نظر آتی ہے - وہ ان کے پاس زخمی یا قیدی بنکر آتے ہیں - تو یہاں ہر طرف نیکی، شرافت اور پاکیزگیٔ اخلاق کا ماحول دیکھکر اُن کی آلودہ نجاست روحیں بھی پاک ہونے لگتی ہیں - اور یہ وہاں گرفتار ہو کر جاتے ہیں تو ان کا جوہر انسانیت اُس تاریک ماحول میں اور زیادہ چمک اُٹھتا ہے، ان کو کسی علاقہ پر غلبہ حاصل ہوتا ہے تو مفتوح آبادی کو انتقام کی جگہ عفو، ظلم و جور کی جگہ رحم و انصاف، شقاوت کی جگہ ہمدردی، تکبر و نخوت کی جگہ حلم و تواضع، گالیوں کی جگہ دعوتِ خیر، جھوٹے پروپیگنڈوں کی جگہ اصولِ حق کی تبلیغ کا تجربہ ہوتا ہے اور وہ یہ دیکھکر عش عش کرنے لگتے ہیں کہ فاتح سپاہی نہ اُن سے عورتیں مانگتے ہیں، نہ دبے چھپے مال ٹٹولتے پھرتے ہیں، نہ ان کے صنعتی رازوں کا سراغ لگاتے ہیں، نہ اُن کی معاشی طاقت کو کچلنے کی فکر کرتے ہیں نہ اُن کی قومی عزت کو ٹھوکر مارتے ہیں، بلکہ انہیں اگر کچھ فکر ہے تو یہ کہ جو ملک اب اُن کے چارج میں ہے اُس کے باشندوں میں سے کسی کی عصمت خراب نہ ہو، کسی کے مال کو نقصان نہ پہنچے، کوئی اپنے جائز حقوق سے محروم نہ ہو، کوئی بداخلاقی اُن کے درمیان پرورش نہ پا سکے اور اجتماعی ظلم و جور کسی شکل میں بھی وہاں باقی نہ رہے بخلاف اس کے جب فریق مخالف کسی علاقہ میں گھس آتا ہے تو ساری آبادی اُس کی زیادتیوں اور بے رحمیوں سے چیخ اُٹھتی ہے - اب آپ خود ہی اندازہ کرلیں کہ ایسی لڑائی میں قوم پرستانہ لڑائیوں کی بہ نسبت کتنا بڑا فرق واقع ہو جائیگا، ظاہر ہے کہ ایسے مقابلہ میں بالآخر انسانیت کمتر مادی سروسامان کے باوجود اپنے مخالفوں کی آہن پوش حیوانیت کو آخر کار شکست دیکر رہے گی - اخلاق فاضلہ کے ہتھیار توپ و تفنگ سے زیادہ دور مار ثابت ہونگے، عین حالتِ جنگ میں دشمن دوستوں میں تبدیل ہوں گے،

جسموں سے پہلے دل مسخر ہونگے۔ آبادیوں کی آبادیاں لڑے بھڑے بغیر مفتوح ہوجائیں گی
اور یہ صالح گروہ جب ایک مرتبہ مٹھی بھر جمعیت اور تھوڑے سے سروسامان کے ساتھ
اپنا کام شروع کردیگا تو رفتہ رفتہ خود مخالف کیمپ ہی سے اس کو جنرل، سپاہی
ماہرین فنون، اسلحہ، رسد، سامان جنگ سب کچھ حاصل ہوتے چلے جائیں گے۔

یہ جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں یہ نرا قیاس اور اندازہ نہیں ہے بلکہ اگر آپ کے
سامنے نبی صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے دور مبارک کی تاریخی مثال موجود ہو تو
آپ پر واضح ہو جائے گا کہ فی الواقع اس سے پہلے یہی کچھ ہو چکا ہے اور آج بھی یہی
کچھ ہو سکتا ہے، بشرطیکہ کسی میں یہ تجربہ کرنے کی ہمت ہو۔

حضرات! مجھے توقع ہے کہ اس تقریر سے یہ حقیقت آپ کے ذہن نشین ہو گئی ہو گی کہ
طاقت کا اصل منبع اخلاقی طاقت ہے اور اگر دنیا میں کوئی منظم گروہ ایسا موجود ہو جو
بنیادی اخلاقیات کے ساتھ اسلامی اخلاقیات کا زور بھی اپنے اندر رکھتا ہو تو یہ بات
عقلاً محال اور فطرۃً غیر ممکن ہے کہ اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا گروہ دنیا کی امامت
وقیادت پر قابض رہ سکے۔ اس کے ساتھ مجھے اُمید ہے کہ آپ نے یہ بھی اچھی طرح
سمجھ لیا ہو گا کہ مسلمانوں کی موجودہ پست حالی کا اصل سبب کیا ہے۔ ظاہر بات ہے
کہ جو لوگ نہ مادی وسائل سے کام لیں، نہ بنیادی اخلاقیات سے آراستہ ہوں اور نہ
اجتماعی طور پر ان کے اندر اسلامی اخلاقیات ہی پائے جائیں، وہ کسی طرح امامت
کے منصب پر فائز نہیں رہ سکتے۔ خدا کی اٹل بے لاگ سُنّت کا تقاضا یہی ہے کہ
ان پر ایسے کافروں کو ترجیح دی جائے جو اسلامی اخلاقیات سے عاری سہی مگر کم از
کم بنیادی اخلاقیات اور مادی وسائل کے استعمال میں تو ان سے بڑھے ہوئے ہیں،

اور اپنے آپ کو اُن کی بہ نسبت انتظامِ دُنیا کے لئے اہل تر ثابت کر رہے ہیں۔ اس معاملہ میں اگر آپ کو کوئی شکایت ہو تو سنت اللہ سے نہیں بلکہ اپنے آپ سے ہونی چاہیئے اور اس شکایت کا نتیجہ یہ ہونا چاہیئے کہ آپ اب اپنی اس خامی کو دور کرنے کی فکر کریں جس نے آپ کو امام سے مقتدی اور پیش رَو سے پس رو بنا کر چھوڑا ہے

اس کے بعد ضرورت ہے کہ میں صاف اور واضح طریقہ سے آپ کے سامنے اسلامی اخلاقیات کی بنیادوں کو بھی پیش کر دوں، کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ اس معاملہ میں عام طور پر مسلمانوں کے تصورات بُری طرح اُلجھے ہوئے ہیں اور اس اُلجھن کی وجہ سے بہت ہی کم آدمی یہ جانتے ہیں کہ اسلامی اخلاقیات فی الواقع کس چیز کا نام ہے اور اس پہلو سے انسان کی تربیت و تکمیل کے لئے کیا چیزیں کس ترتیب و تدریج کے ساتھ اس کے اندر پرورش کی جانی چاہئیں۔

اسلامی اخلاقیات کے چار مراتب

جس چیز کو ہم اسلامی اخلاقیات سے تعبیر کرتے ہیں وہ قرآن و حدیث کی رُو سے دراصل چار مراتب پر مشتمل ہے:۔ ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان، یہ چاروں مراتب یکے بعد دیگرے اس فطری ترتیب پر واقع ہیں کہ ہر بعد کا مرتبہ پہلے مرتبہ سے پیدا اور لازماً اسی پر قائم ہوتا ہے۔ اور جب تک نیچے والی منزل پختہ و محکم نہ ہو جائے دوسری منزل کی تعمیر کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ اس پوری عمارت میں ایمان کو بنیاد کی حیثیت حاصل ہے، اس بنیاد پر اسلام کی منزل تعمیر ہوتی ہے، پھر اس کے اوپر تقویٰ اور سب سے اوپر احسان کی منزلیں اُٹھتی ہیں۔ ایمان نہ ہو

تو اسلام و تقویٰ یا احسان کا سرے سے کوئی امکان ہی نہیں۔ ایمان کمزور ہو تو اس پر کسی بالائی منزل کا بوجھ نہیں ڈالا جا سکتا، یا ایسی کوئی منزل تعمیر کر بھی دی جائے تو وہ بودی اور متزلزل ہوگی، ایمان محدود ہو تو جتنے حدود میں وہ محدود ہوگا اسلام، تقویٰ اور احسان بھی بس انہیں حدود تک محدود رہیں گے، پس جب تک ایمان پوری طرح صحیح، پختہ اور وسیع نہ ہو، کوئی مردِ عاقل جو دین کا فہم رکھتا ہو اسلام، تقویٰ یا احسان کی تعمیر کا خیال نہیں کر سکتا۔ اسی طرح تقویٰ سے پہلے اسلام اور احسان سے پہلے تقویٰ کی تصحیح، پختگی اور توسیع ضروری ہے لیکن اکثر ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اس فطری و اصولی ترتیب کو نظر انداز کر کے ایمان و اسلام کی تکمیل کے بغیر تقویٰ و احسان کی باتیں شروع کر دیتے ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ افسوسناک یہ ہے کہ بالعموم لوگوں کے ذہنوں میں ایمان و اسلام کا ایک نہایت محدود تصور جاگزیں ہے، اس وجہ سے وہ سمجھتے ہیں کہ محض وضع قطع، لباس، نشست و برخاست، اکل و شرب اور ایسی ہی چند ظاہری چیزوں کو ایک مقرر نقشے پر ڈھال لینے سے تقویٰ کی تکمیل ہو جاتی ہے، اور پھر عبادات میں نوافل و اذکار، اور اوراد و وظائف اور ایسے ہی بعض اعمال اختیار کر لینے سے احسان کا بلند مقام حاصل ہو جاتا ہے، حالانکہ بسا اوقات اسی تقویٰ اور احسان کے ساتھ ساتھ لوگوں کی زندگیوں میں ایسی صریح علامات بھی نظر آتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی ان کا ایمان ہی سرے سے درست اور پختہ نہیں ہوا ہے، یہ غلطیاں جب تک موجود ہیں کسی طرح یہ اُمید نہیں کی جا سکتی کہ ہم اسلامی اخلاقیات کا نصاب پورا کرنے میں کبھی کامیاب ہو سکیں گے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ہمیں ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کے ان چاروں مراتب

کا پورا پورا تصوّر بھی حاصل ہو اور اس کے ساتھ ہم ان کی فطری ترتیب کو بھی اچھّی طرح سمجھ لیں۔

ایمان

اس سلسلے میں سب سے پہلے ایمان کو لیجیے جو اسلامی زندگی کی بنیاد ہے، ہر شخص جانتا ہے کہ توحید و رسالت کے اقرار کا نام ایمان ہے۔ اگر کوئی شخص اس کا اقرار کرلے تو اس سے وہ قانونی شرط پوری ہو جاتی ہے جو دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے لئے رکھی گئی ہے اور وہ اس کا مستحق ہو جاتا ہے کہ اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا معاملہ کیا جائے۔ مگر کیا یہی سادہ اقرار، جو ایک قانونی ضرورت پورا کرنے کے لئے کافی ہے، اس غرض کے لئے بھی کافی ہو سکتا ہے کہ اسلامی زندگی کی ساری سہ منزلہ عمارت صرف اسی بنیاد پر قائم ہو سکے؟ لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں اور اسی لئے جہاں یہ اقرار موجود ہوتا ہے وہاں عملی اسلام اور تقویٰ اور احسان کی تعمیر شروع کر دی جاتی ہے، جو اکثر ہوائی قلعہ سے زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوتی۔ لیکن فی الواقع ایک مکمّل اسلامی زندگی کی تعمیر کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ ایمان اپنی تفصیلات میں پوری طرح وسیع اور اپنی گہرائی میں اچھی طرح مستحکم ہو، ایمان کی تفصیلات میں سے جو شعبہ بھی چھوٹ جائے گا، اسلامی زندگی کا وہی شعبہ تعمیر ہونے سے رہ جائے گا، اور اس کی گہرائی میں جہاں بھی کسر رہ جائے گی اسلامی زندگی کی عمارت اسی مقام پر بودی ثابت ہوگی۔

مثال کے طور پر ایمان باللہ کو دیکھئے جو دین کی اوّلین بنیاد ہے، آپ دیکھیں گے

کہ خدا کا اقرار اپنی سادہ صورت سے گذر کر جب تفصیلات میں پہنچتا ہے تو اُس کی بے شمار صورتیں بن جاتی ہیں، کہیں وہ صرف اس حد پر ختم ہو جاتا ہے کہ بے شک خدا موجود ہے اور وہ دُنیا کا خالق ہے اور اپنی ذات میں اکیلا ہے۔ کہیں اس کی انتہائی وسعت بس اتنی ہوتی ہے کہ خدا ہمارا معبود ہے اور ہمیں اس کی پرستش کرنی چاہئے۔ کہیں خدا کی صفات اور اس کے حقوق و اختیارات کا تصور کچھ زیادہ وسیع ہو کر بھی اس سے آگے نہیں بڑھتا کہ عالم الغیب، سمیع و بصیر، سمیع الدعوات، و قاضی الحاجات اور "پرستش" کی تمام جزوی شکلوں کا مستحق ہونے میں خدا کا کوئی شریک نہیں ہے، اور یہ کہ "مذہبی معاملات" میں آخری سند خدا ہی کی کتاب ہے، ظاہر ہے کہ ان مختلف تصورات سے ایک ہی طرز کی زندگی نہیں بن سکتی بلکہ جو تصور جتنا محدود ہے عملی زندگی اور اخلاق میں بھی لازماً اسلامی رنگ اتنا ہی محدود ہوگا، حتیٰ کہ جہاں عام مذہبی تصورات کے مطابق ایمان باللہ اپنی انتہائی وسعت پر پہنچ جائے گا وہاں بھی اسلامی زندگی اس سے آگے نہ بڑھ سکے گی کہ خدا کے باغیوں کی وفاداری اور خدا کی وفاداری ایک ساتھ نباہ لی جائے یا نظام کفر اور نظامِ اسلام کو سمو کر ایک مرکب بنا لیا جائے۔

اسی طرح ایمان باللہ کی گہرائی کا پیمانہ بھی مختلف لوگوں میں مختلف ہے کوئی خدا کا اقرار کرنے کے باوجود اپنی کسی معمولی سے معمولی چیز کو بھی خدا پر قربان کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ کوئی بعض چیزوں سے خدا کو عزیز تر رکھتا ہے مگر بعض چیزیں اُسے خدا سے عزیز تر ہوتی ہیں، کوئی اپنی جان مال تک خدا پر قربان کر دیتا ہے مگر اپنے رجحاناتِ نفس اور اپنے نظریات و افکار کی قربانی یا اپنی

شہرت کی قربانی اسے گوارا نہیں ہوتی، ٹھیک ٹھیک اسی تناسب سے اسلامی زندگی کی پائیداری و ناپائیداری بھی متعین ہوتی ہے اور انسان کا اسلامی اخلاق ٹھیک اُسی مقام پر دغا دے جاتا ہے جہاں اس کے نیچے ایمان کی بنیاد کمزور رہ جاتی ہے

ایک مکمل اسلامی زندگی کی عمارت اگر اُٹھ سکتی ہے تو صرف اُسی اقرارِ توحید پر اُٹھ سکتی ہے جو انسان کی پوری انفرادی و اجتماعی زندگی پر وسیع ہو۔ جس کے مطابق انسان اپنے آپ کو اور اپنی ہر چیز کو خدا کی مِلک سمجھے، اُس کو اپنا اور تمام دُنیا کا ایک ہی جائز مالک، معبود، مطاع اور صاحب امر و نہی تسلیم کرے۔ اسی کو ہدایت کا سرچشمہ مانے۔ اور پورے شعُور کے ساتھ اس حقیقت پر مطمئن ہو جائے کہ خدا کی اطاعت سے انحراف، یا اس کی ہدایت سے بے نیازی، یا اس کی ذات و صفات اور حقوق و اختیارات میں غیر کی شرکت جس پہلو اور جس رنگ میں بھی ہے سراسر ضلالت ہے۔ پھر اس عمارت میں استحکام اگر پیدا ہو سکتا ہے تو صرف اُسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ آدمی پورے شعور اور پورے ارادے کے ساتھ یہ فیصلہ کرلے کہ وہ اور اس کا سب کچھ اللہ کا ہے اور اللہ ہی کے لئے ہے، اپنے معیارِ پسند و ناپسند کو ختم کر کے اللہ کی پسند و ناپسند کے تابع کر دے، اپنی خود سری کو مٹا کر اپنے نظریات، خیالات، خواہشات، جذبات اور اندازِ فکر کو اُس علم کے مطابق ڈھال لے جو خدا نے اپنی کتاب میں دیا ہے، اپنی تمام اُن وفاداریوں کو دریا بُرد کر دے جو خدا کی وفاداری کے تابع نہ ہوں بلکہ اُس کی مدمقابل بنی ہوئی ہوں یا بن سکتی ہوں، اپنے دل میں سب سے

بلند مقام پر خدا کی محبت کو بٹھائیے۔ اور ہر اُس بت کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نہاں خانہ دل سے نکال پھینکے جو خدا کے مقابلہ میں عزیز تر ہونے کا مطالبہ کرتا ہو۔ اپنی محبت اور نفرت، اپنی دوستی اور دشمنی، اپنی رغبت اور کراہیت، اپنی صلح اور جنگ، ہر چیز کو خدا کی مرضی میں اس طرح گم کر دے کہ اس کا نفس وہی چاہنے لگے جو خدا چاہتا ہے اور اسی سے بھاگنے لگے جو خدا کو ناپسند ہے۔ یہ ہے ایمان باللہ کا حقیقی مرتبہ اور آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں ایمان ہی ان حیثیات سے اپنی وسعت و ہمہ گیری اور اپنی پختگی و مضبوطی میں ناقص ہو وہاں تقویٰ یا احسان کا کیا امکان ہو سکتا ہے۔ کیا اس نقص کی کسر ڈاڑھیوں کے طول اور لباس کی تراش خراش یا سبحہ گردانی و تہجد خوانی سے پوری کی جا سکتی ہے؟

اسی پر دوسرے ایمانیات کو بھی قیاس کر لیجیے۔ نبوت پر ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک انسان کا نفس زندگی کے سارے معاملات میں نبی کو اپنا رہنما نہ مان لے اور اس کی رہنمائی کے خلاف یا اس سے آزاد جتنی رہنمائیاں ہوں اُن کو رد نہ کر دے۔ کتاب پر ایمان اس وقت تک ناقص ہی رہتا ہے جب تک نفس میں کتاب اللہ کے بتائے ہوئے اصولِ زندگی کے سوا کسی دوسری چیز کے تسلط پر رضامندی کا شائبہ بھی باقی ہو یا اتباعِ ما انزل اللہ کو اپنی اور ساری دُنیا کی زندگی کا قانون دیکھنے کے لئے قلب و روح کی بے چینی میں کچھ بھی کسر ہو۔ اسی طرح آخرت پر ایمان بھی مکمل نہیں کہا جا سکتا جب تک نفس پوری طرح آخرت کو دُنیا پر ترجیح دینے اور اُخروی قدروں کے مقابلہ میں دنیوی قدروں کو ٹھکرا دینے پر آمادہ نہ ہو جائے اور آخرت کی جواب دہی کا خیال اُسے زندگی

کی ہر راہ پر چلتے ہوئے قدم قدم پر کھٹکنے نہ لگے۔ یہ بنیادیں ہی جہاں پوری نہ ہوں آخر وہاں اسلامی زندگی کی عالیشان عمارت کس شے پر تعمیر ہوگی؟ جب لوگوں نے ان بنیادوں کی توسیع و تکمیل اور پختگی کے بغیر تعمیر اخلاقِ اسلامی کو ممکن سمجھا تب ہی تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ کتاب اللہ کے خلاف فیصلہ کرنے والے جج، غیر شرعی قوانین کی بنیاد پر مقدمے لڑانے والے وکیل، نظام کفر کے مطابق معاملات زندگی کا انتظام کرنے والے کارکن، کافرانہ اصولِ تمدن و ریاست پر زندگی کی تشکیل و تاسیس کے لئے لڑانے والے لیڈر اور پیرو، غرض سب کے لئے تقویٰ و احسان کے مراتبِ عالیہ کا دروازہ کھل گیا بشرطیکہ وہ اپنی زندگی کے ظاہری انداز و اطوار کو ایک خاص نقشہ پر ڈھال لیں، اور کچھ نوافل و اذکار کی عادت ڈال لیں۔

اسلام

ایمان کی یہ بنیادیں جن کا میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا ہے، جب مکمل اور گہری ہو جاتی ہیں، تب ان پر اسلام کی منزل شروع ہوتی ہے۔ اسلام دراصل ایمان کے عملی ظہور کا دوسرا نام ہے۔ ایمان اور اسلام کا باہمی تعلق ویسا ہی ہے جیسا بیج اور درخت کا تعلق ہوتا ہے۔ بیج میں جو کچھ اور جیسا کچھ موجود ہوتا ہے وہی درخت کی شکل میں ظاہر ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ درخت کا امتحان کر کے بآسانی یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ بیج میں کیا تھا اور کیا نہ تھا آپ نہ یہ تصور کر سکتے ہیں کہ بیج نہ ہو اور درخت موجود ہو، اور نہ ہی تصور کر

سکتے ہیں کہ زمین بنجر بھی نہ ہو اور بیج اس میں موجود بھی ہو، پھر بھی درخت پیدا نہ ہو۔ ایسا ہی معاملہ ایمان اور اسلام کا ہے۔ جہاں ایمان موجود ہو گا، لازماً اس کا ظہور آدمی کی عملی زندگی میں، اخلاق میں، برتاؤ میں، تعلقات کے کٹنے اور جڑنے میں، دوڑ دھوپ کے رُخ میں، مذاق و مزاج کی اُفتاد میں، سعی و جہد کے راستوں میں، اوقات اور قوتوں اور قابلیتوں کے مصرف میں، غرض مظاہرِ زندگی کے ہر ہر جُز میں ہو کر رہے گا۔ ان میں سے جس پہلو میں بھی اسلام کے بجائے غیر اسلام ظاہر ہو رہا ہو، یقین کر لیجئے کہ اُس پہلو میں ایمان موجود نہیں ہے یا ہے تو بالکل بودا اور بے جان ہے۔ اور اگر عملی زندگی ساری کی ساری ہی غیر مسلمانہ شان سے بسر ہو رہی ہو، تو جان لیجئے کہ دل ایمان سے خالی ہے یا زمین اتنی بنجر ہے کہ ایمان کا بیج برگ و بار نہیں لا رہا ہے۔ بہرحال میں نے جہاں تک قرآن و حدیث کو سمجھا ہے، یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ دل میں ایمان ہو اور عمل میں اسلام نہ ہو۔

(اس موقع پر ایک صاحب نے اُٹھ کر پُوچھا کہ ایمان اور عمل کو آپ ایک ہی چیز سمجھتے ہیں یا ان دونوں میں کچھ فرق ہے؟ اس کے جواب میں کہا:-)

آپ تھوڑی دیر کے لئے اپنے ذہن سے اُن بحثوں کو نکال دیں جو فقہاء اور متکلمین نے اس مسئلہ میں کی ہیں اور قرآن سے اس معاملہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ قرآن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اعتقادی ایمان اور عملی اسلام لازم و ملزوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ جگہ جگہ ایمان اور عملِ صالح کا ساتھ ساتھ ذکر کرتا ہے

اور تمام اچھے وعدے جو اُس نے اپنے بندوں سے کئے ہیں اُنہی لوگوں سے متعلق ہیں جو اعتقاداً مومن اور عملاً مسلم ہوں۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں جہاں منافقین کو پکڑا ہے وہاں اُن کے عمل ہی کی خرابیوں سے اُن کے ایمان کے نقص پر دلیل قائم کی ہے اور عملی اسلام ہی کو حقیقی ایمان کی علامت ٹھیرایا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ قانونی لحاظ سے کسی شخص کو کافر ٹھیرانے اور اُمت سے اُس کا رشتہ کاٹ دینے کا معاملہ دوسرا ہے اور اس میں انتہائی احتیاط ملحوظ رہنی چاہئے۔ مگر میں یہاں اُس ایمان و اسلام کا ذکر نہیں کر رہا ہوں جس پر دُنیا میں فقہی احکام مُترتب ہوتے ہیں، بلکہ یہاں ذکر اُس ایمان و اسلام کا ہے جو خدا کے ہاں مُعتبر ہے اور جس پر اُخروی نتائج مترتّب ہونے والے ہیں۔ قانونی نقطۂ نظر کو چھوڑ کر حقیقتِ نفس الامری کے لحاظ سے اگر آپ دیکھیں گے تو یقیناً یہی پائیں گے کہ جہاں عملاً خدا کے آگے سپر اندازی اور سپردگی و حوالگی میں کمی ہے، جہاں نفس کی پسند خدا کی پسند سے مختلف ہے، جہاں خدا کی وفاداری کے ساتھ غیر کی وفاداری نبھ رہی ہے، جہاں اقامتِ دین کی سعی کے بجائے دوسرے مشاغل میں انہماک ہے، جہاں کوششیں اور محنتیں راہِ خدا کے بجائے دوسری راہوں میں صرف ہو رہی ہیں، وہاں ضرور ایمان میں نقص ہے اور ظاہر ہے کہ ناقص ایمان پر تقویٰ اور احسان کی تعمیر نہیں ہو سکتی خواہ ظاہر کے اعتبار سے متقیوں کی سی وضع بنانے اور محسنین کے بعض اعمال کی نقل اُتارنے کی کتنی ہی کوشش کی جائے۔ ظاہر فریب شکلیں اگر حقیقت کی روح سے خالی ہوں تو ان کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسی ایک

نہایت خوبصورت آدمی کی لاش بہترین وضع وہیئت میں موجود ہو مگر اُس میں جان نہ ہو۔ اس خوبصورت لاش کی ظاہری شان سے دھوکا کھا کر آپ اگر کچھ توقعات اس سے وابستہ کرلیں گے تو واقعات کی دُنیا اپنے پہلے ہی امتحان میں اس کا ناکارہ ہونا ثابت کردے گی اور تجربہ سے آپ کو خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ ایک بدصورت مگر زندہ انسان ایک خوب صورت مگر بے روح لاش سے بہرحال زیادہ کارگر ہوتا ہے، ظاہر فریبیوں سے آپ اپنے نفس کو تو ضرور دھوکہ دے سکتے ہیں، لیکن عالم واقعہ پر کچھ بھی اثر نہیں ڈال سکتے اور نہ خدا کی میزان ہی میں کوئی وزن حاصل کرسکتے ہیں۔ پس اگر آپ کو ظاہری نہیں بلکہ وہ حقیقی تقویٰ اور احسان مطلوب ہے جو دنیا میں دین کا بول بالا کرنے اور آخرت میں خیر کا پلڑا جھکانے کے لئے درکار ہے تو میری اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرلیجئے کہ اوپر کی یہ دونوں منزلیں کبھی نہیں اُٹھ سکتیں جب تک ایمان کی بنیاد مضبوط نہ ہوجائے اور اس کی مضبوطی کا ثبوت عملی اسلام یعنی بالفعل اطاعت وفرمانبرداری سے نہ مل جائے۔

تقویٰ

تقویٰ کی بات کرنے سے پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ تقویٰ ہے کیا چیز، تقویٰ حقیقت میں کسی وضع وہیئت اور کسی خاص طرزِ معاشرت کا نام نہیں ہے بلکہ دراصل وہ نفس کی اُس کیفیت کا نام ہے جو خدا ترسی اور احساس ذمہ داری سے پیدا ہوتی ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں ظہور کرتی ہے۔ حقیقی تقویٰ یہ ہے کہ

انسان کے دل میں خدا کا خوف ہو، عبدیت کا شعور ہو، خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری وجوابدہی کا احساس ہو، اور اس بات کا زندہ ادراک موجود ہو کہ دُنیا ایک امتحان گاہ ہے جہاں خُدا نے ایک مُہلتِ عمر دے کر مجھے بھیجا ہے اور آخرت میں میرے مستقبل کا فیصلہ بالکل اس چیز پر منحصر ہے کہ میں اس دیئے ہوئے وقت کے اندر اس امتحان گاہ میں اپنی قوتوں وقابلیتوں کو کس طرح استعمال کرتا ہوں، اُس سروسامان میں کس طرح تصرف کرتا ہوں جو مشیئت الٰہی کے تحت مجھے دیا گیا ہے اور اُن انسانوں کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہوں جن سے قضائے الٰہی نے مختلف حیثیتوں سے میری زندگی متعلق کر دی ہے۔ یہ احساس وشعور جس شخص کے اندر پیدا ہو جائے اُس کا ضمیر بیدار ہو جاتا ہے اُس کی دینی حِس تیز ہو جاتی ہے، اس کو وہ ہر چیز کھٹکنے لگتی ہے جو خدا کی رضا کے خلاف ہو، اُس کے مذاق کو ہر وُہ شے ناگوار ہونے لگتی ہے جو خدا کی پسند سے مختلف ہو۔ وہ اپنے نفس کا آپ جائزہ لینے لگتا ہے کہ میرے اندر کس قسم کے رجحانات ومیلانات پرورش پا رہے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کا خود محاسبہ کرنے لگتا ہے کہ میں کن کاموں میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں صرف کر رہا ہوں، وُہ صریح ممنوعات تو درکنار مشتبہ امور میں بھی مبتلا ہوتے ہوئے خود بخود جھجکنے لگتا ہے۔ اس کا احساس فرض اِسے مجبور کر دیتا ہے کہ تمام اوامر کو پوری فرمانبرداری کے ساتھ بجا لائے۔ اس کی خدا ترسی ہر اُس موقع پر اُس کے قدم میں لرزش پیدا کر دیتی ہے جہاں حدود اللہ سے تجاوز کا اندیشہ ہو، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی نگہداشت آپ سے آپ اس کا وتیرہ بن جاتی ہے اور اس خیال سے بھی اس کا ضمیر کانپ اُٹھتا

ہئے کہ کہیں اس سے کوئی بات حق کے خلاف سرزد نہ ہو جائے۔ یہ کیفیت کسی ایک شکل یا کسی مخصوص دائرہ عمل میں ہی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ آدمی کے پورے طرزِ فکر اور اس کے تمام کارنامہ زندگی میں اس کا ظہور ہوتا ہے اور اس کے اثر سے ایک ایسی ہموار و یکرنگ سیرت پیدا ہوتی ہے جس میں آپ ہر پہلو سے ایک ہی طرز کی پاکیزگی و صفائی پائیں گے۔ بخلاف اس کے جہاں "تقویٰ" بس اس چیز کا نام رکھ لیا گیا ہے کہ آدمی چند مخصوص شکلوں کی پابندی اور مخصوص طریقوں کی پیروی اختیار کرلے اور مصنوعی طور اپنے آپ کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال لے جس کی پیمائش کی جاسکتی ہو، وہاں آپ دیکھیں گے کہ وہ چند اشکالِ تقویٰ جو سکھا دی گئی ہیں، اُن کی پابندی تو انتہائی اہتمام کے ساتھ ہو رہی ہے، مگر اس کے ساتھ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں وہ اخلاق، وہ طرزِ فکر اور وہ طرزِ عمل بھی ظاہر ہو رہے ہیں جو مقامِ تقویٰ تو درکنار، ایمان کے ابتدائی مقتضیات سے بھی مناسبت نہیں رکھتے، یعنی حضرت مسیح کی تمثیلی زبان میں مچھر چھانے جا رہے ہیں اور اونٹ بے تکلفی کے ساتھ نگلے جا رہے ہیں۔

حقیقی تقویٰ اور مصنوعی تقویٰ کے اس فرق کو یوں سمجھئے کہ ایک شخص تو وہ ہے جس کے اندر طہارت و نظافت کی حس موجود ہے اور پاکیزگی کا ذوق پایا جاتا ہے، ایسا شخص گندگی سے فی نفسہٖ نفرت کرے گا خواہ وہ جس شکل میں بھی ہو، اور طہارت کو بجائے خود اختیار کرے گا خواہ اس کے مظاہر کا احاطہ نہ ہو سکتا ہو۔ بخلاف اس کے ایک دوسرا شخص ہے جس کے اندر طہارت کی حس موجود نہیں

ہے مگر وہ گندگیوں اور طہارتوں کی ایک فہرست لئے پھرتا ہے جو کہیں سے اُس نے نقل کر لی ہیں۔ یہ شخص ان گندگیوں سے تو سخت اجتناب کرے گا جو اس نے فہرست میں لکھی ہوئی ہیں، مگر بے شمار ایسی گھناؤنی چیزوں میں آلودہ پایا جائے گا جو اُن گندگیوں سے بدرجہا زیادہ ناپاک ہونگی جن سے وہ بچ رہا ہے، صرف اس وجہ سے کہ وہ اس کی فہرست میں درج ہونے سے رہ گئیں۔ یہ فرق جو میں آپ سے عرض کر رہا ہوں، یہ محض ایک نظری فرق نہیں ہے بلکہ آپ اس کو اپنی آنکھوں سے ان حضرات کی زندگیوں میں دیکھ سکتے ہیں جن کے تقوی کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ ایک طرف اُن کے ہاں جزئیاتِ شرع کا یہ اہتمام ہے کہ ڈاڑھی ایک خاص مقدار سے کچھ بھی کم ہو تو فسق کا فیصلہ نافذ کر دیا جاتا ہے، پائنچہ ٹخنے سے ذرا نیچے ہو جائے تو جہنم کی وعید سنا دی جاتی ہے اور اپنے مسلکِ فقہی کے فروعی احکام سے ہٹنا اُن کے نزدیک گویا دین سے نکل جانا ہے، لیکن دوسری طرف دین کے اصول و کلیات سے ان کی غفلت اس حد کو پہنچی ہوئی ہے کہ مسلمانوں کی پوری زندگی کا مدار انہوں نے رخصتوں اور سیاسی مصلحتوں پر رکھ دیا ہے، اقامتِ دین کی سعی سے گریز کی بے شمار راہیں اُنہوں نے نکال رکھی ہیں، غلبۂ کفر کے تحت "اسلامی زندگی" کے نقشے بنانے ہی میں اُن کی ساری محنتیں اور کوششیں صرف ہو رہی ہیں، اور انہی کی غلط رہنمائی نے مسلمانوں کو اس چیز پر مطمئن کیا ہے کہ ایک غیر اسلامی نظام کے اندر رہتے ہوئے، بلکہ اس کی خدمت کرتے ہوئے بھی ایک محدود دائرے میں مذہبی زندگی بسر کر کے وہ دین کے سارے تقاضے پورے کر سکتے ہیں اور اس سے آگے کچھ مطلوب نہیں

ہے جس کے لئے وہ سعی کریں۔ پھر اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اگر کوئی ان کے سامنے دین کے اصلی مطالبے پیش کرے اور سعی اقامت دین کی طرف توجہ دلائے تو صرف یہی نہیں کہ وہ اس کی بات سُنی اَن سُنی کر دیتے ہیں بلکہ کوئی حیلہ، کوئی بہانہ اور کوئی چال ایسی نہیں چھوڑتے جو اس کام سے خود بچنے اور مسلمانوں کو بچانے کے لئے استعمال نہ کریں۔ اس پر بھی اُن کے تقویٰ پر کوئی آنچ نہیں آتی اور نہ مذہبی ذہنیت رکھنے والوں میں سے کسی کو یہ شک ہوتا ہے کہ اُن کے تقویٰ میں کوئی کسر ہے۔ اسی طرح حقیقی اور مصنوعی تقویٰ کا فرق بے شمار شکلوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے، مگر آپ اُسے تب ہی محسوس کر سکتے ہیں کہ تقویٰ کا اصلی تصور آپ کے ذہن میں واضح طور پر موجود ہو۔

میری اِن باتوں کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وضع قطع، لباس اور معاشرت کے ظاہری پہلوؤں کے متعلق جو آداب و احکام حدیث سے ثابت ہیں میں اُن کا استخفاف کرنا چاہتا ہوں یا اُنہیں غیر ضروری قرار دیتا ہوں، خدا کی پناہ اس سے کہ میرے دل میں ایسا کوئی خیال ہو۔ دراصل جو کچھ میں آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اصل شئے حقیقتِ تقویٰ ہے نہ کہ یہ مظاہر۔ حقیقتِ تقویٰ جس کے اندر پیدا ہو گی اُس کی پوری زندگی ہمواری و یک رنگی کے ساتھ اسلامی زندگی بنے گی اور اسلام اپنی پوری ہمہ گیری کے ساتھ اس کے خیالات میں، اس کے جذبات و رجحانات میں، اس کے مذاقِ طبیعت میں، اس کے اوقات کی تقسیم اور اس کی قوتوں کے مصارف میں، اس کی سعی کی راہوں میں، اس کے طرزِ زندگی اور معاشرت میں، اس کی کمائی اور خرچ میں، غرض اس کی حیاتِ دنیوی

دُنیوی کے سارے ہی پہلوؤں میں رفتہ رفتہ نمایاں ہوتا چلا جائے گا۔ بخلاف اس کے اگر مظاہر کو حقیقت پر مقدّم رکھا جائے گا اور ان پر بیجا زور دیا جائے گا اور حقیقی تقویٰ کی تخم ریزی اور آبیاری کے بغیر مصنوعی طور پر چند ظاہری احکام کی تعمیل کرا دی جائے گی تو نتائج وہی کچھ ہوں گے جن کا میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا ہے۔ پہلی چیز دیر طلب اور صبر آزما ہے، بتدریج نشو و نما پاتی اور ایک مُدت کے بعد برگ و بار لاتی ہے، جس طرح بیج سے درخت کے پیدا ہونے اور پھل پھول لانے میں کافی دیر لگا کرتی ہے، اسی لئے سطحی مزاج کے لوگ اس سے اُپراتے ہیں۔ بخلاف اس کے دوسری چیز جلدی اور آسانی سے پیدا کر لی جاتی ہے۔ جیسے ایک لکڑی میں پتّے اور پھل اور پھول باندھ کر درخت کی سی شکل بنا دی جائے، یہی وجہ ہے کہ تقویٰ کی پیداوار کا یہی ڈھنگ آج مقبول ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو توقعات ایک فطری درخت سے پوری ہوتی ہیں وہ اس قسم کے مصنوعی درختوں سے کبھی پوری نہیں ہو سکتیں۔

احسان

اب احسان کو لیجئے جو اسلام کی بلند ترین منزل ہے۔ احسان دراصل اللہ اور اس کے رسول اور اُس کے دین کے ساتھ اُس قلبی لگاؤ، اُس گہری محبّت، اُس سچی وفاداری اور فدویت و جاں نثاری کا نام ہے جو مسلمان کو فنانی الاسلام کر دے۔ تقویٰ کا اساسی تصوّر خدا کا خوف ہے جو انسان کو اُس کی ناراضی سے بچنے پر آمادہ کرے اور احسان کا اساسی تصوّر خدا کی محبّت ہے جو آدمی کو

اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اُبھارے۔ ان دونوں چیزوں کے فرق کو ایک مثال سے یُوں سمجھئے کہ حکومت کے ملازموں میں سے ایک تو وہ لوگ ہیں جو نہایت فرض شناسی و تن دہی سے وہ تمام خدمات ٹھیک بجا لاتے ہیں جو اُن کے سپُرد کی گئی ہوں۔ تمام ضابطوں اور قاعدوں کی پوری پوری پابندی کرتے ہیں اور کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو حکومت کے لئے قابلِ اعتراض ہو۔ دوسرا طبقہ اُن مخلص وفاداروں اور جاں نثاروں کا ہوتا ہے جو دل و جان سے حکومت کے ہوا خواہ ہوتے ہیں، صرف وہی خدمات انجام نہیں دیتے جو اُن کے سپُرد کی گئی ہوں بلکہ اُن کے دل کو ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی ہے کہ سلطنت کے مفاد کو زیادہ سے زیادہ کس طرح ترقی دی جائے اور اس دُھن میں فرض اور مطالبہ سے زائد کام کرتے ہیں، سلطنت پر کوئی آنچ آئے تو وہ جان و مال اور اولاد سب کچھ قربان کرنے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں، قانون کی کہیں خلاف ورزی ہو تو اُن کے دل کو چوٹ لگتی ہے، کہیں بغاوت کے آثار پائے جائیں تو وہ بےچین ہو جاتے ہیں اور اسے فرو کرنے میں جان لڑا دیتے ہیں۔ جان بوجھ کر خود سلطنت کو نقصان پہنچانا تو درکنار اس کے مفاد کو کسی طرح نقصان پہنچتے دیکھنا بھی ان کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتا ہے اور اس خرابی کے رفع کرنے میں وہ اپنی حد تک کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے، ان کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ دُنیا میں بس ان کی سلطنت ہی کا بول بالا ہو اور زمین کا کوئی چپہ ایسا باقی نہ رہے جہاں اس کا پھریرا نہ اُڑے۔ ان دونوں میں سے پہلی قسم کے لوگ حکومت کے متقی ہیں۔ اور دوسری قسم کے لوگ اس کے محسن، اگرچہ

ترقیاں متقین کو بھی ملتی ہیں اور بہر حال اُن کے نام اچھے ہی ملازموں کی فہرست میں لکھے جاتے ہیں، مگر جو سرفرازیاں محسنین کے لئے ہیں اُن میں کوئی دوسرا اُن کا شریک نہیں ہوتا۔ بس اسی مثال پر اسلام کے متقیوں اور محسنوں کو بھی قیاس کر لیجئے اگرچہ متقین بھی قابلِ قدر اور قابلِ اعتماد لوگ ہیں، مگر اسلام کی اصلی طاقت محسنین کا گروہ ہے اور اصلی کام جو اسلام چاہتا ہے کہ دُنیا میں ہو، وُہ اسی گروہ سے بن آسکتا ہے۔

احسان کی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد آپ خود ہی اندازہ کر لیں کہ جو لوگ اپنی آنکھوں سے خدا کے دین کو کفر سے مغلوب دیکھیں اور جن کے سامنے حدود اللہ پامال ہی نہیں بلکہ کالعدم کر دی جائیں، خدا کا قانون عملاً ہی نہیں بلکہ باضابطہ منسوخ کر دیا جائے، خدا کی زمین پر خدا کا نہیں بلکہ اُس کے باغیوں کا بول بالا ہو رہا ہو، نظامِ کفر کے تسلط سے نہ صرف عام انسانی سوسائٹی میں اخلاقی و تمدنی فساد برپا ہو بلکہ خود اُمتِ مسلمہ بھی نہایت سُرعت کے ساتھ اخلاقی و عملی گمراہیوں میں مبتلا ہو رہی ہو، اور یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اُن کے دلوں میں نہ کوئی بے چینی پیدا ہو نہ اس حالت کو بدلنے کے لئے کوئی جذبہ بھڑکے، بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے نفس کو اور عام مسلمانوں کو غیر اسلامی نظام کے غلبہ پر اصولاً و عملاً مطمئن کر دیں، اُن کا شمار آخر محسنین میں کس طرح ہو سکتا ہے اور اس جرمِ عظیم کے ساتھ محض یہ بات اُنہیں احسان کے مقامِ عالی پر کیسے سرفراز کر سکتی ہے کہ وہ چاشت اور اشراق اور تہجد کے نوافل پڑھتے رہے، ذکر و شغل اور مراقبے کرتے رہے، حدیث و قرآن کے درس دیتے رہے،

جزئیاتِ فقہ کی پابندی اور چھوٹی چھوٹی سُنتوں کے اتباع کا سخت اہتمام فرماتے رہے اور تزکیۂ نفس کی خانقاہوں میں دینداری کا وہ فن سکھاتے رہے جس میں حدیث و فقہ اور تصوف کی باریکیاں تو ساری موجود تھیں، مگر ایک نہ تھی تو وہ حقیقی دینداری جو "سر داد نداد دست دَر دستِ یزید"، کی کیفیت پیدا کرے اور "بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا"، کے مقامِ وفاداری پر پہنچائے، آپ دنیوی ریاستوں اور قوموں میں بھی وفادار اور غیر وفادار کی اتنی تمیز ضرور نمایاں پائیں گے کہ اگر ملک میں بغاوت ہو جائے یا ملک کے کسی حصّہ پر دشمن کا قبضہ ہو جائے تو باغیوں اور دشمنوں کے تسلّط کو جو لوگ جائز تسلیم کر لیں یا اُن کے تسلّط پر راضی ہو جائیں اور اُن کے ساتھ مغلوبانہ مصالحت کر لیں، یا اُن کی سرپرستی میں کوئی ایسا نظام بنائیں جس میں اصلی اقتدار کی باگیں اُنہی کے ہاتھ میں رہیں اور کچھ ضمنی حقوق اور اختیارات اِنہیں بھی مل جائیں، تو ایسے لوگوں کو کوئی ریاست اور کوئی قوم اپنا وفادار ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتی خواہ وہ قومی فیشن کے کیسے ہی سخت پابند اور جزئی معاملات میں قومی قانون کے کتنے ہی شدید پیرو ہوں۔ آج آپ کے سامنے زندہ مثالیں موجود ہیں کہ جو ملک جرمنی کے تسلط سے نکلے ہیں وہاں اُن لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے جنہوں نے جرمن قبضہ کے زمانہ میں تعاون و مصالحت کی راہیں اختیار کی تھیں۔ ان سب ریاستوں اور قوموں کے پاس وفاداری کو جانچنے کا ایک ہی معیار ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی شخص نے دشمن کے تسلط کی مزاحمت کس حد تک کی، اس کو مٹانے کے لئے کیا کام کیا اور اس اقتدار

کو واپس لانے کی کیا کوشش کی جس کی وفاداری کا وہ مدعی تھا۔ پھر کیا معاذاللہ خدا کے متعلق آپ کا یہ گمان ہے کہ وہ اپنے وفاداروں کو پہچاننے کی اتنی تمیز بھی نہیں رکھتا جتنی دنیا کے ان کم عقل انسانوں میں پائی جاتی ہے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ بس ڈاڑھیوں کا طول، ٹخنوں اور پائنچوں کا فاصلہ، تسبیحوں کی گردش اور اوراد و وظائف اور نوافل اور مراقبے کے مشاغل اور ایسی ہی چند اور چیزیں دیکھ کر ہی دھوکا کھا جائے گا کہ آپ اس کے سچے وفادار اور جاں نثار ہیں؟

غلط فہمیاں

حضرات! اب میں ایک آخری بات کہہ کر اپنی تقریر ختم کروں گا۔ عام مسلمانوں کے ذہن پر مدتوں کے غلط تصورات کی وجہ سے جزئیات و ظواہر کی اہمیت کچھ اس طرح چھا گئی ہے کہ دین کے اصول و کلیات اور دینداری و اخلاقِ اسلامی کے حقیقی جوہر کی طرف خواہ کتنی ہی توجہ دلائی جائے، مگر لوگوں کے دماغ پھر پھر کر انہی چھوٹے چھوٹے مسائل اور ذرا ذرا سی ظاہری چیزوں میں اٹک کر رہ جاتے ہیں جنہیں اصل دین بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس وبائے عام کے اثرات خود ہمارے بہت سے رفقاء اور ہمدردوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ میں اپنا پورا زور یہ سمجھانے میں صرف کر رہا ہوں کہ دین کی حقیقت کیا ہے، اس میں اصل اہمیت کن چیزوں کی ہے اور اس میں مقدم کیا ہے اور مؤخر کیا ہے۔ لیکن ان ساری کوششوں کے بعد جب دیکھتا ہوں یہی دیکھتا ہوں کہ وہی ظاہر پرستی اور وہی اصول سے بڑھ کر فروع کی اہمیت دماغوں پر مسلط ہے

آج تین روز سے میرے پاس پرچوں کی بھرمار ہو رہی ہے جن میں سارا مطالبہ بس اسی کا ہے کہ جماعت کے لوگوں کی ڈاڑھیاں بڑھوائی جائیں، پائنچے ٹخنوں سے اونچے کرائے جائیں اور ایسے ہی دوسرے جزئیات کا اہتمام کرایا جائے۔ اس کے علاوہ بعض لوگوں کے اس خیال کا بھی مجھے علم ہوا کہ انہیں جماعت میں اس چیز کی بڑی کمی محسوس ہوتی ہے جس کو وہ "روحانیت" سے تعبیر کرتے ہیں مگر شاید خود نہیں بتا سکتے کہ وہ فی الواقع ہے کیا شئے۔ اس بنا پر ان کی رائے یہ ہے کہ نصب العین اور طریق کار تو اس جماعت کا اختیار کیا جائے اور تزکیۂ نفس اور تربیت روحانی کے لئے خانقاہوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ ساری باتیں صاف بتاتی ہیں کہ ابھی تک ہماری تمام کوششوں کے باوجود لوگوں میں دین کا فہم پیدا نہیں ہوا ہے۔ میں ابھی آپ کے سامنے ایمان، اسلام، تقویٰ اور احسان کی جو تشریح عرض کر چکا ہوں اس میں اگر کوئی چیز قرآن وحدیث کی تعلیم سے تجاوز کر کے میں نے خود وضع کر دی ہو تو آپ بے تکلف اس کی نشان دہی فرمادیں۔ لیکن اگر آپ تسلیم کرتے ہیں کہ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کی رو سے یہی ان چاروں چیزوں کی حقیقت ہے تو پھر خود ہی سوچئے کہ جہاں ایمان کے مقتضیات بھی پوری طرح متحقق نہ ہوں اور جہاں تقویٰ اور احسان کی جڑ ہی نہ پائی جاتی ہو وہاں آخر کونسی روحانیت پائی جاسکتی ہے جسے آپ تلاش کرنے جارہے ہیں۔ رہے وہ جزئیات شرع جن کو آپ نے دین کے اولین مطالبات میں شمار کر رکھا ہے تو ان کا حقیقی مقام میں آپ کے سامنے پھر ایک مرتبہ صاف واضح کئے دیتا ہوں تاکہ میں اپنی

ذمّہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں۔

سب سے پہلے ٹھنڈے دل سے اس سوال پر غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول دنیا میں کس غرض کے لئے بھیجے ہیں؟ دنیا میں آخر کس چیز کی کمی تھی، کیا خرابی پائی جاتی تھی جسے رفع کرنے کے لئے انبیاء کو مبعوث کرنے کی ضرورت پیش آئی؟ کیا وہ یہ تھی کہ لوگ ڈاڑھیاں نہ رکھتے تھے اور انہی کے رکھوانے کے لئے رسول بھیجے گئے؟ یا کہ لوگ ٹخنے ڈھانکے رہتے تھے اور انبیاء کے ذریعے سے انہیں کھلوانا مقصود تھا؟ یا وہ سنتیں، جن کے اہتمام کا آپ لوگوں میں بہت چرچا ہے، دنیا میں جاری نہ تھیں اور انہیں کو جاری کرنے کے لئے انبیا کی ضرورت تھی؟ ان سوالات پر آپ غور کریں گے تو خود ہی کہہ دیں گے کہ نہ اصل خرابیاں یہ تھیں اور نہ انبیا کی بعثت کا اصل مقصود یہ تھا۔ پھر سوال یہ ہے کہ وہ اصلی خرابیاں کیا تھیں جنہیں دور کرنا مطلوب تھا اور وہ حقیقی بھلائیاں کیا تھیں جنہیں قائم کرنے کی ضرورت تھی؟ اس کا جواب آپ اس کے سوا اور کیا دے سکتے ہیں کہ خدا کی اطاعت و بندگی سے انحراف، خود ساختہ اصول و قوانین کی پیروی، اور خدا کے سامنے ذمّہ داری و جوابدہی کا عدم احساس، یہ تھیں وہ اصل خرابیاں جو دنیا میں رُونما ہو گئی تھیں۔ انہیں کی بدولت اخلاقِ فاسدہ پیدا ہوئے، غلط اصولِ زندگی رائج ہوئے اور زمین میں فساد برپا ہوا پھر انبیاء علیہم السلام اس غرض کے لئے بھیجے گئے کہ انسانوں میں خدا کی بندگی و وفاداری اور اس کے سامنے اپنی جوابدہی کا احساس پیدا کیا جائے، اخلاقِ فاضلہ کو نشو و نما دیا جائے اور انسانی زندگی کا نظام ان اصولوں پر قائم کیا جائے جن سے خیر و صلاح اُبھرے اور

شر و فساد دیے۔ یہی ایک مقصد تمام انبیا کی بعثت کا تھا اور آخر کار اسی مقصد کے لئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔

اب دیکھئے کہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے کس ترتیب و تدریج کے ساتھ کام کیا۔ سب سے پہلے آپ نے ایمان کی دعوت دی اور اس کو وسیع ترین بنیادوں پر پختہ و مستحکم فرمایا۔ پھر اس ایمان کے مقتضیات کے مطابق بتدریج اپنی تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے اہلِ ایمان میں عملی اطاعت و فرمانبرداری (یعنی اسلام)، اخلاقی طہارت (یعنی تقویٰ)، اور خدا کی گہری محبت و وفاداری (یعنی احسان) کے اوصاف پیدا کئے۔ پھر ان مخلص مومنوں کی منظم سعی و جہد سے قدیم جاہلیت کے فاسد نظام کو مٹانا اور اس کی جگہ قانونِ خداوندی کے اخلاقی و تمدنی اصولوں پر ایک نظامِ صالح قائم کرنا شروع کر دیا۔ اس طرح جب یہ لوگ اپنے دل و دماغ، نفس و اخلاق، افکار و اعمال، جملہ حیثیات سے واقعی مسلم، متقی اور محسن بن گئے، اور اس کام میں لگ گئے جو اللہ تعالیٰ کے وفاداروں کو کرنا چاہئے تھا، تب آپ نے اُن کو بتانا شروع کیا کہ وضع قطع، لباس، کھانے پینے، رہنے سہنے، اُٹھنے بیٹھنے اور دوسرے ظاہری برتاؤ میں وہ مہذب آداب و اطوار کونسے ہیں جو متقیوں کو زیب دیتے ہیں۔ گویا پہلے مسِ خام کو کندن بنایا پھر اس پر اشرفی کا ٹھپہ لگایا پہلے سپاہی تیار کئے پھر انہیں وردی پہنائی۔ یہی اس کام کی صحیح ترتیب ہے جو قرآن و حدیث کے غائر مطالعہ سے صاف نظر آتی ہے۔ اگر اتباعِ سنت نام ہے اس طرزِ عمل کا جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی مرضی پوری کرنے کے لئے ہدایتِ الٰہی کے تحت اختیار کیا تھا، تو یقیناً یہ سنت کی پیروی نہیں بلکہ اُس کی خلاف ورزی ہے کہ

حقیقی مومن، مسلم، متقی اور محسن بنائے بغیر لوگوں کو متقیوں کے ظاہری سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے اور ان سے محسنین کے چند مشہور و مقبول عام افعال کی نقل اتروائی جائے۔ یہ سیسے اور تانبے کے ٹکڑوں پر اشرفی کا ٹھپہ لگا کر بازار میں ان کو چلا دینا، اور سپاہیت، وفاداری اور جاں نثاری پیدا کئے بغیر نرے وردی پوش نمائشی سپاہیوں کو میدان میں لا کھڑا کرنا میرے نزدیک تو ایک کھلی ہوئی جعلسازی ہے اور اسی جعلسازی کا نتیجہ ہے کہ نہ بازار میں آپ کی ان جعلی اشرفیوں کی کوئی قیمت اٹھتی ہے اور نہ میدان میں آپ کے ان نمائشی سپاہیوں کی بھیڑ سے کوئی معرکہ سر ہوتا ہے۔

پھر آپ کیا سمجھتے ہیں کہ خدا کے ہاں اصلی قدر کس چیز کی ہے؟ فرض کیجئے کہ ایک شخص سچا ایمان رکھتا ہے، فرض شناس ہے، اخلاقِ صالحہ سے متصف ہے، حدود اللہ کا پابند ہے اور خدا کی وفاداری اور جاں نثاری کا حق ادا کر دیتا ہے مگر ظاہری فیشن کے اعتبار سے، ناقص اور ظاہری تہذیب کے معیار سے گرا ہوا ہے۔ اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ بس یہی تو ہو گی کہ ایک اچھا ملازم ہے مگر ذرا بدتمیز ہے۔ ممکن ہے کہ اس بدتمیزی کی وجہ سے اُس کو مراتبِ عالیہ نصیب نہ ہو سکیں، مگر کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس قصور میں اس کی وفاداری کا اجر بھی مارا جائے گا اور اس کا مالک صرف اس لئے اسے جہنم میں جھونک دے گا کہ وہ خوش وضع و خوش اطوار نہ تھا؟ فرض کیجئے کہ ایک دوسرا شخص ہے جو بہترین شرعی فیشن میں رہتا ہے اور آداب تہذیب کے التزام میں کمال درجہ محتاط ہے مگر اُس کی وفاداری میں نقص ہے، اُس کی فرض شناسی میں کمی ہے، اُس کی غیرتِ ایمانی میں خامی ہے۔ آپ کیا اندازہ کرتے

ہیں کہ اس نقص کے ساتھ اُس ظاہری کمال کی حد سے حد کتنی قدر خدا کے ہاں ہوگی؟ یہ مسئلہ تو کوئی گہرا اور پیچیدہ قانونی مسئلہ نہیں ہے جسے سمجھنے کے لئے کتابیں کھنگالنے کی ضرورت ہو۔ محض عقل عام سے ہی ہر آدمی جان سکتا ہے کہ اِن دونوں چیزوں میں سے اصلی قدر کی مستحق کونسی چیز ہے۔ دنیا کے کم عقل لوگ بھی اتنی تمیز ضرور رکھتے ہیں کہ حقیقت میں جو چیز قابلِ قدر ہے اس میں اور ضمنی خوبیوں میں فرق کر سکیں۔ یہ انگریزی حکومت آپ کے سامنے موجود ہے۔ یہ لوگ جیسے کچھ فیشن پرست ہیں اور ظاہری آداب و اطوار پر جس طرح جان دیتے ہیں اُس کا حال آپ کو معلوم ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ اِن کے ہاں اصلی قدر کس چیز کی ہے؟ جو فوجی افسر اُن کی سلطنت کا جھنڈا بلند کرنے میں اپنے دل و دماغ اور جسم و جان کی ساری قوتیں صرف کر دے اور فیصلے کے وقت پر کوئی قربانی دینے میں دریغ نہ کرے وہ خواہ اِن کے نقطۂ نظر سے کتنا ہی اُجڈ اور گنوار ہو، کئی کئی دِن شیو نہ کرتا ہو، بے ڈھنگا لباس پہنتا ہو، کھانے پینے کی ذرا تمیز نہ رکھتا ہو، رقص کے فن سے نابلد ہو، مگر اِن سارے عیوب کے باوجود وہ اس کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اور اُسے ترقی کے بلند ترین مرتبے دیں گے۔ بخلاف اس کے جو شخص فیشن، تہذیب، خوش تمیزی، اور سوسائٹی کے مقبولِ عام اطوار کا معیاری مجسمہ ہو لیکن وفاداری و جاں نثاری میں ناقص ہو اور کام کے وقت اپنے مصالح کا زیادہ لحاظ کر جائے اُسے وہ کوئی عزت کا مقام دینا تو درکنار شاید اُس کا کورٹ مارشل کرنے میں بھی دریغ نہ کریں۔ یہ جب دُنیا کے کم عقل انسانوں کی معرفت کا حال ہے تو اپنے خدا کے متعلق آپ کا کیا گمان ہے؟ کیا وہ سونے اور تانبے میں تمیز کرنے کے بجائے محض سطح پر

اشرفی کا ٹھپّہ دیکھکر اشرفی کی قیمت اور پیسہ کا ٹھپہ دیکھکر پیسے کی قیمت لگا دے گا؟

میری اس گذارش کو یہ معنی نہ پہنایئے کہ میں ظاہری محاسن کی نفی کرنا چاہتا ہوں یا اُن احکام کی تعمیل کو غیر ضروری قرار دے رہا ہوں جو زندگی کے ظاہری پہلوؤں کی اصلاح و درستی کے متعلّق دیئے گئے ہیں۔ درحقیقت میں تو اس کا قائل ہوں کہ بندۂ مومن کو ہر اُس حکم کی تعمیل کرنی چاہیئے جو خدا اور رسول نے دیا ہو، اور یہ بھی مانتا ہوں کہ دین انسان کے باطن اور ظاہر دونوں کو درُست کرنا چاہتا ہے۔ لیکن جو چیز میں آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں وُہ یہ ہے کہ مقدم چیز باطن ہے نہ کہ ظاہر۔ پہلے باطن میں حقیقت کا جوہر پیدا کرنے کی فکر کیجیئے، پھر ظاہر کو حقیقت کے مطابق ڈھالئے، آپ کو سب سے بڑھ کر اور سب سے پہلے اُن اوصاف کی طرف توجّہ کرنی چاہیئے جو اللہ کے ہاں اصلی قدر کے مستحق ہیں اور جنہیں نشوونما دینا انبیاء علیہم السّلام کی بعثت کا اصلی مقصود تھا۔ ظاہر کی آراستگی اوّل تو ان اوصاف کے نتیجے میں فطرۃً خود ہی ہوتی چلی جائے گی، اور اگر اس میں کچھ کسر رہ جائے تو تکمیلی مراحل میں اس کا اہتمام بھی کیا جاسکتا ہے۔

دوستو اور رفیقو! مَیں نے بیماری اور کمزوری کے باوجود آج یہ طویل تقریر آپ کے سامنے صرف اس لئے کی ہے کہ میں امرِ حق کو پوری وضاحت کے ساتھ آپ تک پہنچا کر خدا کے حضور بری الذمہ ہونا چاہتا ہوں۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ کب اس کی مُہلتِ عمر آن پوری ہو۔ اس لئے میں ضروری

سمجھتا ہوں کہ حق پہنچانے کی جو ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ اس سے سبکدوش ہو جاؤں۔ اگر کوئی امر وضاحت طلب ہو تو پوچھ لیجیے، اگر میں نے کوئی بات خلاف حق بیان کی ہو تو اس کی تردید کر دیجیے اور اگر میں نے ٹھیک ٹھیک حق آپ تک پہنچا دیا ہے تو اس کی گواہی دیجیے (آوازیں: ہم گواہ ہیں، آپ بھی گواہ رہیں اور خدا بھی گواہ ہو، میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ مجھے اور آپ کو، سب کو اپنے دین کا صحیح فہم بخشے اور اس فہم کے مطابق دین کے سارے تقاضے اور مطالبے پورے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

کتبہٗ العاصی محمد صدیق کاتب گوجرانوالہ

اسلامی مقالات کا سلسلہ (۶)

اِنسان کا معاشی مسئلہ

اور

اِس کا اِسلامی حل

سید ابو الاعلیٰ مودودی

انسان کا معاشی مسئلہ

اور اس کا

اسلامی حل

از

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مکتبہ جماعت اسلامی - ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور

قیمت ۸/

سید ابوالاعلیٰ مودودی طابع و ناشر نے
آفتاب عالم پریس لاہور میں چھپوا کر مکتبہ جماعت
اسلامی، اچھرہ سے شائع کیا۔

بار پنجم — ۱۹۴۸ء — دو ہزار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۵

انسان کا معاشی مسئلہ

اور اس کا اسلامی حل

(یہ مقالہ ۳۱ر اکتوبر ۱۹۴۱ء کو انجمن اسلامی تاریخ و تمدن کی دعوت پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں بمقام اسٹریچی ہال پڑھا گیا)

موجودہ زمانے میں ملکوں اور قوموں کے، اور بحیثیت مجموعی دنیا کے معاشی مسائل کو جو اہمیت دی جا رہی ہے، شاید اس سے پہلے کم از کم نمایاں طور پر ان کو اتنی اہمیت کبھی نہیں دی گئی۔ "نمایاں طور پر" کا لفظ میں اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ حقیقت میں تو انسان کی زندگی میں اس کی معاش جس قدر اہمیت رکھتی ہے اس کے لحاظ سے ہر زمانہ میں، افراد، جماعتوں، قوموں، ملکوں، اور تمام انسانوں نے اس کی طرف بہر حال توجہ کی ہے، لیکن آج اس توجہ کو جس چیز نے زیادہ نمایاں کر دیا ہے وہ معاشیات کے نام سے ایک باقاعدہ علم کا بڑی بڑی کتابوں، بھاری بھرکم اصطلاحوں، اور پُرشوکت اداروں کے ساتھ موجود ہونا، اور ساتھ ہی ضروریات زندگی کی پیدائش، فراہمی اور اکتساب کے طریقوں کا پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے چلے جانا ہے۔ ان اسباب سے آج معاشی مسائل پر بحث و گفتگو اور عالمانہ تحقیق کا وہ زور شور ہے کہ ان کے آگے انسانی زندگی کے سارے مسائل دب کر رہ گئے ہیں لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جس چیز پر دنیا بھر کی توجہات اس طرح مرکوز ہو گئی

ہیں وہ بجائے سلجھنے اور صاف ہونے کے اور زیادہ الجھتی اور معمابنتی چلی جاتی ہے علم المعیشت کی موٹی موٹی اصطلاحوں نے اور ماہرین معاشیات کی عالمانہ موشگافیوں نے عام لوگوں کو اس قدر دہشت زدہ کردیا ہے کہ وہ غریب ان اعلیٰ درجہ کی فنی بحثوں کو سن کر اس طرح اپنے معاشی مسئلہ کی ہولناکی سے مرعوب اور اسکے حل کی تمام توقعات سے مایوس ہوجاتے ہیں جس طرح ایک بیمار کسی ڈاکٹر کی زبان سے اپنی بیماری کا کوئی موٹا سا لاطینی نام سن کر ہول کھاجاتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ جب مجھے ایسی سخت بیماری لاحق ہوگئی ہے تو میری جان کا اب اللہ ہی حافظ ہے۔ لا بحہ ان اصطلاحوں اور فنی بحثوں کا غلاف اتار کر سیدھے سادے فطری طریقے سے دیکھا جائے تو انسان کا معاشی مسئلہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے، اور اس مسئلہ کے حل کی مختلف صورتیں جو دنیا میں اختیار کی گئی ہیں انکے مفید اور مضر پہلو بھی بغیر کسی دقت کے دیکھے جاسکتے ہیں، اور اس کے حل کی صحیح فطری صورت جو کچھ ہوسکتی ہے اس کے سمجھنے میں بھی کوئی مشکل باقی نہیں رہتی۔

اصطلاحات کے چکر اور فنی پیچیدگیوں کے طلسمات نے اس مسئلہ کو جس قدر اُلجھایا ہے اُس پر مزید الجھن اس وجہ سے بھی پیدا ہوگئی ہے کہ انسان کے معاشی مسئلہ کو، جو دراصل انسانی زندگی کے عظیم تر مسئلہ کا ایک جز تھا، مجموعہ سے الگ کرکے بجائے خود ایک مستقل مسئلے کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا، اور رفتہ رفتہ یہ ہے اتنی بڑھی کہ معاشی مسئلے ہی کو پوری زندگی کا مسئلہ سمجھ لیا گیا۔ یہ پہلی غلطی سے بھی زیادہ بڑی غلطی ہے جس کی وجہ سے اس گتھی کا سلجھنا محال ہوگیا ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی امراض جگر کا ماہر انسانی جسم کے مجموعی نظام سے

الگ کر کے، اور اس نظام میں جگر کی جو حیثیت ہے اس کو نظر انداز کر کے جگر کو بس جگر ہونے کی حیثیت سے دیکھنا شروع کر دے، اور پھر اس دیکھنے میں اتنا مستغرق ہو کہ آخرکار اسے پورا انسانی جسم بس ایک جگر ہی جگر نظر آنے لگے۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اگر انسانی صحت کے سارے مسائل کو صرف جگریات سے حل کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ مسائل کس قدر ناقابل حل ہو جائیں گے اور آدمی بیچارے کی جان کس قدر شدید خطرے میں مبتلا ہو کر رہے گی۔ بس اسی پر قیاس کر لیجئے کہ جب معاشیات کو انسانیات کے مجموعے میں سے نکال کر الگ کر لیا جائے اور پھر اسی کو عین انسانیات قرار دے کر سارے مسائل زندگی اسی سے حل کئے جانے لگیں تو بجز سرگشتگی و حیرانی کے اور کیا حاصل ہو سکتا ہے۔

دورِ جدید کے فتنوں میں سے یہ ماہرین خصوصی (Specialistis) کا فتنہ بھی ایک بڑا فتنہ ہے۔ زندگی اور اس کے مسائل پر مجموعی نظر کم سے کم تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ انسان مختلف علوم و فنون کے یک چشم ماہرین کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ گیا ہے۔ کوئی طبیعیات کا ماہر ہے تو وہ ساری کائنات کا معما صرف طبیعیات کے بل پر حل کرنے لگتا ہے کسی کے دماغ پر نفسیات کا تسلط ہے تو وہ اپنے نفسیاتی تجربات و مشاہدات کے اعتماد پر پورا فلسفۂ حیات مرتب کرنا چاہتا ہے کسی اللہ کے بندے کی نظر صنفیات پر جم کر رہ گئی ہے تو وہ کہتا ہے کہ پوری انسانی زندگی بس شہوانیت (Sex) کے محور پر گھوم رہی ہے۔ حتیٰ کہ خدا کا خیال بھی انسان کے دماغ میں اسی رستہ سے آیا ہے۔ اسی طرح جو لوگ معاشیات میں مستغرق ہیں وہ انسان کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ معاش تیری زندگی کا اصل مسئلہ ہے اور باقی سارے مسائل اسی

جڑ کی شاخیں ہیں۔ حالانکہ اصل حقیقت جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ یہ سب ایک کُل کے مختلف پہلو
ہیں۔ اُس کُل کے اندر ان سب کا ایک خاص مقام ہے اور اس مقام کے لحاظ ہی سے ان
کی اہمیت بھی ہے۔ انسان ایک جسم رکھتا ہے جو قوانین طبیعی کے تحت ہے، اس لحاظ سے
انسان طبیعیات کا موضوع بھی ہے، مگر وہ نِرا جسم ہی نہیں ہے کہ صرف طبیعیات سے اس
کے سارے مسائل حل کئے جا سکیں۔ انسان ایک ذی حیات ہستی ہے جس پر حیاتی قوانین
جاری ہوتے ہیں، اس لحاظ سے وہ علم الحیات (Biology) کا موضوع ہے، مگر
وہ نِرا ذی حیات نہیں ہے کہ صرف حیاتیات یا حیوانیات (Zoology) ہی سے
اس کی زندگی کا پورا قانون اخذ کیا جا سکے۔ انسان کو زندہ رہنے کیلئے غذا کی، پوشش کی
اور مکان کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، اس لحاظ سے معاشیات اس کی زندگی کے ایک
اہم شعبہ پر حاوی ہے، مگر وہ محض ایک کھانے پہننے اور گھر بنا کر رہنے والا حیوان ہی
نہیں ہے کہ تنہا معاشیات ہی پر اس کے فلسفۂ حیات کی بنا رکھ دی جائے۔ انسان
اپنی نوع کو باقی رکھنے کے لئے تناسل پر بھی مجبور ہے جس کے لئے اس کے اندر ایک زبردست
صنفی میلان پایا جاتا ہے، اس لحاظ سے صنفیات کا علم بھی اس کی زندگی کے ایک اہم
پہلو سے تعلق رکھتا ہے، مگر وہ بالکل نسل کشی کا آلہ ہی نہیں ہے کہ بس صنفیات ہی کی عینک
لگا کر اسے دیکھا جانے لگے۔ انسان ایک نفس رکھتا ہے جس میں شعور و ادراک کی مختلف
قوتیں اور جذبات و خواہشات کی مختلف طاقتیں ہیں، اس لحاظ سے نفسیات اس کے وجود کے
ایک بڑے شعبے پر محیط ہے لیکن وہ از سر تا پا نفس ہی نفس نہیں ہے کہ نفسیات کے علم سے
اس کی زندگی کی پوری اسکیم بنائی جا سکے۔ انسان ایک متمدن ہستی ہے جو عین اپنی
فطرت کے لحاظ سے مجبور ہے کہ دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر رہے، اس لحاظ

سے اس کی زندگی کے بہت سے پہلو عمرانیات کے تحت آتے ہیں لیکن متمدن ہستی ہونا اس کا تمام وجود نہیں ہے کہ محض علوم عمران کے ماہرین بیٹھ کر اس کے لئے مکمل نظام حیات وضع کر سکیں۔ انسان ایک ذی عقل ہستی ہے جس کے اندر محسوسات سے ماوراء معقولات کی طلب بھی پائی جاتی ہے اور وہ عقلی اطمینان چاہتا ہے۔ اس لحاظ علوم عقلیہ اس کے ایک خاص مطالبہ کو پورا کرتے ہیں، مگر وہ پورا کا پورا عقل ہی نہیں ہے کہ محض معقولات کے بل بوتے پر اس کے لئے ایک لائحہ زندگی بنایا جا سکے۔ انسان ایک اخلاقی و روحانی وجود ہے جس میں بھلے اور برے کا امتیاز، اور محسوسات و معقولات دونوں سے ماوراء حقیقتوں تک پہنچنے کا داعیہ بھی پایا جاتا ہے، اس لحاظ سے اخلاقیات و روحانیات اس کے ایک اور اہم مطالبہ کو پورا کرتے ہیں، مگر وہ از سرتاپا اخلاق اور روح ہی نہیں ہے کہ مجرد اخلاقیات و روحانیات سے اس کے لیے پورا نظام زندگی بنایا جا سکے۔ دراصل انسان بیک وقت یہ سب کچھ ہے، اور ان تمام حیثیتوں کے علاوہ اس کی ایک حیثیت یہ بھی ہے کہ اپنے تمام وجود اور اپنی زندگی کے سارے شعبوں سمیت وہ کائنات کے اس عظیم الشان نظام کا ایک جزء ہے اور اس کی زندگی کا ضابطہ لازمی طور پر اس امر کا تعین چاہتا ہے کہ اس کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے اور اس کا جزء ہونے کی حیثیت سے اس کو کس طرح کام کرنا چاہیے۔ نیز اس کے لئے یہ بھی ناگزیر ہے کہ وہ اپنے مقصدِ زندگی کا تعین کرے اور اسی کے لحاظ سے فیصلہ کرے کہ اسے کس لئے کام کرنا ہے۔ یہ آخری دونوں سوال انسانی زندگی کے بنیادی سوال ہیں۔ انہیں سے ایک فلسفۂ حیات بنتا ہے، پھر اس فلسفۂ حیات کے تحت تمام وہ علوم جو دنیا اور انسان سے تعلق رکھتے ہیں اپنے اپنے دائرہ کی معلومات فراہم کرتے ہیں اور حکم و بینان سب سے

رہ کر ایک لائحۂ عمل بنتا ہے جس پر انسانی زندگی کا پورا کارخانہ چلتا ہے۔
اب یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر آپ اپنی زندگی کے کسی مسئلے کو سمجھنا چاہیں تو اس کے لئے یہ کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے کہ آپ خوردبین لگا کر صرف اسی ایک مسئلہ پر نظر کو محدود کر کے دیکھیں یا اس خاص شعبۂ حیات کے لئے جس سے وہ مسئلہ تعلق رکھتا ہے ایک قسم کا تعصب لئے ہوئے پورے مجموعۂ حیات پر نظر ڈالیں بلکہ صحیح فہم و ادراک کے لئے آپ کو پورے مجموعے کے اندر رکھ کر اسے دیکھنا ہوگا اور غیر متعصبانہ نگاہ سے دیکھنا ہوگا۔ اسی طرح اگر آپ زندگی کے توازن میں کوئی بگاڑ پائیں اور اس کو درست کرنا چاہیں تو یہ اور بھی زیادہ خطرناک ہے کہ آپ کسی ایک مسئلہ زندگی کو کل مسئلہ زندگی قرار دے کر سارے کارخانہ کو اسی ایک پرزے کے گرد گھما دیں۔ اس حرکت سے تو آپ اور زیادہ عدمِ توازن پیدا کر دیں گے۔ صحیح طریقۂ اصلاح یہ ہے کہ غیر متعصبانہ نگاہ سے پورے نظامِ زندگی کو اسکے بنیادی فلسفے سے لے کر شاخوں کی تفصیلات تک دیکھئے اور تحقیق کیجیے کہ خرابی کس جگہ اور کس نوعیت کی ہے۔

انسان کے معاشی مسئلے کو سمجھنے اور صحیح طور پر حل کرنے میں جو مشکل پیش آ رہی ہے اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ اس مسئلہ کو بعض لوگ صرف معاشیات کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بعض اس کی اہمیت میں مبالغہ کر کے اُسے کل مسئلہ زندگی قرار دے رہے ہیں، اور بعض اس سے بھی تجاوز کر کے زندگی کا بنیادی فلسفہ اور اخلاق اور تمدن و معاشرت کا سارا نظام معاشی بنیادوں پر قائم کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ اگر معاشیات ہی کو اساس ٹھیرایا جائے تو انسان کا مقصدِ زندگی اُس بیل کے مقصدِ زندگی سے کچھ بھی مختلف نہیں ٹھیرتا جس کی تمام سعی و جہد کی غایت یہ ہے کہ ہری ہری گھاس کھا کر خوش

وخرم اور تنومند ہو جائے، اور کائنات میں اس کی یہ حیثیت قرار پاتی ہے کہ وہ بس چراگاہِ عالم میں ایک آزاد چرندہ ہے۔ اسی طرح اخلاقیات، روحانیات، معقولات، عمرانیات نفسیات اور تمام دوسرے علوم کے دائروں میں بھی معاشی نقطۂ نظر کے غالب آجانے سے نہایت شدید عدمِ توازن کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، کیونکہ ان شعبہ ہائے زندگی کے لئے معاشیات میں کوئی بنیاد اس کے سوا نہیں ہے کہ اخلاق و روحانیت نفس پرستی و مادہ پرستی ہیں، اور معقولات، ماکولات میں تبدیل ہو جائیں، عمرانیات کی ساری ترتیب حقائقِ عمرانی کے بجائے کاروباری اغراض پر قائم ہو اور نفسیات میں انسان کا مطالعہ محض ایک معاشی حیوان کی حیثیت سے کیا جانے لگے۔ کیا اس سے بڑھ کر انسانیت پر کوئی اور ظلم ہو سکتا ہے؟

اصل معاشی مسئلہ

اب اگر ہم اصطلاحی اور فنی پیچیدگیوں سے بچ کر ایک سیدھے سادے طریقے سے دیکھیں تو انسان کا معاشی مسئلہ ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ تمدن کی رفتار ترقی کو قائم رکھتے ہوئے کس طرح تمام انسانوں کو ان کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچنے کا انتظام ہو اور کس طرح سوسائٹی میں ہر شخص کو اپنی استعداد اور قابلیت کے مطابق ترقی کرنے اور اپنی شخصیت کو نشوونما دینے اور اپنے کمالِ لائق تک پہنچنے کے مواقع حاصل رہیں۔

قدیم ترین زمانہ میں انسان کے لئے معاش کا مسئلہ قریب قریب اتنا ہی سہل تھا جتنا حیوانات کے لئے ہے۔ خدا کی زمین پر بےشمار سامانِ زندگی پھیلا ہوا ہے۔ ہر مخلوق کے لئے جس قدر رزق کی ضرورت ہے وہ بافراط مہیا ہے۔ ہر ایک اپنا رزق تلاش کرنے کے لئے نکلتا ہے اور جا کر خزائنِ رزق میں سے حاصل کر لیتا ہے۔ کسی

کو نہ اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے اور نہ اس کا رزق کسی دوسری مخلوق کے قبضہ میں ہے۔ تقریباً یہی حالت انسان کی بھی تھی کہ گیا اور قدرتی رزق، خواہ وہ پھلوں کی شکل میں ہو، یا شکار کے جانوروں کی شکل میں، حاصل کر لیا۔ قدرتی پیداوار سے بدن ڈھانکنے کا انتظام کر لیا۔ زمین میں جہاں موقع دیکھا ایک سر چھپانے اور پڑ رہنے کی جگہ بنا لی لیکن خدا نے انسان کو اس لئے پیدا نہیں کیا تھا کہ وہ زیادہ مدت تک اسی حال میں رہے۔ اس نے انسان کے اندر ایسے فطری داعیات رکھے تھے کہ وہ انفرادیت چھوڑ کر اجتماعی زندگی اختیار کرے، اور اپنی صنعت سے اپنے لئے ان ذرائع زندگی سے بہتر ذرائع پیدا کرے جو قدرت نے مہیا کئے تھے۔ عورت اور مرد کے درمیان دائمی تعلق کی فطری خواہش، انسانی بچے کا طویل مدت تک ماں باپ کی پرورش کا محتاج ہونا، اپنی نسل کے ساتھ انسان کی گہری دلچسپی اور خونی رشتوں کی محبت یہ وہ چیزیں تھیں جو اسے اجتماعی زندگی پر مجبور کرنے کے لئے خود فطرت ہی نے اس کے اندر رکھ دی تھیں۔ اس طرح انسان کا خودرَو پیداوار پر قانع نہ ہونا اور زراعت سے اپنے لئے خود غلہ پیدا کرنا، پتوں سے جسم ڈھانکنے پر قانع نہ ہونا اور اپنی صنعت سے اپنے لئے لباس تیار کرنا، غاروں اور بھٹوں میں رہنے پر مطمئن نہ ہونا اور اپنے لئے خود مکان بنانا، اپنی ضروریات کے لئے جسمانی آلات ایجاد کرنا، یہ بھی فطرت ہی نے اس کے اندر ودیعت کیا تھا، اور اس کا بھی لازمی نتیجہ یہی تھا کہ وہ رفتہ رفتہ متمدن ہو۔ پس اگر انسان متمدن ہوا تو اس نے کوئی جرم نہیں کیا بلکہ عین اس کی فطرت کا تقاضا اور اس کے خالق کا منشا یہی تھا۔

تمدن کی پیدائش کے ساتھ چند چیزیں ناگزیر تھیں:۔

ایک یہ کہ انسان کی ضروریات زندگی بڑھ گئیں اور ہر شخص خود اپنی تمام ضروریات

فراہم نہ کر سکے بلکہ اس کی کچھ ضرورتیں دوسروں سے اور دوسروں کی اس سے متعلق ہوں۔

دوسرے یہ کہ ضروریات زندگی کا مبادلہ (Exchange) عمل میں آئے اور رفتہ رفتہ مبادلۂ اشیاء کا ایک واسطہ (Medium of Exchange) مقرر ہو جائے۔

تیسرے یہ کہ اشیائے ضرورت تیار کرنے کے آلات اور حمل و نقل کے وسائل میں اضافہ ہو اور جتنی نئی چیزیں انسان کے علم میں آئیں اُن سب سے وہ فائدہ اٹھاتا چلا جائے۔

چوتھے یہ کہ آدمی کو اس امر کا اطمینان حاصل ہو کہ وہ چیزیں جن کو اُس نے خود اپنی محنت سے حاصل کیا ہے، وہ آلات جن سے وہ کام کرتا ہے، وہ زمین جس پر اس نے گھر بنایا ہے، وہ جگہ جس میں وہ اپنے پیشہ کا کام کرتا ہے، یہ سب اسی کے قبضہ میں رہیں گی اور اس کے بعد اُن لوگوں کی طرف منتقل ہوں گی جو دوسروں کی بہ نسبت اس سے قریب تر ہیں۔

اس طرح مختلف پیشوں کا پیدا ہونا، خرید و فروخت، اشیاء کی قیمتوں کا تعین، روپے کا معیارِ قیمت کی حیثیت سے جاری ہونا، بین الاقوامی لین دین اور درآمد برآمد تک نوبت پہنچنا، نئے نئے آلات و وسائل پیدائش (Means of Production) کا استعمال میں آنا، اور حقوقِ ملکیت و وراثت کا وجود میں آنا، یہ سب عین مقتضائے فطرت تھا اور ان میں سے کوئی چیز بھی گناہ نہ تھی کہ اب اس سے توبہ کرنے کی ضرورت ہو۔

مزید برآں تمدن کے نشو و نما کے ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ :-

(۱) مختلف انسانوں کی قوتوں اور قابلیتوں کے درمیان جو فرق خود فطرت نے رکھا ہے اس کی وجہ سے بعض انسانوں کو اپنی اصلی ضرورت سے زیادہ کمانے کا موقع مل جائے اور بعض اپنی ضرورت کے مطابق اور بعض اس سے کم کمائیں۔

(۲) وراثت کے ذریعہ سے بھی بعض کو زندگی کا آغاز کرنے کے لیے اچھے وسائل مل جائیں اور بعض کم وسائل کے ساتھ اور بعض بے وسیلہ کارزارِ حیات میں قدم رکھیں

(۳) قدرتی اسباب سے ہر آبادی میں ایسے لوگ موجود رہیں جو کسبِ معاش کے کام میں حصّہ لینے اور اسبابِ زندگی کے مبادلہ میں شریک ہونے کے قابل نہ ہوں، مثلاً بچے، بوڑھے، بیمار، معذور وغیرہ۔

(۴) بعض انسان خدمت لینے والے اور بعض خدمت انجام دینے والے ہوں اور اس طرح آزادانہ صنعت و تجارت اور زراعت کے علاوہ نوکری اور مزدوری کی صورتیں بھی پیدا ہو جائیں۔

یہ سب بھی بجائے خود انسانی تمدن کے فطری مظاہر اور قدرتی پہلو ہیں۔ ان صورتوں کا رونما ہونا بھی اپنی جگہ کوئی برائی یا گناہ نہیں ہے کہ ان کے استیصال کی فکر کی جائے تمدن کی خرابی کے دوسرے اسباب سے جو برائیاں پیدا ہوئی ہیں اُن کے اصل سبب کو نہ پاکر بہت سے لوگ گھبرا اُٹھتے ہیں اور کبھی شخصی ملکیت کو، کبھی روپے کو، کبھی مشین کو، کبھی انسانوں کی فطری نا مساوات کو، اور کبھی خود تمدن ہی کو کوسنے لگتے ہیں لیکن درحقیقت یہ غلط تشخیص اور غلط تجویزِ علاج ہے۔ انسانی فطرت کے تقاضے سے تمدن میں جو نشو و نما ہوتا ہے، اور اس نشو و نما سے فطرتاً جو صورتیں رونما ہوتی ہیں اُن کو روکنے کی ہر کوشش نادانی ہے اور اس کے نتیجہ میں فلاح کے بجائے تباہی و نقصان کا زیادہ امکان ہے۔

انسان کا اصل معاشی مسئلہ یہ نہیں ہے کہ تمدّن کی ترقی کو کس طرح روکا جائے، یا اس کے قدرتی مظاہر کو کس طرح بدلا جائے۔ بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ تمدن کے نشو و نما کی فطری رفتار کو برقرار رکھتے ہوئے اجتماعی ظلم و بے انصافی کو کیسے روکا جائے اور

فطرت کا یہ منشاء کہ ہر مخلوق کو اس کا رزق پہنچے اکیونکر پورا کیا جائے، اور اُن رکاوٹوں کو کس طرح دور کیا جائے جن کی بدولت بہت سے انسانوں کی قوتیں اور قابلیتیں محض وسائل کے فقدان کی وجہ سے ضائع ہو جاتی ہیں۔

معاشی انتظام کی خرابی کا سبب اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ خرابی کے اصل اسباب کیا ہیں اور خرابی کی نوعیت کیا ہے۔

نظامِ معیشت کی خرابی کا نقطۂ آغاز خود غرضی کا حدِ اعتدال سے بڑھ جانا ہے پھر دوسرے رذائل اخلاق اور ایک فاسد نظامِ سیاست کی مدد سے یہ چیز بڑھتی اور پھیلتی ہے یہاں تک کہ پورے معاشی انتظام کو خراب کر کے زندگی کے باقی شعبوں میں بھی اپنا زہریلا اثر پھیلا دیتی ہے ابھی میں بیان کر چکا ہوں کہ شخصی ملکیت اور بعض انسانوں کا بعض کی بہ نسبت بہتر معاشی حالت میں ہونا، یہ دونوں عین فطرت کے مقتضیات تھے اور بجائے خود ان میں کوئی خرابی نہ تھی۔ اگر انسان کی تمام اخلاقی صفات کو توازن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا اور خارج میں بھی ایک ایسا نظامِ سیاست موجود ہوتا جو زور و قوت کے ساتھ عدل قائم رکھتا تو ان سے کوئی خرابی پیدا نہ ہو سکتی تھی لیکن جس چیز نے انہیں خرابیوں کی پیدائش کا ذریعہ بنا دیا وہ یہ تھی کہ جو لوگ فطری اسباب سے بہتر معاشی حیثیت رکھتے تھے وہ خود غرضی تنگ نظری، بداندیشی، بخل، حرص، بددیانتی اور نفس پرستی میں مبتلا ہو گئے شیطان نے انہیں یہ سمجھایا کہ تمہاری اصلی ضرورت سے زائد جو وسائلِ معیشت تمہیں ملتے ہیں اور جن پر تمہیں حقوقِ مالکانہ حاصل ہیں، اُن کے صحیح و معقول مصرف صرف دو ہیں۔ ایک یہ کہ ان کو اپنی آسائش، آرائش، لطف، تفریح اور خوش باشی میں صرف کرو۔ دوسرے یہ کہ ان کو مزید وسائلِ معیشت پر قبضہ کرنے کے لئے استعمال کرو، اور بن پڑے تو انہیں

کے ذریعہ سے انسانوں کے خدا اور اَن داتا بھی بن جاؤ۔
پہلی شیطانی تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولتمندوں نے جماعت کے ان افراد کا حق ماننے سے انکار کر دیا جو دولت کی تقسیم میں حصہ پانے سے محروم رہ جاتے ہیں یا اپنی اصلی ضرورت سے کم حصہ پاتے ہیں۔ انہوں نے یہ بالکل جائز سمجھا کہ ان لوگوں کو فاقہ کشی اور خستہ حالی میں چھوڑ دیا جائے۔ اُن کی تنگ نظری نے یہ نہ دیکھا کہ اس رویہ کی وجہ سے انسانی جماعت کے بہت سے افراد جرائم پیشہ بنتے ہیں، جہالت اور دنائتِ اخلاق میں مبتلا ہوتے ہیں، جسمانی کمزوری اور امراض کا شکار ہوتے ہیں، ان کی ذہنی و جسمانی قوتیں نشوونما پانے اور انسانی تہذیب و تمدن کے ارتقاء میں اپنا حصہ ادا کرنے سے رہ جاتی ہیں، اور اس سے وہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی نقصان اٹھاتی ہے جس کے وہ خود بھی ایک جز ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ ان دولتمندوں نے اپنی اصلی ضروریات پر بیشمار اور ضروریات کا اضافہ کیا اور بہت سے انسانوں کو جن کی قابلیتیں تمدن و تہذیب کی بہتر خدمات کے لئے استعمال ہو سکتی تھیں، اپنے نفسِ شریرہ کی خود ساختہ ضرورتوں کے پورا کرنے میں استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اُن کے لئے زنا ایک ضرورت تھی جس کی خاطر فاحشہ عورتوں اور قرمساقوں اور دیوثوں کا ایک لشکر فراہم ہوا۔ ان کے لئے غنا بھی ایک ضرورت تھی جس کی خاطر گویوں، گنجنیوں، سازندوں، اور آلاتِ موسیقی تیار کرنے والوں کی ایک اور فوج تیار کی گئی۔ اُن کے لئے بے شمار قسم کی تفریحات بھی ضروری تھیں جن کی خاطر مسخروں، نقالوں، ایکٹروں اور ایکٹرسوں، داستان گوؤں، مصوّروں اور نقاشوں اور بہت سے فضول پیشہ وروں کا ایک اور گروہ کثیر مہیا کیا گیا۔ ان کے لئے شکار بھی ضروری تھا جس کی خاطر بہت سے انسان کوئی بھلا کام کرنے کے بجائے اس کام پر لگائے گئے کہ جنگلوں میں جانوروں کو ہانکتے پھریں۔ اُن کے

لئے سرور ونشاط اور خود رفتگی بھی ایک ضرورت تھی جس کی خاطر بہت سے انسان شراب، کوکین
افیون اور دوسرے مسکرات کی فراہمی میں مشغول کئے گئے۔ غرض اس طرح ان شیطان کے
بھائیوں نے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہ کیا کہ بے رحمی کے ساتھ سوسائٹی کے ایک بڑے
حصّہ کو اخلاقی، روحانی اور جسمانی تباہی میں مبتلا ہونے کے لئے چھوڑ دیا ہو، بلکہ مزید ظلم یہ کیا
کہ ایک اور بڑے حصّہ کو صحیح اور مفید کاموں سے ہٹا کر بیہودہ، ذلیل اور نقصان دہ کاموں
میں لگا دیا، اور تمدن کی رفتار کو راہِ راست سے ہٹا کر ایسے راستوں کی طرف پھیر دیا جو انسان
کو تباہی کی طرف لے جانے والے ہیں۔ پھر معاملہ اسی پر ختم نہیں ہو گیا۔ انسانی سرمایہ
(Human Capital) کو ضائع کرنے کے ساتھ انہوں نے مادی سرمایہ کو
بھی غلط طریقہ سے استعمال کیا۔ ان کو محلات، کوٹھیوں، گلستانوں، تفریح گاہوں،
ناچ گھروں وغیرہ کی ضرورت لاحق ہوئی، حتیٰ کہ مرنے کے بعد زمین میں لیٹنے کے لئے
بھی ان کمبختوں کو ایکڑوں زمین اور عالی شان عمارتوں کی حاجت درپیش ہوئی اور اس
طرح وہ زمین، وہ سامانِ تعمیر، اور وہ انسانی محنت جو بہت سے بندگانِ خدا کے لئے سکونت
کا انتظام کرنے کو کافی ہو سکتی تھی، ایک ایک عیّاش آدمی کے مستقر اور مستودع پر صرف
ہو گئی۔ ان کو زیوروں، نفیس لباسوں، اعلیٰ درجہ کے آلات و ظروف، زینت و آرائش کے
سامانوں، شاندار سواریوں اور نہ معلوم کن کن چیزوں کی ضرورت پیش آئی، حتیٰ کہ ان مکانوں
کے دروازے بھی قیمتی پردوں کے بغیر ننگے رہے جاتے تھے، ان کی دیواریں بھی
سینکڑوں اور ہزاروں روپے کی تصویروں سے مزیّن ہوئے بغیر نہ رہ سکتی تھیں، ان
کے کمروں کی زمین بھی ہزاروں روپے کے قالین اوڑھنا چاہتی تھی، اُن کے کتّوں کو
بھی مخمل کے گدّے اور سونے کے پٹے درکار تھے۔ اس طرح وہ بہت سا مواد اور وہ

کثیر انسانی عمل جو ہزار ہا انسانوں کا تن ڈھانکنے اور پیٹ بھرنے کے کام آسکتا تھا۔ ایک ایک شخص کی نفس پرستی کے لئے وقف ہو گیا۔

یہ تو شیطانی رہنمائی کے ایک حصہ کا نتیجہ تھا۔ دوسری رہنمائی کے نتائج اس سے بھی زیادہ خراب نکلے۔ یہ اصول کہ اپنی اصلی ضرورت سے زائد جو وسائل معیشت کسی انسان کے قبضہ میں آگئے ہوں اُن کو وہ جمع کرتا چلا جائے اور پھر مزید وسائل معیشت حاصل کرنے کے لئے استعمال کرے، اوّل تو بداہتہً غلط ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا نے معیشت کے اسباب جو زمین پر پیدا کئے ہیں یہ مخلوق کی حقیقی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے پیدا کئے ہیں۔ تمہارے پاس خوش قسمتی سے اگر کچھ زیادہ اسباب آگئے ہیں تو یہ دوسروں کا حصہ ہے جو تم تک پہنچ گیا۔ اسے جمع کرنے کہاں چلے ہو؟ اپنے گردوپیش دیکھو، جو لوگ سامانِ زیست میں سے اپنا حصہ حاصل کرنے کے قابل نظر نہیں آتے، یا اُسے حاصل کرنے میں ناکام رہ گئے ہیں، یا جنہوں نے اپنی ضرورت سے کم پایا ہے، سمجھ لو کہ یہی وہ لوگ ہیں جن کا حصہ تمہارے پاس پہنچا ہے، وہ حاصل نہیں کرسکے تو تم ان تک پہنچا دو۔ یہ صحیح کام کرنے کے بجائے اگر تم ان اسباب کو اور زیادہ اسبابِ معاش حاصل کرنے کے لئے استعمال کرو گے تو یہ غلط کام ہو گا، کیونکہ بہر حال وہ مزید اسباب جو تم حاصل کرو گے تمہاری ضرورت سے اور بھی زیادہ ہوں گے۔ پھر ان کے حصول کی کوشش بجز اس کے کہ تمہاری حرص و ہوس کی تسکین کا ذریعہ ہو اور کیا مفید پہلو رکھتی ہے؟ حصولِ معاش کی سعی میں تم اپنے وقت، محنت اور قابلیت کا جتنا حصہ اپنی ضروریاتِ زندگی فراہم کرنے کے لئے صرف کرتے ہو وہ تو صحیح اور معقول مصرف میں صرف ہوتا ہے مگر اس واقعی ضرورت سے زائد ان چیزوں کو اس کام میں صرف کرنے کے معنی یہ ہیں کہ تم معاشی حیوان بلکہ دولت

پیدا کرنے کی مشین بن رہے ہو۔ حالانکہ تمہارے وقت، محنت اور ذہنی و جسمانی قوتوں کے لئے کسب معاش کے سوا اور زیادہ بہتر مصرف بھی ہیں پس عقل اور فطرت کے لحاظ سے یہ اصول ہی سرے سے غلط ہے جو شیطان نے اپنے شاگردوں کو سکھایا ہے لیکن اس اصول پر جو عملی طریقے بنے ہیں وہ تو اس قدر قابلِ لعنت اور انکے نتائج اتنے ہولناک ہیں کہ ان کا صحیح تخمینہ بھی مشکل ہے۔

زائد از ضرورت وسائل معیشت کو مزید وسائل قبضہ میں لانے کے لئے استعمال کرنے کی دو صورتیں ہیں:۔

ایک یہ کہ ان وسائل کو سود پر قرض دیا جائے۔

دوسرے یہ کہ انہیں تجارتی اور صنعتی کاموں میں لگایا جائے

یہ دونوں طریقے اپنی نوعیت میں کچھ ایک دوسرے سے مختلف ضرور ہیں لیکن دونوں کے مشترک عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی دو طبقوں میں تقسیم ہو جاتی ہے ایک وہ قلیل طبقہ جو اپنی ضرورت سے زیادہ وسائل معاش رکھتا ہے اور اپنے وسائل کو مزید وسائل کھینچنے کے لئے وقف کر دیتا ہے دوسرا وہ کثیر طبقہ جو اپنی ضرورت کے مطابق یا اس سے کم وسائل رکھتا ہے یا بالکل نہیں رکھتا۔ ان دونوں طبقوں کے مفاد نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے کے خلاف ہوتے ہیں بلکہ لامحالہ ان کے درمیان کشمکش اور نزاع برپا ہوتی ہے، اور یوں انسان کا معاشی انتظام جس کو فطرت نے مبادلہ پر مبنی کیا تھا، محاربہ پر قائم ہو کر رہ جاتا ہے پھر یہ محاربہ جتنا جتنا بڑھتا جاتا ہے، مال دار طبقہ تعداد میں کم اور نادار طبقہ زیادہ ہوتا چلا جاتا ہے، کیونکہ اس محاربہ کی نوعیت ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ جو زیادہ مال دار ہے وہ اپنے مال کے زور سے کم مال دار لوگوں کے وسائل بھی کھینچ لیتا ہے اور انہیں نادار طبقہ میں دھکیل

دیتا ہے۔ اس طرح زمین کے اسباب معاش روز بروز کم اور کم تر حصہ آبادی کے پاس سمٹتے چلے جاتے ہیں اور روز بروز زیادہ اور زیادہ حصہ آبادی مفلس یا مال داروں کا دست نگر ہوتا جاتا ہے۔

ابتداءً یہ محاربہ چھوٹے پیمانہ پر شروع ہوتا ہے، پھر بڑھتے بڑھتے یہ ملکوں اور قوموں تک پھیلتا ہے یہاں تک کہ ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے کر بھی ہل من مزید ہی کی صدا لگاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جب ایک ملک کا عام دستور یہ ہو جاتا ہے کہ جن لوگوں کے پاس اپنی ضرورت سے زائد مال ہو وہ اپنے فاضل مال کو نفع آور کاموں میں لگا دیں اور یہ دولت اشیاء ضرورت کی تیاری پر صرف ہو تو ان کی لگائی ہوئی پوری رقم کا فائدے سمیت وصول ہونا اس بات پر موقوف ہوتا ہے کہ جس قدر اشیاء ملک میں تیار ہوتی ہیں وہ سب کی سب اسی ملک میں خرید لی جائیں، مگر عملاً ایسا نہیں ہوتا اور در حقیقت ہو نہیں سکتا، کیونکہ ضرورت سے کم مال رکھنے والوں کی قوتِ خریداری کم ہوتی ہے اس لئے وہ ضرورتمند ہونے کے باوجود ان چیزوں کو خرید نہیں سکتے، اور ضرورت سے زیادہ مال رکھنے والے اس فکر میں ہوتے ہیں کہ جتنی آمدنی ہو اس میں سے ایک حصہ پس انداز کر کے نفع آور کاموں میں لگائیں، اس لئے وہ اپنا سب مال خریداری پر صرف نہیں کرتے۔ اس طرح لازمی طور پر تیار کردہ مال کا ایک حصہ فروخت ہوئے بغیر رہ جاتا ہے، جس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ مالداروں کی لگائی ہوئی رقم کا ایک حصہ بازیافت ہونے سے رہ گیا اور یہ رقم ملک کی حرفت (Industry) کے ذمہ قرض رہا۔ یہ صرف ایک چکر کا حال ہے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسے جتنے چکر ہوں گے ان میں سے ہر ایک میں مال دار طبقہ اپنی حاصل شدہ آمدنی کا ایک حصہ پھر نفع آور کاموں پر لگاتا چلا جائے گا

اور جو رقمیں بازیافت ہونے سے رہ جاتی ہیں، ان کی مقدار ہر چکر میں بڑھتی چلی جائے گی اور ملک کی حرفت پر ایسے قرض کا بار دوگنا، چوگنا، ہزار گنا ہوتا چلا جائے گا جس کو خود وہ ملک کبھی ادا نہیں کر سکتا۔ اس طرح ایک ملک کو دیوالیہ پن کا جو خطرہ لاحق ہوتا ہے اس سے بچنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں کہ جتنا مال ملک میں فروخت ہونے سے رہ جائے اسے دوسرے ملکوں میں لے جا کر فروخت کیا جائے یعنی ایسے ملک تلاش کئے جائیں جن کی طرف یہ ملک اپنے دیوالیہ پن کو منتقل کر دے۔

یہاں یہ محاربہ ملکی حدود سے گذر کر بین الاقوامی دائرے میں قدم رکھتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ کوئی ایک ملک ہی ایسا نہیں ہے جو اس شیطانی نظام معیشت پر چل رہا ہو، بلکہ دنیا کے اکثر ممالک کا یہی حال ہے کہ وہ اپنے آپ کو دیوالیہ پن سے بچانے کے لئے یا بالفاظ دیگر اپنے دیوالیہ کو کسی اور ملک پر ڈال دینے کے لئے مجبور ہو گئے ہیں۔ اس طرح بین الاقوامی مسابقت شروع ہو جاتی ہے اور وہ چند صورتیں اختیار کرتی ہے:-

اولاً، ہر ملک بین الاقوامی بازار میں اپنا مال بیچنے کے لئے کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم لاگت پر زیادہ سے زیادہ مال تیار کرے۔ اس غرض سے کارکنوں کے معاوضے بہت کم رکھے جاتے ہیں اور اس معاشی کاروبار میں ملک کی عام آبادی اتنا کم حصہ پاتی ہے کہ اس کی اصلی ضروریات بھی پوری نہیں ہوتیں۔

ثانیاً، ہر ملک اپنے حدود میں اور اپنے حلقۂ اثر میں دوسرے ملک کا مال آنے پر بندشیں عائد کرتا ہے، اور خام پیداوار کے جتنے وسائل اس کے زیر اختیار ہیں ان پر بھی پہرے بٹھاتا ہے تاکہ دوسرا ملک ان سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس سے بین الاقوامی کشمکش پیدا ہوتی ہے جس کا انجام جنگ پر ہوتا ہے۔

ثالثاً ایسے ملک جو اس دیوالیہ پن کی مصیبت کو اپنے سر چپکے جانے سے روک نہیں سکتے۔ ان پر لٹیرے ٹوٹ پڑتے ہیں اور صرف اپنے ملک کے بچے کھچے مال ہی کو ان میں فروخت کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ جس دولت کو خود اپنے ہاں نفع آور کام پر لگانے کی گنجائش نہیں ہوتی اسے بھی ان ممالک میں لے جا کر لگاتے ہیں۔ اس طرح آخرکار ان ممالک میں بھی وہی مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے جو ابتداءً خود روپیہ لگانے والے ملکوں میں پیدا ہوا تھا یعنی جس قدر روپیہ وہاں لگایا جاتا ہے وہ سارے کا سارا وصول نہیں ہو سکتا، اور اس روپے سے جتنی بھی آمدنی ہوتی ہے اس کا ایک بڑا حصہ پھر مزید نفع آور کاموں میں لگا دیا جاتا ہے۔ حتّٰی کہ ان ملکوں پر قرض کا بار اتنا بڑھتا چلا جاتا ہے کہ اگر خود ان ملکوں کو بیچ ڈالا جائے تب بھی کل لگائی ہوئی رقم بازیافت نہیں ہو سکتی۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ چکر یونہی چلتا رہے تو بالآخر تمام دنیا دیوالیہ ہو جائے گی اور روئے زمین پر کوئی خطہ ایسا باقی نہ رہے گا جس کی طرف اس دیوالیہ پن کی مصیبت کو منتقل کیا جا سکے، حتّٰی کہ پھر ضرورت پیش آئے گی کہ مشتری اور مریخ اور عطارد میں روپیہ لگانے اور زائد مال کو کھپانے کے لئے مارکیٹ تلاش کئے جائیں۔

اس عالمگیر محاربہ میں بینکروں، آڑھتیوں، اور صنعت و تجارت کے رئیسوں کی ایک مٹھی بھر جماعت تمام دنیا کے معاشی اسباب و وسائل پر اس طرح حاوی ہو گئی ہے کہ ساری نوعِ انسانی ان کے مقابلہ میں بالکل بے بس ہے۔ اب کسی شخص کے لئے قریب قریب ناممکن ہو گیا ہے کہ اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت سے اور اپنے دماغ کی قابلیت سے کوئی آزادانہ کام کر سکے اور خدا کی زمین پر جو اسبابِ زندگی موجود ہیں ان میں سے

خود کوئی حصہ حاصل کر سکے ۔ چھوٹے تاجر، چھوٹے صناع، چھوٹے زراعت پیشہ کے لئے آج دنیا میں عرصۂ حیات میں ہاتھ پاؤں مارنے کی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔ سب کے سب مجبور ہیں کہ معاشی کاروبار کے ان بادشاہوں کے غلام اور نوکر اور مزدور بن کر رہیں، اور یہ لوگ کم سے کم سامانِ زیست کے معاوضے میں ان کے جسم و دماغ کی ساری قوتیں اور ان کا سارا وقت لے لیتے ہیں جس کی وجہ سے پوری نوعِ انسانی بس ایک معاشی حیوان بن کر رہ گئی ہے۔ بہت کم خوش قسمت انسانوں کو اس معاشی کشمکش میں اتنی فرصت نصیب ہوتی ہے کہ اپنے اخلاقی، عقلی، روحانی ارتقا کے لئے بھی کچھ کر سکیں، اور پیٹ بھرنے سے بالاتر بھی کسی مقصد کی طرف توجہ کر سکیں اور اپنی شخصیت کے ان عناصر کو بھی نشوونما دے سکیں جو تلاشِ معاش کے سوا دوسری پاکیزہ تر اغراض کے لئے خدا نے ان کے اندر ودیعت کئے تھے۔ درحقیقت اس شیطانی نظام کی بدولت معاشی کشمکش اس قدر سخت ہو جاتی ہے کہ زندگی کے تمام دوسرے شعبے اس سے ماؤف و معطل ہو جاتے ہیں۔

انسان کی مزید بدنصیبی یہ ہے کہ دنیا کے اخلاقی فلسفے، سیاسی نظامات اور قانونی اصول بھی اس شیطانی نظامِ معیشت سے متاثر ہو گئے۔ مشرق سے مغرب تک ہر طرف اخلاقی معلّمین کفایت شعاری پر زور دے رہے ہیں۔ جتنا کمانا اتنا ہی خرچ کر دینا ایک حماقت اور اخلاقی عیب سمجھا جاتا ہے، اور ہر شخص کو یہ تعلیم دی جاتی ہے کہ اپنی آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کر کے بینک میں ڈپازٹ رکھے، یا انشورنس پالیسی خریدے، یا کمپنیوں کے شیئرز حاصل کرے۔ گویا جو چیز انسانیت کو تباہ کرنے والی ہے وہی اخلاق کی نظر میں معیارِ خوبی بن گئی ہے۔ رہی سیاسی طاقت تو وہ عملاً

بالکل ہی ایک شیطانی نظام کے قبضے میں آچکی ہے۔ وہ بجائے اس کے کہ اس ظلم سے انسان کو بچائے، ظلم کا آلۂ کار بنی ہوئی ہے اور ہر طرف حکومت کی گدیوں پر شیطان کے ایجنٹ بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اسی طرح دنیا کے قوانین بھی اس نظام کے زیر اثر مرتب ہوئے ہیں۔ ان قوانین نے عملاً افراد کو پوری آزادی دے رکھی ہے کہ جس طرح چاہیں جماعت کے مفاد کے خلاف اپنی معاشی اغراض کے لئے جدوجہد کریں۔ روپیہ کمانے کے طریقوں میں جائز اور ناجائز کا امتیاز قریب قریب مفقود ہے۔ ہر وہ طریقہ جس سے کوئی شخص دوسروں کو لوٹ کر یا تباہ کر کے مالدار بن سکتا ہو، قانون کی نظر میں جائز ہے۔ شراب بنایئے اور بیچئے، بداخلاقی کے اڈے قائم کیجئے، شہوانی فلم بنایئے، فحش مضامین لکھئے، جذبات کو بھڑکانے والی تصویریں شائع کیجئے، سٹے کا کاروبار پھیلایئے، سود خواری کے ادارے قائم کیجئے، قمار بازی کی نئی نئی صورتیں نکالئے، غرض جو چاہئے کیجئے، قانون نہ صرف آپ کو اس کی اجازت دے گا، بلکہ الٹی آپ کے حقوق کی حفاظت کرے گا۔ پھر جو دولت اس طریقے سے سمٹ کر ایک شخص کے پاس جمع ہو گئی ہو، قانون یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کے مرنے کے بعد بھی ایک ہی جگہ سمٹی رہے۔ چنانچہ اولادِ اکبر کے وارث ہونے کا طریقہ (Rule of Primogeniture) اور بعض قوانین میں متبنیٰ بنانے کا طریقہ اور مشترک خاندان کا طریقہ (Joint Family System) ان سب کی غرض یہی ہے کہ خزانے کا ایک سانپ جب مرے تو دوسرا سانپ اس پر بٹھا دیا جائے، اور اگر بدقسمتی سے اس سانپ نے کوئی سپولیا نہ چھوڑا ہو تو کہیں اور سے ایک سپولیا حاصل کیا جائے،

تاکہ دولت کے اس ستماؤ میں فرق نہ آنے پائے۔

یہ اسباب ہیں جن سے نوعِ انسانی کے لئے یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے کہ خدا کی اس زمین پر ہر شخص کو سامانِ زیست بہم پہنچنے کا انتظام کس طرح کیا جائے اور ہر شخص کو اپنی استعداد کے مطابق ترقی کرنے اور اپنی شخصیت کو نشوونما دینے کے مواقع کیسے ملیں۔

اشتراکیّت کا تجویز کردہ حل اس مسئلے کے حل کی ایک صورت اشتراکیت نے تجویز کی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ پیدائشِ دولت کے وسائل افراد کی ملکیت سے نکال کر جماعتی ملکیت بنا دیئے جائیں، اور ضروریاتِ زندگی کو افراد پر تقسیم کرنے کا انتظام بھی جماعت ہی کے سپرد ہو۔ بظاہر یہ حل نہایت معقول نظر آتا ہے لیکن اس کے عملی پہلوؤں پر آپ جس قدر غور کریں گے، اُسی قدر آپ پر اس کے نقائص کھلتے چلے جائیں گے، یہاں تک کہ آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ آخرکار اس کے نتائج بھی اتنے ہی خراب ہیں جتنے اُس بیماری کے نتائج ہیں جس کا علاج کرنے کے لئے اُسے اختیار کیا گیا ہے۔ یہ بالکل ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ وسائلِ پیدائش سے کام لینے اور پیداوار کو تقسیم کرنے کا انتظام خواہ نظری طور پر پوری جماعت کے حوالے کر دیا جائے مگر عملاً یہ کام ایک مختصر سی ہیئتِ انتظامیہ (Executive) ہی کے سپرد کرنا ہوگا۔ یہ مختصر گروہ ابتداءً جماعت (Community) ہی کا منتخب کردہ سہی، لیکن جب تمام ذرائعِ معاش اس کے قبضہ میں ہوں گے اور اُسی کے ہاتھوں سے لوگوں تک پہنچ سکیں گے، تو تمام آبادی اس کی مٹھی میں بے بس ہو جائے گی۔ اس کی رضا کے خلاف ملک میں کوئی دم تک نہ مار سکے گا۔ اور اس کے مقابلہ میں کوئی ایسی منظم طاقت اُبھری

نہ سکے گی جو اس کو منصب اقتدار سے ہٹا سکے۔ اُس کی نظر کسی سے پھر جانے کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ قصوروار بندہ اس سرزمین میں زندگی بسر کرنے کے تمام وسائل سے محروم ہو جائے، کیونکہ سارے وسائل پر اسی مختصر گروہ کا تسلط ہوگا۔ مزدور میں اتنا یارا نہ ہوگا کہ اس کے انتظام سے ناراض ہو تو اسٹرائک کر دے، کیونکہ وہاں بہت سے کارخانہ دار نہ ہوں گے کہ ایک کے در سے اٹھے تو دوسرے کے دروازے پر چلا جائے، بلکہ سارے ملک میں ایک ہی کارخانہ دار ہوگا، اور وہی حکمران بھی ہوگا، اور اس کے خلاف کسی رائے عام کی ہمدردی بھی حاصل نہ کی جا سکے گی۔ اس طرح یہ صورت جس نتیجہ پر جا کر ختم ہوگی وہ یہ ہے کہ تمام سرمایہ داروں کو کھا کر ایک بڑا سرمایہ دار تمام کارخانہ داروں اور زمینداروں کو کھا کر ایک بڑا کارخانہ دار و زمیندار لوگوں پر مسلط ہو جائے، اور وہ بیک وقت زار اور قیصر بھی ہو۔

اوّل تو یہ اقتدار، اور ایسا مطلق اقتدار وہ چیز ہے جس کے نشہ میں بہک کر ظالم و جابر بننے سے رک جانا انسان کے لئے بہت مشکل ہے خصوصاً جبکہ وہ اپنے اوپر کسی خدا کا اور اُس کے سامنے جوابدہی کا اعتقاد بھی نہ رکھتا ہو۔ تاہم اگر یہ مان لیا جائے کہ ایسے اقتدارِ مطلق پر قابض ہونے کے بعد بھی یہ مختصر گروہ آپے سے باہر نہ ہوگا اور عدل و انصاف ہی کے ساتھ کام کرے گا تب بھی ایسے ایک نظام میں افراد کے لئے اپنی شخصیت* اپنے ارتقاء کے لئے سب سے بڑھ کر جس چیز کی محتاج ہے وہ یہ ہے کہ اُسے آزادی حاصل ہو، کچھ وسائل کار اس کے اپنے ہاتھ میں ہوں جنھیں وہ اپنے اختیار سے استعمال کر سکے اور ان وسائل پر اپنے رجحان کے مطابق کام کر کے اپنی مخفی قوتوں کو ابھارے اور چمکائے۔ مگر اشتراکی نظام میں اس کا کوئی امکان

*نشو و نما دینے کا کوئی موقع نہیں ہو سکتا۔ انسانی شخصیت

نہیں۔ اس میں وسائل افراد کے اختیار میں نہیں رہتے بلکہ جماعت کی ہیئت انتظامیہ کے ہاتھوں میں چلے جاتے ہیں، اور وہ ہیئت انتظامیہ جماعتی مفاد کا جو تصور رکھتی ہے اسی کے مطابق ان وسائل کو استعمال کرتی ہے۔ افراد کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں کہ اگر وہ ان وسائل سے استفادہ کرنا چاہیں تو اس نقشہ کے مطابق کام کریں، بلکہ اسی نقشہ کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالے جانے کے لیے ان منتظمین کے سپرد کر دیں جو انہوں نے جماعتی مفاد کے لیے تجویز کیا ہے۔ یہ چیز عملاً سوسائٹی کے تمام افراد کو چند انسانوں کے قبضہ میں اس طرح دے دیتی ہے کہ گویا وہ سب بے روح مواد خام ہیں۔ اور جیسے چمڑے کے جوتے اور لوہے کے پُرزے بنائے جاتے ہیں اس طرح وہ چند انسان مختار ہیں کہ ان بہت سے انسانوں کو اپنے نقشہ کے مطابق ڈھالیں اور بنائیں۔

انسانی تمدن و تہذیب کے لیے اس کا نقصان اس قدر زیادہ ہے کہ اگر بالفرض اس نظام کے تحت ضروریاتِ زندگی انصاف کے ساتھ تقسیم بھی ہوں تو اس کا فائدہ اس نقصان کے مقابلہ میں ہیچ ہو جاتا ہے۔ تمدن و تہذیب کی ساری ترقی منحصر ہے اس پر کہ مختلف انسان جو مختلف قسم کی قوتیں اور قابلیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں ان کو پوری طرح نشو و نما پانے اور پھر اپنا اپنا حصہ اس مشترک زندگی میں ادا کرنے کا موقع ملے۔ یہ بات ایسے نظام میں حاصل نہیں ہو سکتی جس کے اندر انسانوں کا پلاننگ (Planing) کیا جاتا ہو۔ چند انسان، خواہ وہ کتنے ہی لائق اور کتنے ہی نیک اندیش ہوں، بہر حال اللہ علیم و خبیر نہیں ہو سکتے کہ لاکھوں اور کروڑوں آدمیوں کی خلقی قابلیتوں اور ان کے فطری رجحانات کا

صحیح اندازہ کر سکیں اور پھر ان کے نشوونما کا ٹھیک ٹھیک راستہ معین کر سکیں سو
اس میں علم کے اعتبار سے بھی غلطی کریں گے، اور جماعتی مفاد یا جماعتی ضروریات کے
متعلق جو تخمینہ ان کے ذہن میں ہوگا اس کے لحاظ سے بھی یہ چاہیں گے کہ ان
کے زیر اثر انسانوں کی جتنی آبادی ہو وہ ان کے نقشہ پر ڈھال دی جائے۔ اس
سے تمدن کی گوناگونی ختم ہو کر ایک بے روح یکسانی میں تبدیل ہو جائے گی۔
اس سے تمدن کا فطری ارتقاء بند اور ایک طرح کا مصنوعی و جعلی ارتقاء شروع
ہو جائے گا۔ اس سے انسانی قوتیں ٹھٹھرتی چلی جائیں گی اور بالآخر ایک شدید ذہنی
و اخلاقی انحطاط رونما ہوگا۔ انسان بہرحال چمن کی گھاس اور بیل بوٹے نہیں ہیں کہ
ایک مالی انہیں کانٹ چھانٹ کر مرتب کرے اور وہ اسی کے نقشہ پر بڑھتے اور
گھٹتے رہیں۔ ہر آدمی اپنا ایک تشخص رکھتا ہے جو اپنی فطری رفتار پر بڑھنا چاہتا ہے،
تم اس کی یہ آزادی سلب کرو گے تو وہ تمہارے نقشہ پر نہیں بڑھے گا بلکہ بغاوت
کرے گا یا مرجھا کر رہ جائے گا۔

اشتراکیت کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ معاش کے مسئلہ کو مرکزی مسئلہ قرار دے
کر پوری انسانی زندگی کو اس کے گرد گھما دیتی ہے۔ زندگی کے کسی مسئلہ پر بھی اس
کی نظر مجرد تحقیقی نظر نہیں ہے بلکہ سارے مسائل کو وہ ایک گہرے معاشی تعصب
کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ مابعد الطبیعیات، اخلاق، تاریخ، سائنس، علوم عمران،
غرض ہر چیز اس کے دائرے میں معاشی نقطۂ نظر سے مغلوب و متاثر ہے اور اس
یک رُخے پن کی وجہ سے زندگی کا پورا توازن بگڑ جاتا ہے۔

فاشزم کا حل | پس درحقیقت اشتراکی نظریہ انسان کے معاشی

مسئلہ کا کوئی صحیح فطری حل نہیں ہے بلکہ ایک غیر فطری مصنوعی حل ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا حل فاشزم اور نیشنل سوشلزم نے پیش کیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ وسائل معیشت پر شخصی تصرف تو باقی رہے، مگر جماعتی مفاد کی خاطر اس تصرف کو ریاست کے مضبوط کنٹرول میں رکھا جائے لیکن عملاً اس کے نتائج بھی اشتراکی نظریہ کے نتائج سے کچھ زیادہ مختلف نظر نہیں آتے۔ اشتراکیت کی طرح یہ نظریہ بھی فرد کو جماعت میں گم کر دیتا ہے، اور اس کی شخصیت کے آزادانہ نشوونما کا کوئی موقع باقی نہیں چھوڑتا۔ مزید برآں جو ریاست اس شخصی تصرف کو قابو میں رکھتی ہے وہ اتنی ہی مستبداد اور جابر و قاہر ہوتی ہے جتنی اشتراکی ریاست۔ ایک بڑے ملک کی تمام حرفت کو اپنے پنجۂ اقتدار میں رکھنے اور اپنے دیئے ہوئے نقشہ پر کام کرنے کے لئے مجبور کرنا بڑی زبردست قوت قاہرہ چاہتا ہے اور جس ریاست کے ہاتھ میں ایسی قاہرانہ طاقت ہو اُس کے ہاتھ میں ملک کی آبادی کا بے بس ہو جانا اور حکمرانوں کا غلام بن کر رہ جانا بالکل یقینی ہے۔

اسلام کا حل

اب میں یہ بتاؤں گا کہ اسلام کس طرح اس مسئلے کو حل کرتا ہے۔

اسلام نے تمام مسائل حیات میں اس قاعدے کو ملحوظ رکھا ہے کہ زندگی کے جو اصول فطری ہیں ان کو جوں کا توں برقرار رکھا جائے۔ اور فطرت کے راستے سے جہاں انحراف ہوا ہے وہیں سے اس کو موڑ کر فطرت کے راستے پر ڈال دیا جائے۔ دوسرا اہم قاعدہ جس پر اسلام کی تمام اجتماعی اصلاحات مبنی ہیں، وہ یہ ہے

کہ صرف خارجی طور پر نظامِ تمدن میں چند ضابطے جاری کرنے ہی پر اکتفا نہ کیا جائے بلکہ سب سے زیادہ زور اخلاق اور ذہنیت کی اصلاح پر صرف کیا جائے تاکہ نفسِ انسانی میں خرابی کی جڑ کٹ جائے تیسرا اساسی قاعدہ جس کا نشان آپ کو تمام اسلامی نظامِ شریعت میں ملے گا، یہ ہے کہ حکومت کے جبر اور قانون کے زور سے صرف وہیں کام لیا جائے جہاں ایسا کرنا ناگزیر ہو۔ ان تین قاعدوں کو ملحوظ رکھ کر اسلام زندگی کے معاشی شعبے میں ان تمام فطری اصولوں کو زیادہ سے زیادہ اخلاقی اصلاح اور کم سے کم حکومتی مداخلت کے ذریعہ سے مٹاتا ہے۔ جو شیطانی اثر سے انسان نے اختیار کئے ہیں۔ یہ امر کہ انسان اپنی معاش کے لئے جد و جہد کرنے میں آزاد ہو، یہ بات کہ آدمی اپنی محنت سے جو کچھ حاصل کرے اس پر اُسے حقوق مالکانہ حاصل ہوں اور یہ کہ انسانوں کے درمیان ان کی قابلیتوں اور ان کے حالات کے لحاظ سے فرق و تفاوت ہو، ان سب چیزوں کو اسلام اُس حد تک تسلیم کرتا ہے جس حد تک یہ منشار فطرت کے مطابق ہیں۔ پھر وہ ان پر ایسی پابندیاں عائد کرتا ہے جو انہیں حدِ فطرت سے متجاوز اور ظلم و بے انصافی کا موجب نہ بننے دیں۔

سب سے پہلے دولت کمانے کے سوال کو لیجئے۔ اسلام نے انسان کے اس حق کو تسلیم کیا ہے کہ خدا کی زمین میں وہ اپنی طبیعت کے رجحان اور اپنی استعداد و قابلیت کے مطابق خود اپنی زندگی کا سامان تلاش کرے لیکن وہ اس کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اپنی معاش حاصل کرنے کے لئے اخلاق کو خراب کرنے والے یا تمدن کے نظام کو بگاڑنے والے ذرائع اختیار کرے۔ وہ کسب معاش کے

ذرائع میں حرام اور حلال کی تمیز قائم کرتا ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ چُن چُن کر ایک ایک نقصان رساں طریقہ کو حرام کر دیتا ہے۔ اس کے قانون میں شراب اور دوسری نشہ آور چیزیں نہ صرف بجائے خود حرام ہیں، بلکہ ان کا بنانا، بیچنا، خریدنا، رکھنا سب حرام ہے۔ وہ زنا اور رقص و سرود اور اسی قسم کے دوسرے ذرائع کو بھی جائز ذرائع کسب معاش تسلیم نہیں کرتا۔ وہ ایسے تمام وسائل معیشت کو بھی ناجائز ٹھیرتا ہے جن میں ایک شخص کا فائدہ دوسرے لوگوں کے یا سوسائٹی کے نقصان پر مبنی ہو، رشوت، چوری، جوا اور سٹہ، دھوکے اور فریب کے کاروبار اشیاء ضرورت کو اس غرض سے روک رکھنا کہ قیمتیں گراں ہوں، معاشی وسائل کو کسی ایک شخص یا چند اشخاص کا اجارہ قرار دینا کہ دوسروں کے لئے جدوجہد کا دائرہ تنگ ہو، ان سب طریقوں کو اس نے حرام ٹھیرایا ہے۔ نیز کاروبار کی ایسی تمام شکلوں کو اس نے چھانٹ چھانٹ کر ناجائز قرار دیا ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے نزاع (Litigation) پیدا کرنے والی ہوں، یا جن میں نفع و نقصان بالکل بخت و اتفاق پر مبنی ہو، یا جن میں فریقین کے درمیان حقوق کا تعین نہ ہو۔ اگر آپ اسلام کے اس تجارتی قانون کا تفصیلی مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آج جن طریقوں سے لوگ کروڑ پتی اور ارب پتی بنتے ہیں، اُن میں سے بیشتر طریقے وہ ہیں جن پر اسلام نے سخت قانونی بندشیں عائد کر دی ہیں۔ وہ جن وسائل کسب معاش کو جائز ٹھیراتا ہے اُن کے دائرے میں محدود رہ کر کام کیا جائے تو اشخاص کے لئے بے اندازہ دولت سمیٹتے چلے جانے کا بہت کم امکان ہے۔

اب دیکھیئے جائز ذرائع سے جو کچھ انسان حاصل کرے اُس پر اسلام اُس

شخص کے حقوقِ ملکیت تو تسلیم کرتا ہے، مگر اس کے استعمال میں اسے بالکل آزاد نہیں چھوڑتا بلکہ اس پر بھی متعدد طریقوں سے پابندیاں عائد کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کمائی ہوئی دولت کے استعمال کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو اس کو خرچ کیا جائے۔ یا اسے مزید نفع آور کاموں پر لگایا جائے۔ یا اسے جمع کیا جائے۔ ان میں سے ایک ایک پر اسلام نے جو پابندیاں عائد کی ہے ان کی مختصر کیفیت میں یہاں بیان کرتا ہوں۔

خرچ کرنے کے جتنے طریقے اخلاق کو نقصان پہنچانے والے ہیں یا جن سے سوسائٹی کو نقصان پہنچتا ہے وہ سب ممنوع ہیں۔ آپ جوئے میں اپنی دولت نہیں اڑا سکتے، آپ شراب نہیں پی سکتے۔ آپ زنا نہیں کر سکتے۔ آپ گانے بجانے اور ناچ رنگ اور عیاشی کی دوسری صورتوں میں اپنا روپیہ نہیں بہا سکتے۔ آپ ریشمی لباس نہیں پہن سکتے۔ آپ سونے اور جواہر کے زیورات استعمال نہیں کر سکتے۔ آپ تصویروں سے اپنی دیواروں کو مزین نہیں کر سکتے۔ غرض یہ کہ اسلام نے ان تمام دروازوں کو بند کر دیا ہے جن سے انسان کی دولت کا بیشتر حصہ اس کی اپنی نفس پرستی پر صرف ہو جاتا ہے۔ وہ خرچ کی جن جن صورتوں کو جائز رکھتا ہے وہ اس قسم کی ہیں کہ آدمی بس ایک اوسط درجہ کی شستہ اور پاکیزہ زندگی بسر کرے اور اس سے زائد اگر کچھ بچتا ہو تو اُسے خرچ کرنے کا راستہ اس نے یہ تجویز کیا ہے کہ اُسے نیکی اور بھلائی کے کاموں میں، رفاہِ عام میں، اور ان لوگوں کی امداد میں صرف کیا جائے جو معاشی دولت میں سے اپنی ضرورت کے مطابق حصہ پانے سے محروم رہ گئے ہیں۔ اسلام کے نزدیک بہترین طرزِ عمل یہ ہے کہ

آدمی جو کچھ کمائے اسے اپنی جائز اور معقول ضرورتوں پر خرچ کرے۔ اور پھر بھی جو بچ رہے اُسے دوسروں کو دیدے تاکہ وہ اپنی ضرورتوں پر خرچ کریں۔ اس صفت کو اسلام نے بلند ترین اخلاق کے معیاروں میں داخل کیا ہے اور ایک آئیڈیل کی حیثیت سے اس کو اتنے زور کے ساتھ پیش کیا ہے کہ جب کبھی سوسائٹی پر اسلامی اخلاقیات کا اثر غالب ہوگا، اجتماعی زندگی میں وہ لوگ زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھیں جائیں گے جو کمائیں اور خرچ کردیں، اور ان لوگوں کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھا جائے گا جو دولت کو سمیٹ کر رکھنے کی کوشش کریں یا کمائی ہوئی دولت کے بچے ہوئے حصّے کو پھر کمانے کے کام میں لگانا شروع کردیں۔

تاہم مجرّد اخلاقی تعلیم کے ذریعہ سے، اور سوسائٹی کے اخلاقی اثر اور دباؤ سے غیر معمولی حرص و طمع رکھنے والے لوگوں کی کمزوریوں کا بالکل استیصال نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود پھر بھی بہت سے ایسے لوگ باقی رہیں گے جو اپنی ضرورت سے زیادہ کمائی ہوئی دولت کو پھر مزید از ضرورت دولت کمانے میں لگانا چاہیں گے، اس لئے اسلام نے اس کے استعمال کے طریقوں پر چند قانونی پابندیاں عائد کردی ہیں۔ اس بچی ہوئی دولت کے استعمال کا یہ طریقہ کہ اسے سود پر چلایا جائے اسلامی قانون میں قطعی حرام ہے۔ اگر آپ کسی کو اپنا مال قرض دیتے ہیں تو خواہ اس نے وہ قرض اپنی ضرورتوں پر خرچ کرنے کے لئے لیا ہو یا وسیلۂ معاش پیدا کرنے کے لئے، بہرحال آپ اُس سے صرف اپنا اصل مال ہی واپس لینے کے حق دار ہیں۔ اس طرح اسلام ظالمانہ سرمایہ داری کی کمر توڑ دیتا ہے اور اُس سب سے بڑے ہتھیار کو کُند کر دیتا ہے جس کے ذریعہ سے سرمایہ دار محض اپنے

سرمایہ کے بَل پر آس پاس کی معاشی دولت سمیٹتا چلا جاتا ہے ۔ رہا فاضل دولت کے استعمال کا یہ طریقہ کہ اسے انسان خود اپنی تجارت یا صنعت و حرفت یا دوسرے کاروبار میں لگائے یا دوسروں کے ساتھ نفع و نقصان کا شریک ہو کر سرمایہ فراہم کرے تو اسلام اُسے جائز رکھتا ہے اور اُس سے جو زائد از ضرورت دولت اشخاص کے پاس سمٹ جاتی ہے اس کا علاج دوسرے طریقوں سے کرتا ہے ۔

اسلام نے زائد از ضرورت دولت کے جمع کرنے کو حرام قرار دیا ہے جیسا کہ ابھی میں کہہ چکا ہوں ، اس کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ مال تمہارے پاس ہے یا تو اسے اپنی ضروریات خریدنے پر صرف کر دیا دوسروں کو دو کہ وہ اس سے اپنی ضروریات خریدیں اور اس طرح پوری دولت برابر گردش میں آتی رہے ۔ لیکن اگر تم ایسا نہیں کرتے اور جمع کرنے ہی پر اصرار کرتے ہو تو تمہاری اس جمع کردہ دولت میں سے از روئے قانون ۲ ½ فی صدی سالانہ رقم نکلوالی جائے گی ۔ اور اسے ان لوگوں کی اعانت پر صرف کیا جائے گا جو معاشی جدوجہد میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہیں ، یا سعی و جہد کرنے کے باوجود اپنا پورا حصہ پانے سے محروم رہ جاتے ہیں ۔ اسی چیز کا نام زکوٰۃ ہے اور اس کے انتظام کی صورت جو اسلام نے تجویز کی ہے وہ یہ ہے کہ اسے جماعت کے مشترک خزانہ میں جمع کیا جائے ۔ اور خزانہ ان تمام لوگوں کی ضروریات کا کفیل بن جائے جو مدد کے حاجتمند ہیں ۔ یہ دراصل سوسائٹی کے لئے انشورنس کی بہترین صورت ہے اور ان تمام خرابیوں کا استیصال کرتی ہے جو اجتماعی امداد و معاونت کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں ۔ سرمایہ داری نظام میں جو چیز انسان کو دولت جمع کرنے

اور اسے نفع آور کاموں میں لگانے پر مجبور کرتی ہے، اور جس کی وجہ سے لائف انشورنس وغیرہ کی ضرورت پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص کی زندگی اس نظام میں اپنے ہی ذرائع پر منحصر ہے۔ بوڑھا ہو جائے اور کچھ بچا کر نہ رکھا ہو تو بھوکا مر جائے۔ بال بچوں کے لئے کچھ چھوڑے بغیر مرے تو دربدر مارے مارے پھریں اور بھیک کا ٹکڑا تک نہ پا سکیں۔ بیمار ہو جائے اور کچھ بچا بچایا نہ رکھا ہو تو علاج تک نہ کرا سکے، گھر جل جائے، یا کاروبار میں نقصان ہو، یا کوئی اور آفت ناگہانی آجائے تو کسی طرف سے اس کو سہارا ملنے کی امید نہیں۔ اسی طرح سرمایہ داری نظام میں جو چیز محنت پیشہ لوگوں کو سرمایہ داروں کا زرخرید غلام بن جانے اور ان کی شرائط پر کام کرنے کے لئے مجبور کرتی ہے وہ بھی یہی ہے کہ جو کچھ اس کی محنت کا معاوضہ سرمایہ دار دیتا ہے اسے لینا اگر غریب آدمی قبول نہ کرے تو فاقہ کرے اور ننگا پھرے۔ سرمایہ دار کی بخشش سے منہ موڑ کر اسے دو وقت کی روٹی میسر آنی مشکل ہے۔ پھر یہ لعنت کبریٰ جو آج سرمایہ داری نظام کی بدولت دنیا پر مسلط ہے کہ ایک طرف لاکھوں کروڑوں انسان حاجتمند موجود ہیں اور دوسری طرف زمین کی پیداوار اور کارخانوں کی مصنوعات کے انبار لگے ہوئے ہیں مگر خریدے نہیں جا سکتے حتیٰ کہ لاکھوں من گیہوں سمندر میں پھینکا جاتا ہے اور بھوکے انسانوں کے پیٹ تک نہیں پہنچتا، اس کا سبب بھی یہی ہے کہ حاجتمند انسانوں تک وسائل معیشت پہنچانے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ ان سب کے اندر قوت خریداری پیدا کردی جائے اور وہ اپنے حسب حاجت اشیاء خریدنے کے قابل ہو جائیں تو صنعت، تجارت، زراعت، غرض ہر انسانی حرفت پھلتی پھولتی

چلی جائے۔ اسلام زکوٰۃ اور بیت المال کے ذریعہ سے ان ساری خرابیوں کا استیصال کرتا ہے۔ بیت المال ہر وقت آپ کی پشت پر ایک مددگار کی حیثیت سے موجود ہے۔ آپ کو فکر فردا کی ضرورت نہیں۔ جب آپ حاجتمند ہوں بیت المال میں جایئے اور اپنا حق لے آیئے، پھر بنک ڈپازٹ اور انشورنس پالیسی کی کیا ضرورت؟ آپ اپنے بال بچوں کو چھوڑ کر باطمینان تمام دنیا سے رخصت ہو سکتے ہیں۔ آپ کے پیچھے جماعت کا خزانہ ان کا کفیل ہے۔ بیماری، بڑھاپے، آفات ارضی وسماوی، ہر صورتِ حال میں بیت المال وہ دائمی مددگار ہے جس کی طرف آپ رجوع کر سکتے ہیں۔ سرمایہ دار آپ کو مجبور نہیں کر سکتا، کہ آپ اسی کی شرائط پر کام کرنا قبول کریں۔ بیت المال کی موجودگی میں آپ کے لئے فاقے اور برہنگی اور بے سائیگی کا کوئی خطرہ نہیں۔ پھر یہ بیت المال سوسائٹی کے تمام اُن لوگوں کو اشیاء ضرورت خریدنے کے قابل بنا دیتا ہے جو دولت پیدا کرنے کے بالکل ناقابل ہوں یا کم پیدا کر رہے ہوں۔ اس طرح مال کی تیاری اور اس کی کھپت کا توازن پیہم قائم رہتا ہے اور اس کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ آپ اپنے دیوالیہ پن کو دنیا بھر کے سر چیپکنے کے لئے دوڑتے پھریں اور آخر کار دوسرے سیاروں تک پہنچنے کی ضرورت پیش آئے۔

زکوٰۃ کے علاوہ دوسری تدبیر جو ایک جگہ سمٹی ہوئی دولت کو پھیلانے کے لئے اسلام نے اختیار کی ہے وہ قانون وراثت ہے۔ اسلام کے سوا دوسرے قوانین کا رجحان اس طرف ہے کہ جو دولت ایک شخص نے زندگی بھر سمیٹی ہے وہ اس کے مرنے کے بعد بھی سمٹی رہے مگر اس کے برعکس اسلام یہ طریقہ اختیار

کرتا ہے، کہ جس دولت کو ایک شخص سمیٹ کر قید کرتا رہا ہے، اس کے
مرتے ہی وہ پھیلا دی جائے۔ اسلامی قانون میں بیٹے، بیٹیاں، باپ، ماں،
بیوی، بھائی، بہن سب ایک شخص کے وارث ہیں اور ایک ضابطہ کے مطابق
سب پر میراث تقسیم ہونی ضروری ہے۔ قریبی رشتہ دار موجود نہ ہوں تو دور
پرے کے رشتہ دار تلاش کئے جائیں گے۔ اور ان میں یہ دولت پھیلائی جائے
گی۔ کوئی رشتہ دار سرے سے موجود ہی نہ ہو، تب بھی آدمی کو متبنّٰی بنانے کا حق
نہیں ہے۔ اس صورت میں اس کی وارث پوری جماعت ہے۔ اس کی سمیٹی ہوئی
تمام دولت بیت المال میں داخل کر دی جائے گی۔ اس طرح خواہ کوئی شخص
کروڑوں اور اربوں کی دولت جمع کر لے، اس کے مرنے کے بعد دو تین پشتوں
کے اندر وہ سب کی سب چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر پھیل جائے گی
اور دولت کا ہر سمٹاؤ، بتدریج پھیلاؤ میں تبدیل ہو کر رہے گا۔

یہ نظامِ معیشت جس کا نہایت مختصر سا نقشہ میں نے پیش کیا ہے اس پر
غور کیجئے۔ کیا یہ شخصی ملکیت کے ان تمام نقصانات کو دور نہیں کر دیتا جو شیطان
کی غلط تعلیم کے سبب سے رونما ہوتے ہیں؟ پھر آخر اس کی کیا حاجت ہے کہ
ہم اشتراکی نظریہ یا فاشزم اور نیشنل سوشلزم کے نظریات کو اختیار کر کے
معاشی انتظام کے وہ مصنوعی طریقے استعمال کریں جو ایک خرابی کو دور نہیں
کرتے بلکہ اس کی جگہ دوسری خرابی پیدا کر دیتے ہیں؟ یہاں میں نے اسلام
کے پورے نظامِ معاشی کو بیان نہیں کیا ہے۔ زمین کے انتظام اور کاروباری
نزاعات (Trade Disputes) کے تصفیہ اور صنعت و حرفت کے

سے سرمایہ کی فراہمی کی جو صورتیں اسلام کے اصول پر اختیار کی جا سکتی ہیں اور جن کے لیئے قانونِ اسلام میں پوری گنجائش رکھی گئی ہے انہیں اس مختصر مقالہ میں پیش کرنا مشکل ہے۔ نیز اسلام نے جس طرح درآمد برآمد کے محصولات اور اندرون ملک میں اموالِ تجارت کی نقل و حرکت پر چنگی کی پابندیوں کو اڑا کر اشیا ضرورت کے آزاد مبادلہ کا راستہ کھولا ہے اس کا ذکر بھی میں نہیں کر سکا ہوں۔ ان سب سے بڑھ کر مجھے یہ بیان کرنے کا موقع بھی نہیں ملا ہے کہ ملکی انتظام اور سول سروس اور فوج کے مصارف کو انتہائی ممکن حد تک گھٹا کر اور عدالت سے اسٹامپ ڈیوٹی کو قطعی طور پر ہٹا کر اسلام نے سوسائٹی پر سے جس عظیم الشان معاشی بوجھ کو ہلکا کیا ہے، اور ٹیکسوں کو انتظام کے حد سے بڑھے ہوئے مصارف میں کھپا دینے کے بجائے سوسائٹی کی آسائش اور بہتری پر صرف ہونے کے جو مواقع پیدا کئے ہیں ان کی بدولت اسلام کا معاشی نظام انسان کے لیئے کتنی بڑی رحمت بن جاتا ہے۔ اگر تعصب کو چھوڑ دیا جائے اور آباد اجداد سے جو جاہلانہ تنگ نظری وراثت میں ملی ہے، یا غیر اسلامی نظامات کے دنیا پر غالب آجانے سے جو مرعوبیت دماغوں پر چھا گئی ہے اُسے دور کر کے آزاد تحقیق کی نگاہ سے اس نظام کا مطالعہ کیا جائے تو میں توقع کرتا ہوں کہ ایک بھی معقول و منصف مزاج آدمی ایسا نہ ملے گا جو انسان کی معاشی فلاح کیلیئے اس نظام کو سب سے زیادہ مفید، صحیح اور معقول تسلیم نہ کرے۔ لیکن اگر کسی شخص کے ذہن میں یہ غلط فہمی ہو کہ اسلام کے پورے اعتقادی، اخلاقی، تمدنی مجموعہ میں سے صرف اس کے معاشی نظام کو لے کر کامیابی کے ساتھ چلایا جا سکتا ہے تو میں

عرض کروں گا کہ براہِ کرم وہ اس غلط فہمی کو دل سے نکال دے۔ اس معاشی نظام کا گہرا ربط اسلام کے سیاسی، عدالتی و قانونی اور تمدنی و معاشرتی نظام کے ساتھ ہے۔ پھر ان سب چیزوں کی بنیاد اسلام کے نظامِ اخلاق پر قائم ہے اور وہ نظامِ اخلاق بھی اپنے آپ پر قائم نہیں ہے بلکہ اس کے قیام کا پورا انحصار اس پر ہے کہ آپ ایک عالم الغیب قادرِ مطلق خدا پر ایمان لائیں اور اپنے آپ کو اس کے سامنے جواب دہ سمجھیں، موت کے بعد آخرت کی زندگی کو مانیں اور آخرت میں عدالتِ الٰہی کے سامنے اپنے پورے کارنامۂ حیات کے جانچے جانے اور اس جانچ کے مطابق جزا و سزا پانے کا یقین رکھیں، اور یہ تسلیم کریں کہ خدا کی طرف سے محمد رسول اللہؐ نے جو ضابطۂ اخلاق و قانون آپ تک پہنچایا ہے، جس کا ایک جزء یہ معاشی نظام بھی ہے، وہ بے کم و کاست خدا ہی کی ہدایت پر مبنی ہے۔ اگر اس عقیدے اور نظامِ اخلاق اور اس پورے ضابطۂ حیات کو آپ جوں کا توں نہ لیں گے تو نرا اسلامی نظامِ معاشی ایک دن بھی اپنی صحیح اسپرٹ کے ساتھ نہ چل سکے گا اور نہ اس سے آپ کوئی معتد بہ فائدہ اٹھا سکیں گے۔

مکتبہ جماعتِ اسلامی کی کتب

نمبر	کتاب		قیمت	
۱۔	رسالہ دینیات	قیمت	۸؍عہ	(علاوہ محصول ڈاک)
۲۔	خطبات	"	۴؍عہ	"
۳۔	مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش (اول)	"	۴؍عہ	"
۴۔	" " " " (دوم)	"	۸؍عـ	"
۵۔	" " " " (سوم)	"	عـ	"
۶۔	مسئلہ قومیت	"	۸؍عہ	"
۷۔	تنقیحات	"	۸؍عـ	"
۸۔	تفہیمات	"	۸؍ے	"
۹۔	مسئلہ جبر و قدر	"	عہ؍	"
۱۰۔	تجدید و احیائے دین	"	عہ؍	"
۱۱۔	پردہ	"	۸؍عـ	"
۱۲۔	حقوق الزوجین	"	۸؍عہ	"
۱۳۔	اسلام اور ضبط ولادت	"	عہ؍	"
۱۴۔	دستور جماعت اسلامی	"	۳؍	"
۱۵۔	سلامتی کا راستہ	قیمت	۶؍	"

کتاب		قیمت	
۱۶- اسلام اور جاہلیت	قیمت	۶ر	(علاوہ محصولڈاک)
۱۷- اسلام کا نظامِ حیات	〃	۱۰ر	〃
۱۸- اسلام کا نظریہ سیاسی	〃	۸ر	〃
۱۹- اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے؟	〃	۸ر	〃
۲۰- ایک اہم استفتار	〃	۳ر	〃
۲۲- انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	〃	۸ر	〃
۲۲- نیا نظامِ تعلیم	〃	۶ر	〃
۲۳- انگریزی ترجمہ رسالہ دینیات	〃	ے/۸ر	〃
۲۴ 〃 〃 نظریہ سیاسی	〃	۱۲ر	〃
۲۵ 〃 〃 اسلامی حکومت	〃	۱۲ر	〃
۲۶- نیشنلزم اینڈ انڈیا	〃	۱۲ر	〃
۲۷ انگریزی ترجمہ اخلاقی نقطہ نظر	〃	۱۲ر	〃
۲۸- معاشی مسئلہ (انگریزی ترجمہ)	〃	۱۲ر	〃
۲۹- الحاد کے بعد کیا (انگریزی)	〃	۱۲ر	〃
۳۰ اسلام کیا ہے	〃	عہ/۸ر	〃

پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی - ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور

اسلامی مقالات کا سلسلہ
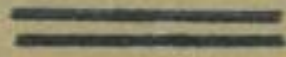
مطبوعہ رپن پریس، لاہور

اسلامی مقالات کا سلسلہ (۱۲)

اسلام کا نظامِ حیات

چند نشری تقریریں
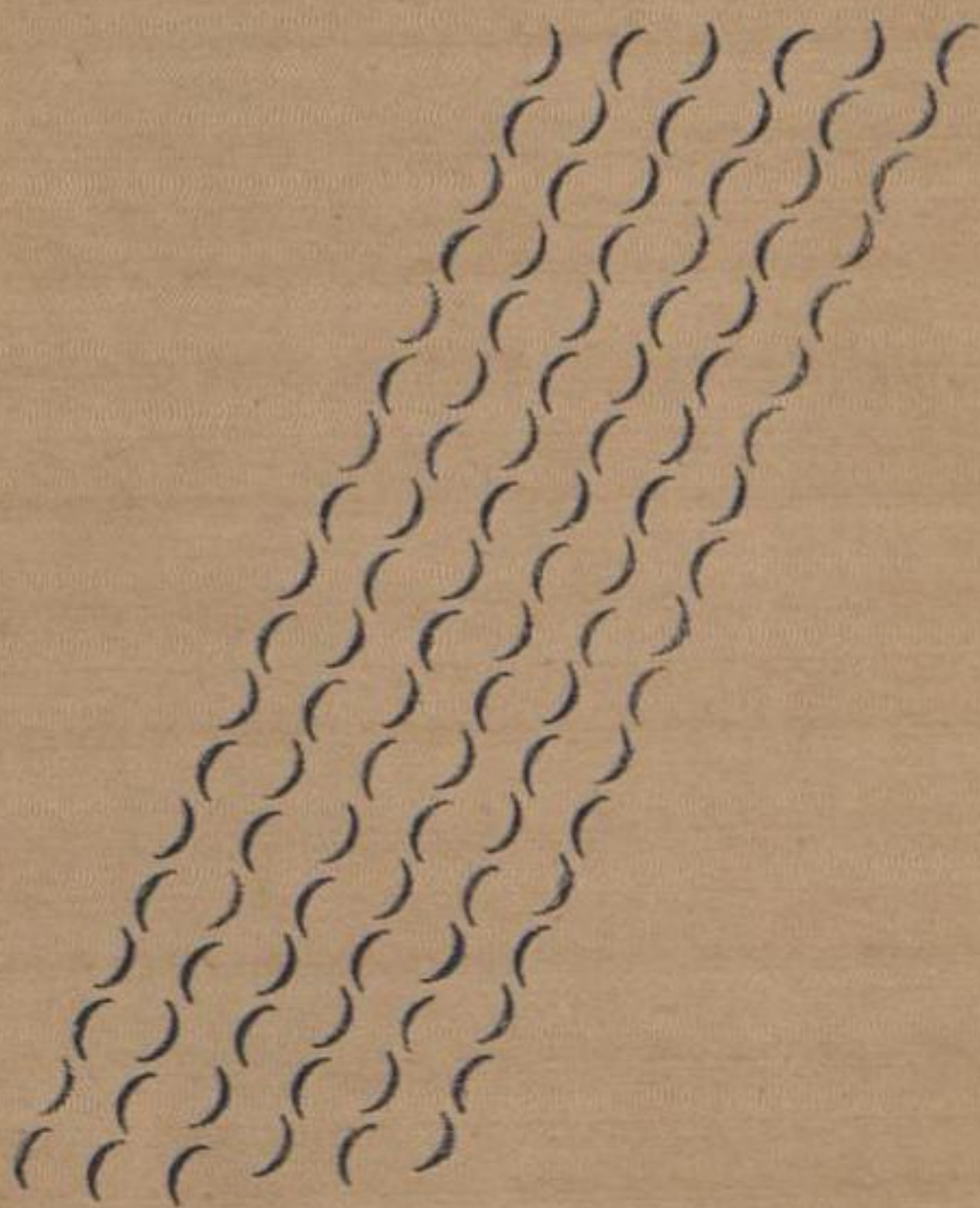
ابو الاعلیٰ مودودی
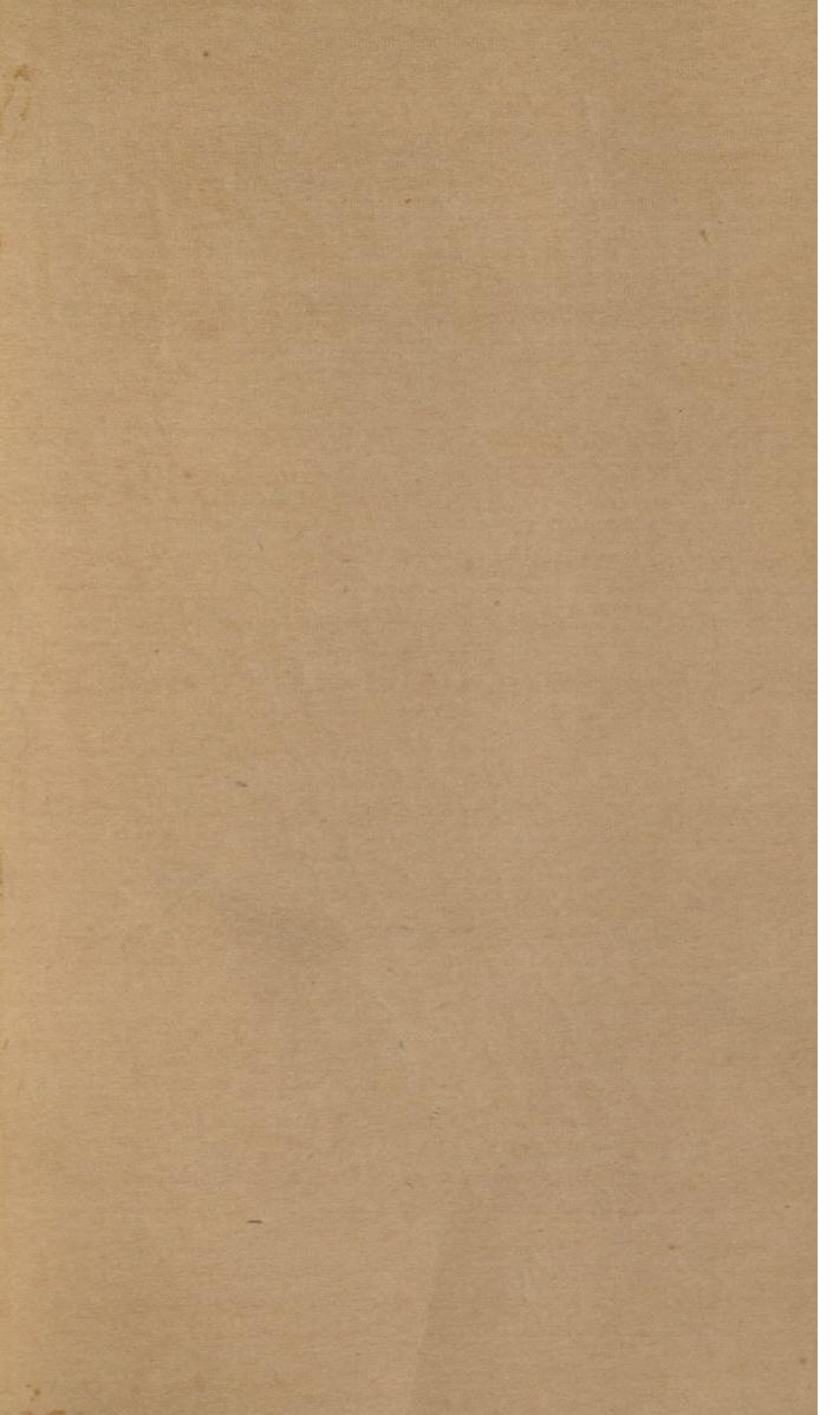
اِسلام کا نظامِ حیات

(چند نشری تقریریں) :-

- اسلام کا اخلاقی نظام
- " سیاسی نظام
- " معاشرتی نظام
- " اقتصادی نظام
- " روحانی نظام

سیّد ابو الاعلیٰ مودودی

شائع کردہ

مکتبہ جماعتِ اسلامی، ذیلدار پارک، اچھرہ لاہور۔

قیمت ۱۰ آنہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی طابع و ناشر نے 'انصاف پریس' لاہور

میں چھپوا کر مکتبہ جماعتِ اسلامی اچھرہ لاہور

سے شائع کیا

طبع اوّل ——— مارچ ۱۹۴۸ء ——— پانچ ہزار

(۱)

اِسلام کا اخلاقی نظام

یہ تقریر ۶؍ جنوری ۱۹۴۸ء کو ریڈیو پاکستان، لاہور، سے نشر کی گئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان کے اندر اخلاقی حس ایک فطری حس ہے جو بعض صفات کو پسند اور بعض دوسری صفات کو ناپسند کرتی ہے۔ یہ حس انفرادی طور پر اشخاص میں چاہے کم و بیش ہو مگر مجموعی طور پر انسانیت کے شعور نے اخلاق کے بعض اوصاف پر خوبی کا اور بعض پر برائی کا ہمیشہ یکساں حکم لگایا ہے۔ سچائی، انصاف، پاسِ عہد اور امانت کو ہمیشہ سے انسانی اخلاقیات میں تعریف کا مستحق سمجھا گیا ہے اور کبھی کوئی ایسا دور نہیں گزرا جب جھوٹ، ظلم، بدعہدی اور خیانت کو پسند کیا گیا ہو۔ ہمدردی، رحم، فیاضی اور فراخ دلی کی ہمیشہ قدر کی گئی ہے اور خودغرضی، سنگدلی، بخل اور تنگ نظری کو کبھی عزت کا مقام حاصل نہیں ہوا۔ صبر و تحمل، استقلال، بردباری، اولوالعزمی و شجاعت ہمیشہ سے وہ اوصاف رہے ہیں جو داد کے مستحق سمجھے گئے اور بے صبری، چھچھورپن، تلوّن مزاجی، پست حوصلگی اور بزدلی پر کبھی تحسین و آفرین کے پھول نہیں برسائے گئے۔ ضبطِ نفس، خودداری، شائستگی اور ملنساری کا شمار ہمیشہ سے خوبیوں ہی میں ہوتا رہا ہے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ بندگیٔ نفس، کم ظرفی، بدتمیزی اور کج خلقی نے اخلاقی محاسن کی فہرست میں جگہ پائی ہو۔ فرض شناسی، وفاشعاری، مستعدی اور احساسِ ذمہ داری کی ہمیشہ عزت کی گئی ہے اور فرض ناشناس، بے وفا، کام چور اور غیر ذمہ دار لوگوں کو کبھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ اسی طرح اجتماعی زندگی کے اچھے اور برے اوصاف کے معاملہ میں بھی انسانیت کا معاملہ تقریباً متفق علیہ ہی رہا ہے۔ قدر کی مستحق ہمیشہ وہی سوسائٹی رہی ہے جس میں نظم اور انضباط ہو، تعاون

اور امداد باہمی ہو آپس کی محبت اور خیر خواہی ہو اجتماعی انصاف اور معاشرتی مساوات ہو، تفرقہ، انتشار، بدنظمی، بے ضابطگی، نااتفاقی، آپس کی بدخواہی، ظلم اور ناہمواری کو اجتماعی زندگی کے محاسن میں کبھی شمار نہیں کیا گیا۔ ایسا ہی معاملہ کردار کی نیکی و بدی کا بھی ہے۔ چوری، زنا، قتل، ڈاکہ، جعلسازی اور رشوت خواری کبھی اچھے افعال نہیں سمجھے گئے، بدزبانی، مردم آزاری، غیبت، چغل خوری، حسد، بہتان تراشی اور فساد انگیزی کو کبھی نیکی نہیں سمجھا گیا۔ مکّار، متکبر، ریاکار، منافق، ہٹ دھرم اور حریص لوگ کبھی بھلے آدمیوں میں شمار نہیں کئے گئے۔ اس کے برعکس والدین کی خدمت، رشتہ داروں کی مدد، ہمسایوں سے حُسنِ سلوک، دوستوں سے رفاقت، یتیموں اور بے کسوں کی خبر گیری، مریضوں کی تیمارداری اور مصیبت زدہ لوگوں کی اعانت ہمیشہ نیکی سمجھی گئی ہے۔ پاک دامن، خوش گفتار، نرم مزاج اور خیر اندیش لوگ ہمیشہ عزّت کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔ انسانیت اپنا اچھا عنصر انہی لوگوں کو سمجھتی رہی ہے جو راست باز اور کھرے ہوں، جن پر ہر معاملہ میں اعتبار کیا جا سکے، جن کا ظاہر و باطن یکساں اور قول و فعل مطابق ہو، جو اپنے حق پر قانع اور دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں فراخ دل ہوں، جو امن سے رہیں اور دوسروں کو امن دیں، جن کی ذات سے ہر ایک کو خیر کی اُمّید ہو اور کسی کو بُرائی کا اندیشہ نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسانی اخلاقیات دراصل وہ عالمگیر حقیقتیں ہیں جن کو سب انسان جانتے چلے آ رہے ہیں۔ نیکی اور بدی کوئی چھپی ہُوئی چیزیں نہیں ہیں کہ انھیں کہیں سے ڈھونڈ کر نکالنے کی ضرورت ہو۔ وہ تو انسان کی جانی پہچانی

چیزیں ہیں جن کا شعور آدمی کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید اپنی زبان میں نیکی کو معروف اور بدی کو منکر کہتا ہے یعنی نیکی وہ چیز ہے جسے سب انسان بھلا جانتے ہیں اور منکر وہ جسے کوئی خوبی اور بھلائی کی حیثیت سے نہیں جانتا۔ اسی حقیقت کو قرآن مجید دوسرے الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے۔ کہ الھمھا فجورھا وتقوٰھا۔ یعنی نفس انسان کو خدا نے برائی اور بھلائی کی واقفیت الہامی طور پر عطا کر رکھی ہے

اب سوال یہ ہے کہ اگر اخلاق کی برائی اور بھلائی جانی پہچانی چیزیں ہیں اور دنیا ہمیشہ سے بعض صفات کے نیک اور بعض کے بد ہونے پر متفق رہی ہے تو پھر دنیا میں یہ مختلف اخلاقی نظام کیسے ہیں؟ ان کے درمیان فرق کس بنا پر ہے؟ کیا چیز ہے جس کے باعث ہم کہتے ہیں کہ اسلام اپنا ایک مستقل اخلاقی نظام رکھتا ہے؟ اور اخلاق کے معاملہ میں آخر اسلام کا وہ خاص عطیہ (Contribution) کیا ہے جسے اس کی امتیازی خصوصیت کہا جا سکے؟

اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے جب ہم دنیا کے مختلف اخلاقی نظاموں پر نگاہ ڈالتے ہیں تو پہلی نظر میں جو فرق ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ مختلف اخلاقی صفات کو زندگی کے مجموعی نظام میں سمونے، اور ان کی حد، ان کا مقام اور ان کا مصرف تجویز کرنے، اور ان کے درمیان تناسب قائم کرنے میں یہ سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ پھر زیادہ گہری نگاہ سے دیکھنے پر اس فرق کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ دراصل وہ اخلاقی حسن و قبح کا معیار تجویز کرنے اور خیر و شر کے علم کا ذریعہ متعین کرنے میں مختلف ہیں۔ اور ان کے درمیان اس امر میں بھی اختلاف

ہے کہ قانون کے پیچھے وہ قوّتِ نافذہ (Sanction) کونسی ہے جس کے زور سے وہ جاری ہو اور وہ کیا محرکات ہیں جو انسان کو اس قانون کی پابندی پر آمادہ کریں۔ لیکن جب ہم اس اختلاف کے اسباب کا کھوج لگاتے ہیں تو آخرکار یہ حقیقت ہم پر کھلتی ہے کہ وہ اصلی چیز جس نے ان سب اخلاقی نظاموں کے راستے الگ کر دیئے ہیں یہ ہے کہ ان کے درمیان کائنات کے تصوّر، کائنات کے اندر انسان کی حیثیت، اور انسانی زندگی کے مقصد میں اختلاف ہے اور اِسی اختلاف نے جڑ سے لیکر شاخوں تک ان کی رُوح، ان کے مزاج اور ان کی شکل کو ایک دُوسرے سے مختلف کر دیا ہے۔ انسان کی زندگی میں اصل فیصلہ کن سوالات یہ ہیں کہ اس کائنات کا کوئی خدا ہے یا نہیں؟ ہے تو وہ ایک ہے یا بہت سے ہیں؟ جس کی خدائی مانی جائے اس کی صفات کیا ہیں؟ ہمارے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے؟ اس نے ہماری رہنمائی کا کوئی انتظام کیا ہے یا نہیں؟ ہم اس کے سامنے جواب دہ ہیں یا نہیں؟ جواب دہ ہیں تو کس چیز کی جواب دہی کرنی ہے؟ اور ہماری زندگی کا مقصد اور انجام کیا ہے جسے پیشِ نظر رکھ کر ہم کام کریں؟ ان سوالات کا جواب جس نوعیت کا ہوگا اسی کے مطابق نظامِ زندگی بنے گا اور اسی کے مناسبِ حال نظامِ اخلاق تیار ہوگا۔

اس مختصر گفتگو میں میرے لئے یہ مشکل ہے کہ میں دُنیا کے مختلف نظامہائے حیات کا جائزہ لے کر یہ بتا سکوں کہ ان میں سے کس کس نے ان سوالات کا جواب اختیار کیا ہے۔ اور اس جواب نے اس کی شکل اور راستے کے تعیّن پر کیا اثر ڈالا ہے۔ میں صرف اسلام کے متعلق عرض کروں گا۔

کہ وہ ان سوالات کا کیا جواب اختیار کرتا ہے اور اس کی بنا پر کس مخصوص قسم کا نظامِ اخلاق وجود میں آتا ہے۔

اسلام کا جواب یہ ہے کہ اس کائنات کا خدا ہے اور وہ ایک ہی خدا ہے۔ اسی نے اسے پیدا کیا ہے، وہی اس کا لاشریک مالک، حاکم اور پروردگار ہے اور اسی کی اطاعت پر یہ سارا نظام چل رہا ہے۔ وہ حکیم ہے، قادرِ مطلق ہے، کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے، سبوح و قدوس ہے (یعنی عیب، خطا، کمزوری اور نقص سے پاک ہے) اور اس کی خدائی ایسے طریقہ پر قائم ہے جس میں لاگ لپیٹ اور ٹیڑھ نہیں ہے۔ انسان اس کا پیدائشی بندہ ہے۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ اپنے خالق کی بندگی و اطاعت کرے۔ اس کی زندگی کے لئے کوئی صورت بجز اس کے صحیح نہیں ہے کہ وہ سراسر خدا کی بندگی ہو۔ اس بندگی کا طریقہ تجویز کرنا انسان کا اپنا کام نہیں ہے بلکہ یہ اس خدا کا کام ہے جس کا وہ بندہ ہے۔ خدا نے اس کی رہنمائی کے لیے پیغمبر بھیجے ہیں اور کتابیں نازل کی ہیں۔ انسان کا فرض ہے کہ اپنی زندگی کا نظام اسی سرچشمۂ ہدایت سے اخذ کرے۔ انسان اپنی زندگی کے پورے کارنامے کے لئے خدا کے سامنے جوابدہ ہے اور یہ جوابدہی اسے اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں کرنی ہے۔ دنیا کی موجودہ زندگی دراصل امتحان کی مہلت ہے اور یہاں انسان کی تمام سعی و کوشش اس مقصد پر مرکوز ہونی چاہیے کہ وہ آخرت کی جوابدہی میں اپنے خدا کے حضور کامیاب ہو۔ اس امتحان میں انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ شریک ہے۔ اس کی تمام قوتوں اور قابلیتوں کا امتحان ہے۔ زندگی کے ہر پہلو کا امتحان ہے۔ پوری کائنات میں جس جس

پھر سے جیسا کچھ بھی اس کو سابقہ پیش آتا ہے اس کی بے لاگ جانچ ہوتی ہے کہ انسان نے اس کے ساتھ کیسا معاملہ کیا۔ اور یہ جانچ وہ ہستی کرنے والی ہے جس نے زمین کے ذرّوں پر، ہوا اور پانی پر، کائناتی لہروں پر، اور خود انسان کے اپنے دل و دماغ اور دست و پا پر اس کی حرکات و سکنات ہی کا نہیں، اس کے خیالات اور ارادوں تک کا ٹھیک ٹھیک ریکارڈ مہیا کر رکھا ہے۔

یہ ہے وہ جواب جو اسلام نے زندگی کے بنیادی سوالات کا دیا ہے۔ یہ تصوّر کائنات و انسان اس اصلی اور انتہائی بھلائی کو متعین کر دیتا ہے جس کو پہنچنا انسانی سعی و عمل کا مقصود ہونا چاہئے اور وہ ہے خدا کی رضا۔ یہی وہ معیار ہے جس پر اسلام کے اخلاقی نظام میں کسی طرزِ عمل کو پرکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ خیر ہے یا شر۔ اس کے تعیّن سے اخلاق کو وہ محور مل جاتا ہے جس کے گرد پوری اخلاقی زندگی گھومتی ہے اور اس کی حالت بے لنگر کے جہاز کی سی نہیں رہتی کہ ہوا کے جھونکے اور موجوں کے تھپیڑے اسے ہر طرف دوڑاتے پھریں۔ یہ تعیّن ایک مرکزی مقصد سامنے رکھ دیتا ہے۔ جس کے لحاظ سے زندگی میں تمام اخلاقی صفات کی مناسب حدیں، مناسب جگہیں اور مناسب عملی صورتیں مقرر ہو جاتی ہیں، اور ہمیں وہ مستقل اخلاقی قدریں (Values) ہاتھ لگ جاتی ہیں جو تمام بدلتے ہوئے حالات میں اپنی جگہ ثابت و قائم رہ سکیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ رضائے الٰہی کے مقصود قرار پا جانے سے اخلاق کو ایک بلند ترین غائت مل جاتی ہے جس کی بدولت اخلاقی ارتقاء کے امکانات لامتناہی ہو سکتے ہیں اور کسی مرحلہ پر بھی اغراض پرستیوں کی آلائشیں اس کو ملوّث نہیں کر سکتیں۔

معیار دینے کے ساتھ اسلام اپنے اسی تصوّر کائنات و انسان سے ہم کو اخلاقی حسن و قبح کے علم کا ایک مستقل ذریعہ بھی دیتا ہے۔ اُس نے ہمارے علم اخلاق کو محض عقل، یا خواہشات، یا تجربے، یا علوم انسانی پر منحصر نہیں کر دیا ہے کہ ہمیشہ ان کے بدلتے ہوئے فیصلوں سے ہمارے اخلاقی احکام بھی بدلتے رہیں اور انہیں کوئی پائداری نصیب ہی نہ ہو سکے، بلکہ وہ ہمیں ایک متعین ماخذ دیتا ہے، یعنی خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت، جس سے ہم کو ہر حال اور ہر زمانے میں اخلاقی ہدایات ملتی ہیں۔ اور یہ ہدایات ایسی ہیں کہ خانگی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لے کر بین الاقوامی سیاست کے بڑے سے بڑے مسائل تک زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبے میں وہ ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ ان کے اندر معاملاتِ زندگی پر اخلاق کے اصولوں کا وہ وسیع ترین انطباق (Widest application) پایا جاتا ہے جو کسی مرحلہ پر کسی دوسرے ذریعۂ علم کی احتیاج ہمیں محسوس نہیں ہونے دیتا۔

پھر اسلام کے اسی تصوّرِ کائنات و انسان میں وہ قوّتِ نافذہ بھی موجود ہے جس کا قانونِ اخلاق کی پشت پر ہونا ضروری ہے، اور وہ ہے خدا کا خوف، آخرت کی باز پرس کا اندیشہ، اور ابدی مستقبل کی خرابی کا خطرہ۔ اگرچہ اسلام ایک ایسی طاقت و رائے عام بھی تیار کرنا چاہتا ہے جو اجتماعی زندگی میں اشخاص اور گروہوں کو اصولِ اخلاق کی پابندی پر مجبور کرنے والی ہو، اور ایک ایسا سیاسی نظام بھی بنانا چاہتا ہے جس کا اقتدار اخلاقی قانون کو بزور نافذ کرے، لیکن اس کا اصل اعتماد اس خارجی دباؤ پر نہیں ہے

بلکہ اس اندرونی دباؤ پر ہے جو خدا اور آخرت کے عقیدے میں مضمر ہے۔ اخلاقی احکام دینے سے پہلے اسلام آدمی کے دل میں یہ بات بٹھاتا ہے کہ تیرا معاملہ دراصل اس خدا کے ساتھ ہے جو ہر وقت ہر جگہ تجھے دیکھ رہا ہے۔ تو دنیا بھر سے چھپ سکتا ہے مگر اس سے نہیں چھپ سکتا۔ دنیا بھر کو دھوکا دے سکتا ہے مگر اسے نہیں دے سکتا۔ دنیا بھر سے بھاگ سکتا ہے مگر اس کی گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ دنیا محض تیرے ظاہر کو دیکھتی ہے مگر وہ تیری نیتوں اور ارادوں تک کو دیکھ لیتا ہے۔ دنیا کی تھوڑی سی زندگی میں تو جو چاہے کچھ کر لے بہرحال ایک دن تجھے مرنا ہے اور اس عدالت میں حاضر ہونا ہے جہاں وکالت رشوت، سفارش، جھوٹی شہادت، دھوکا اور فریب کچھ نہ چل سکے گا اور تیرے مستقبل کا بے لاگ فیصلہ ہو جائے گا۔ یہ عقیدہ بٹھا کر اسلام گویا ہر آدمی کے دل میں پولیس کی ایک چوکی بٹھا دیتا ہے جو اندر سے اس کو احکام کی تعمیل پر مجبور کرتی ہے، خواہ باہر ان احکام کی پابندی کرانے والی کوئی پولیس، عدالت اور جیل موجود ہو یا نہ ہو۔ اسلام کے قانونِ اخلاق کی پشت پر اصل زور یہی ہے جو اسے نافذ کراتا ہے۔ رائے عام اور حکومت کی طاقت اس کی تائید میں موجود ہو تو نورٌ علیٰ نور، ورنہ تنہا یہی ایمان مسلمان افراد اور مسلمان قوم کو سیدھا چلا سکتا ہے بشرطیکہ واقعی ایمان دلوں میں جاگزیں ہو۔

اسلام کا یہ تصورِ کائنات و انسان وہ محرکات بھی فراہم کرتا ہے جو انسان کو قانونِ اخلاق کے مطابق عمل کرنے کے لیے ابھارتے ہیں۔ انسان کا اس بات پر راضی ہو جانا کہ وہ خدا کو اپنا خدا مانے، اور اس کی بندگی کو اپنی

زندگی کا طریقہ بنائے، اور اس کی رضا کو اپنا مقصد زندگی ٹھہرائے، یہ اس بات کا کافی محرک ہے کہ وہ اُن احکام کی اطاعت کرے جن کے متعلق اسے یقین ہو کہ وہ خدا کے احکام ہیں۔ اس محرک کے ساتھ آخرت کا یہ عقیدہ بھی ایک دوسرا طاقتور محرک ہے کہ جو شخص احکام الٰہی کی اطاعت کرے گا اس کے لئے ابدی زندگی میں ایک شاندار مستقبل یقینی ہے، خواہ دُنیا کی اس عارضی زندگی میں اسے کتنی ہی مشکلات، نقصانات، اور تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑے اور اس کے برعکس جو یہاں سے خدا کی نافرمانیاں کرتا ہوا جائے گا اسے ابدی سزا بھگتنی پڑے گی، چاہے دُنیا کی چند روزہ زندگی میں وہ کیسے ہی مزے لُوٹ لے۔ یہ اُمید اور یہ خوف اگر کسی کے دل میں جاگزیں ہو تو اس میں اتنی زبردست قوتِ محرکہ موجود ہے کہ وہ ایسے مواقع پر بھی اسے نیکی پر اُبھار سکتی ہے جہاں نیکی کا نتیجہ دُنیا میں سخت نقصان دہ نکلتا نظر آتا ہو، اور ان مواقع پر بھی بدی سے دُور رکھ سکتی ہے جہاں بدی نہایت پُر لطف اور نفع بخش ہو۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام اپنا تصوّرِ کائنات، اپنا معیارِ خیر و شر، اپنا ماخذِ علمِ اخلاق، اپنی قوتِ نافذہ، اور اپنی قوتِ محرکہ الگ رکھتا ہے اور انہی چیزوں کے ذریعہ سے معروف اخلاقیات کے مواد کو اپنی قدروں کے مطابق ترتیب دے کر زندگی کے تمام شعبوں میں جاری کرتا ہے۔ اسی بنا پر یہ کہنا صحیح ہے کہ اسلام اپنا ایک مکمل اور مستقل بالذات اخلاقی نظام رکھتا ہے۔

اس نظام کی امتیازی خصوصیات یُوں تو بہت سی ہیں مگر ان میں تین سب سے نمایاں ہیں جنھیں اس کا خاص عطیہ کہا جا سکتا ہے۔

پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ رضائے الٰہی کو مقصود بنا کر اخلاق کے لئے ایک ایسا بلند معیار فراہم کرتا ہے جس کی وجہ سے اخلاقی ارتقا کے امکانات کی کوئی انتہا نہیں رہتی، ایک ماخذ علم مقرر کر کے اخلاق کو وہ پائداری اور استقلال بخشتا ہے جس میں ترقی کی گنجائش تو ہے مگر تلوّن اور نیرنگی کی گنجائش نہیں ہے۔ خوفِ خدا کے ذریعہ سے اخلاق کو وہ قوتِ نافذہ دیتا ہے جو خارجی دباؤ کے بغیر انسان سے اس کی پابندی کراتی ہے اور خدا و آخرت کے عقیدہ سے وہ قوتِ محرکہ فراہم کرتا ہے جو انسان کے اندر خود بخود قانونِ اخلاق پر عمل کرنے کی رغبت اور آمادگی پیدا کرتی ہے۔

دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ خواہ مخواہ کی اپج سے کام لے کر کچھ نرالے اخلاقیات نہیں پیش کرتا اور نہ انسان کے معروف اخلاقیات میں سے بعض کو گھٹانے اور بعض کو بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ انہی اخلاقیات کو لیتا ہے جو معروف ہیں، اور ان میں سے چند کو نہیں بلکہ سب کو لیتا ہے۔ پھر زندگی میں پورے توازن اور تناسب کے ساتھ ایک ایک کا محل، مقام اور مصرف تجویز کرتا ہے، اور ان کے انطباق کو اتنی وسعت دیتا ہے کہ انفرادی کردار، خانگی معاشرت، شہری زندگی، ملکی سیاست، معاشی کاروبار، بازار، مدرسہ، عدالت، پولیس لائن، چھاؤنی، میدانِ جنگ، صلح کانفرنس، غرض زندگی کا کوئی پہلو اور شعبہ ایسا نہیں رہ جاتا جو اخلاق کے ہمہ گیر اثر سے بچ جائے۔ ہر جگہ، ہر شعبہ زندگی میں وہ اخلاق کو حکمران بناتا ہے۔ اور اس کی کوشش یہ ہے کہ معاملاتِ زندگی کی باگیں خواہشات، اغراض اور مصلحتوں کے بجائے اخلاق کے ہاتھوں

میں ہوں۔

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانیت سے ایک ایسے نظامِ زندگی کے قیام کا مطالبہ کرتا ہے جو معروف پر قائم اور منکر سے پاک ہو۔ اس کی دعوت یہ ہے کہ جن بھلائیوں کو انسانیت کے ضمیر نے ہمیشہ بھلا جانا ہے، آؤ انھیں قائم کریں اور پروان چڑھائیں، اور جن برائیوں کو انسانیت ہمیشہ سے برا سمجھتی چلی آئی ہے آؤ انہیں دبائیں اور مٹائیں۔ اس دعوت پر جنھوں نے لبیک کہا انہی کو جمع کر کے اس نے ایک اُمّت بنائی جس کا نام "مُسلم" تھا۔ اور ان کو ایک اُمّت بنانے سے اس کی واحد غرض یہی تھی کہ وہ معروف کو جاری و قائم کرنے اور منکر کو دبانے اور مٹانے کے لئے منظم سعی کرے۔ اب اگر اسی اُمّت کے ہاتھوں معروف دبے اور منکر قائم ہونے لگے تو یہ ماتم کی جگہ ہے، خود اس امت کے لئے بھی اور دُنیا کے لئے بھی۔

(بہ اجازت ریڈیو پاکستان)
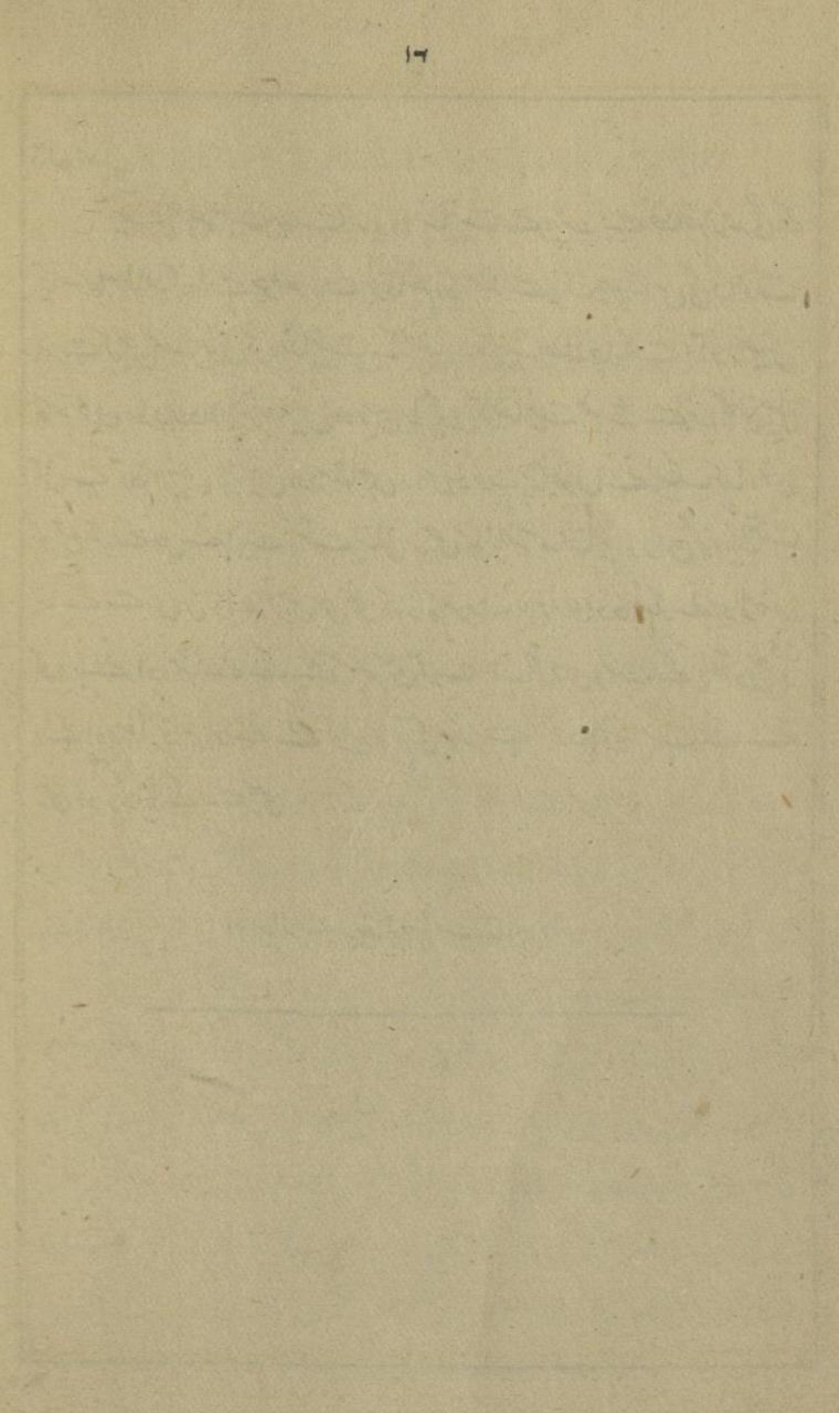
(۲)

اسلام کا سیاسی نظام

یہ تقریر ۲۰ جنوری ۱۹۴۹ء کو ریڈیو پاکستان، لاہور

سے نشر کی گئی

اسلام کے سیاسی نظام کی بنیاد تین اصولوں پر رکھی گئی ہے- توحید، رسالت اور خلافت - ان اصولوں کو اچھی طرح سمجھے بغیر اسلامی سیاست کے تفصیلی نظام کو سمجھنا مشکل ہے- اس لئے سب سے پہلے میں انہی کی مختصر تشریح کر دوں گا-

توحید کے معنی یہ ہیں کہ خدا اس دُنیا کا اور اس کے سب رہنے والوں کا خالق، پروردگار اور مالک ہے، حکومت و فرمانروائی اسی کی ہے، وہی حکم دینے اور منع کرنے کا حق رکھتا ہے، اور بندگی و اطاعت بلا شرکت غیرے اسی کے لئے ہے، ہماری یہ ہستی جس کی بدولت ہم موجود ہیں، ہمارے یہ جسمانی آلات اور طاقتیں جن سے ہم کام لیتے ہیں اور ہمارے وہ اختیارات جو ہمیں دنیا کی موجودات پر حاصل ہیں اور خود یہ موجودات جن پر ہم اپنے اختیارات استعمال کرتے ہیں ان میں سے کوئی چیز بھی نہ ہماری پیدا کردہ یا حاصل کردہ ہے اور نہ اس کی بخشش میں خدا کے ساتھ کوئی شریک ہے- اس لئے اپنی ہستی کا مقصد اور اپنی قوتوں کا مصرف اور اپنے اختیارات کی حدود متعین کرنا نہ تو ہمارا اپنا کام ہے نہ کسی دوسرے کو اس معاملے میں دخل دینے کا حق ہے- یہ صرف اس خدا کا کام ہے جس نے ہم کو ان قوتوں اور اختیارات کے ساتھ پیدا کیا اور دُنیا کی یہ بہت سی چیزیں ہمارے تصرف میں دی ہیں- توحید کا یہ اصول انسانی حاکمیت کی سرے سے نفی کر دیتا ہے- ایک انسان ہو یا ایک خاندان، ایک طبقہ اور ایک گروہ یا ایک پوری قوم، یا مجموعی طور پر تمام دُنیا کے انسان،

حاکمیت کا حق بہر حال کسی کو بھی نہیں پہنچتا۔ حاکم صرف خُدا ہے اور اسی کا حکم "قانون" ہے

خدا کا قانون جس ذریعے سے بندوں تک پہنچتا ہے اس کا نام "رسالت" ہے، اس ذریعے سے ہمیں دو چیزیں ملتی ہیں۔ ایک "کتاب" جس میں خود خُدا نے اپنا قانون بیان کیا ہے، دوسرے کتاب کی مستند تشریح جو رسول نے خُدا کا نمایندہ ہونے کی حیثیت سے اپنے قول و عمل میں پیش کی ہے۔ خدا کی کتاب میں وہ تمام اصول بیان کر دیئے گئے ہیں جن پر انسانی زندگی کا نظام قائم ہونا چاہیئے۔ اور رسول نے کتاب کے اس منشا کے مطابق عملاً ایک نظام زندگی بنا کر، چلا کر، اور اس کی ضروری تفصیلات بتا کر ہمارے لئے ایک نمونہ قائم کر دیا ہے۔ انہی دو چیزوں کے مجموعے کا نام اسلامی اصطلاح میں "شریعت" ہے اور یہی وہ اساسی دستور ہے جس پر اسلامی ریاست قائم ہوتی ہے۔

اب "خلافت" کو لیجیئے۔ یہ لفظ عربی زبان میں نیابت کے لئے بولا جاتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے دنیا میں انسان کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ زمین پر خدا کا نائب ہے، یعنی اس کے ملک میں اس کے دیئے ہوئے اختیارات استعمال کرتا ہے۔ آپ جب کسی شخص کو اپنی جائداد کا انتظام سپرد کرتے ہیں تو لازماً آپ کے پیش نظر چار باتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ جائداد کے اصل مالک آپ خود ہیں نہ کہ وہ شخص۔ دوسرے یہ کہ آپ کی جائداد میں اس شخص کو آپ کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق کام کرنا چاہیئے۔ تیسرے یہ کہ اسے اپنے اختیارات کو ان حدود کے اندر استعمال کرنا چاہیئے جو آپ نے اس کے

لئے مقرر کر دی ہوں۔ چوتھے یہ کہ آپ کی جو امداد ہیں اسے آپ کا منشا پورا کرنا ہو گا نہ کہ اپنا۔ یہ چار شرطیں نیابت کے تصور میں اس طرح شامل ہیں کہ نائب کا لفظ بولتے ہی خود بخود انسان کے ذہن میں آجاتی ہیں۔ اگر کوئی نائب ان چاروں شرطوں کو پورا نہ کرے تو آپ کہیں گے کہ وہ نیابت کے حدود سے تجاوز کر گیا اور اس نے وہ معاہدہ توڑ دیا جو نیابت کے عین مفہوم میں شامل تھا۔ ٹھیک یہی معنی ہیں جن میں اسلام انسان کو خدا کا خلیفہ قرار دیتا ہے اور اس خلافت کے تصور میں بھی چاروں شرطیں شامل ہیں۔ اسلامی نظریۂ سیاسی کی رُو سے جو ریاست قائم ہو گی وہ دراصل خدا کی حاکمیت کے تحت انسانی خلافت ہو گی جسے خدا کے ملک میں اس کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق، اس کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر کام کر کے اس کا منشا پورا کرنا ہو گا۔

خلافت کی اس تشریح کے سلسلے میں اتنی بات اور سمجھ لیجئے کہ اس معنی میں اسلامی نظریۂ سیاسی کسی ایک شخص یا خاندان یا طبقے کو خلیفہ قرار نہیں دیتا بلکہ اس پوری سوسائٹی کو خلافت کا منصب سونپتا ہے جو توحید اور رسالت کے بنیادی اصولوں کو تسلیم کر کے نیابت کی شرطیں پوری کرنے پر آمادہ ہو۔ ایسی سوسائٹی بحیثیت مجموعی خلافت کی حامل ہے اور یہ خلافت اس کے ہر ہر فرد کو پہنچتی ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جہاں اسلام میں "جمہوریت" کی ابتدا ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرے کا ہر فرد خلافت کے حقوق اور اختیارات رکھتا ہے۔ ان حقوق و اختیارات میں تمام افراد بالکل برابر کے حصے دار ہیں۔ کسی کو کسی پر نہ ترجیح حاصل ہے اور نہ یہی حق پہنچتا ہے کہ اسے ان حقوق و اختیارات سے محروم کر سکے۔ ریاست کا نظم و نسق چلانے کے لئے جو حکومت بنائی جائے گی وہ انہی افراد کی مرضی سے بنے گی۔ یہی لوگ اپنے اختیارات

خلافت کا ایک حصہ اسے سونپیں گے۔ اس کے بننے میں اُن کی رائے شامل ہوگی۔ اور ان کے مشورے ہی سے وہ چلے گی جو ان کا اعتماد حاصل کرے گا وہ ان کی طرف سے خلافت کے فرائض انجام دے گا اور جو ان کا اعتماد کھو دیگا اسے حکومت کے منصب سے ہٹنا پڑیگا۔ اس لحاظ سے اسلامی جمہوریت ایک مکمل جمہوریت ہے اتنی مکمل جتنی کوئی جمہوریت مکمل ہوسکتی ہے۔ البتہ جو چیز اسلامی جمہوریت کو مغربی جمہوریت سے الگ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ مغرب کا نظریہ سیاسی "جمہوری حاکمیت" کا قائل ہے اور اسلام جمہوری خلافت کا۔ وہاں جمہور خود بادشاہ ہیں اور یہاں بادشاہی خدا کی ہے اور جمہور اس کے خلیفہ ہیں۔ وہاں اپنی شریعت جمہور آپ بناتے ہیں۔ یہاں ان کو اس شریعت کی پابندی کرنی ہوتی ہے جو خدا نے اپنے رسول کے ذریعہ سے دی ہے۔ وہاں حکومت کا کام جمہور کا منشا پورا کرنا ہوتا ہے، یہاں حکومت اور اس کے بنانے والے جمہور سب کا کام خدا کا منشا پورا کرنا ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ مغربی جمہوریت ایک مطلق العنان خدائی ہے جو اپنے اختیارات کو آزادانہ استعمال کرتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی جمہوریت ایک پابند آئین بندگی ہے جو اپنے اختیارات کو خدا کی دی ہوئی ہدایات کے مطابق اس کی مقرر کردہ حدود کے اندر استعمال کرتی ہے۔

اب میں آپ کے سامنے اس ریاست کا ایک مختصر مگر واضح نقشہ پیش کرونگا۔ جو توحید، رسالت اور خلافت کی ان بنیادوں پر مبنی ہے۔

اس ریاست کا مقصد قرآن میں صاف طور پر یہ بتایا گیا ہے کہ وہ ان بھلائیوں کو قائم کرے، فروغ دے اور پروان چڑھائے جن سے خداوند عالم زندگی

کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے، اور ان برائیوں کو روکے، دبائے اور مٹائے جن کا وجود انسانی زندگی میں خداوند عالم کو پسند نہیں ہے۔ اسلام میں ریاست کا مقصد نہ محض انتظام ملکی ہے اور نہ یہ کہ وہ کسی خاص قوم کی اجتماعی خواہشات کو پورا کرے۔ اس کے بجائے اسلام اس کے سامنے ایک بلند نصب العین رکھ دیتا ہے جس کے حصول میں اس کو اپنے تمام وسائل و ذرائع اور اپنی تمام طاقتیں صرف کرنی چاہئیں۔ اور وہ یہ ہے کہ خدا اپنی زمین میں اور اپنے بندوں کی زندگی میں جو پاکیزگی، جو حسن، جو خیر و صلاح، جو ترقی و فلاح دیکھنا چاہتا ہے وہ رونما ہو اور بگاڑ کی ان تمام صورتوں کا سدِّ باب ہو جو خدا کے نزدیک اس کی زمین کو اجاڑنے والی اور اس کے بندوں کی زندگی کو خراب کرنے والی ہیں۔ اس نصب العین کو پیش کرنے کے ساتھ اسلام ہمارے سامنے خیر و شر دونوں کی ایک واضح تصویر رکھتا ہے جس میں مطلوبہ بھلائیوں اور ناپسندیدہ برائیوں کو صاف صاف نمایاں کر دیا گیا ہے۔ اس تصویر کو نگاہ میں رکھ کر ہر زمانے میں اور ہر ماحول میں اسلامی ریاست اپنا اصلاحی پروگرام بنا سکتی ہے۔

اسلام کا مستقل تقاضا یہ ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں اخلاقی اصولوں کی پابندی کی جائے۔ اس لئے وہ اپنی ریاست کے لئے بھی یہ قطعی پالیسی متعین کر دیتا ہے کہ اس کی سیاست بے لاگ انصاف، بے لوث سچائی، اور کھری ایمانداری پر قائم ہو وہ ملکی یا انتظامی یا قومی مصلحتوں کی خاطر جھوٹ، فریب اور بے انصافی کو کسی حال میں گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ملک کے اندر راعی اور رعایا کے باہمی تعلقات ہوں یا ملک کے باہر دوسری قوموں کے

ساتھ تعلقات، دونوں میں وہ صداقت، دیانت، اور انصاف کو اغراض و مصالح پر مقدم رکھنا چاہتا ہے۔ مسلمان افراد کی طرح مسلم ریاست پر بھی وہ یہ پابندی عائد کرتا ہے کہ عہد کرو تو اسے وفا کرو، لینے اور دینے کے پیمانے یکساں رکھو، جو کچھ کہتے ہو وہی کرو، اور جو کچھ کرتے ہو وہی کہو، اپنے حق کے ساتھ اپنے فرض کو بھی یاد رکھو اور دوسرے کے فرض کے ساتھ اس کے حق کو بھی نہ بھولو، طاقت کو ظلم کے بجائے انصاف کے قیام کا ذریعہ بناؤ، حق کو بہر حال حق سمجھو اور اسے ادا کرو، اقتدار کو خدا کی امانت سمجھو اور اس یقین کے ساتھ اسے استعمال کرو کہ اس امانت کا پورا حساب تمہیں اپنے خدا کو دینا ہے۔

اسلامی ریاست اگرچہ زمین کے کسی خاص خطے ہی میں قائم ہوتی ہے مگر وہ نہ انسانی حقوق کو ایک جغرافی حد میں محدود رکھتی ہے اور نہ شہریت کے حقوق کو۔ جہاں تک انسانیت کا تعلق ہے اسلام ہر انسان کے لیے چند بنیادی حقوق مقرر کرتا ہے اور ہر حال میں ان کے احترام کا حکم دیتا ہے، خواہ وہ انسان اسلامی ریاست کے حدود میں رہتا ہو یا اس سے باہر، خواہ دوست ہو یا دشمن، خواہ صلح رکھتا ہو یا برسرِ جنگ ہو۔ انسانی خون ہر حالت میں محترم ہے اور حق کے بغیر اسے نہیں بہایا جا سکتا۔ عورت، بچے، بوڑھے، بیمار اور زخمی پر دست درازی کرنا کسی حال میں جائز نہیں۔ عورت کی عصمت بہر حال احترام کی مستحق ہے اور اسے بے آبرو نہیں کیا جا سکتا۔ بھوکا آدمی روٹی کا، ننگا آدمی کپڑے کا، اور زخمی یا بیمار آدمی علاج اور تیمارداری کا بہر حال مستحق ہے خواہ وہ دشمن قوم ہی سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ اور ایسے ہی چند دوسرے حقوق اسلام نے انسان کو بحیثیت انسان ہونے کے عطا کیے ہیں اور اسلامی ریاست کے دستور میں ان کو بنیادی حقوق کی جگہ حاصل ہے۔ رہے شہریت کے حقوق تو وہ بھی اسلام صرف انہی لوگوں کو نہیں

دیتا جو اس کی ریاست کی حدود میں پیدا ہوئے ہوں، بلکہ ہر مسلمان خواہ وہ دُنیا کے کسی گوشے میں پیدا ہوا ہو اسلامی ریاست کے حدود میں داخل ہوتے ہی آپ سے آپ اس کا شہری بن جاتا ہے، اور پیدائشی شہریوں کے برابر حقوق کا مستحق قرار پاتا ہے۔ دُنیا میں جتنی اسلامی ریاستیں بھی ہوں گی ان سب کے درمیان شہریت مشترک ہوگی، مسلمان کو کسی اسلامی ریاست کے حدود میں داخل ہونے کے لئے پاسپورٹ کی ضرورت نہ ہوگی، مسلمان کسی نسلی، قومی یا طبقاتی امتیاز کے بغیر ہر اسلامی ریاست میں کسی بڑے سے بڑے ذمّہ داری کے منصب کا اہل ہو سکتا ہے۔

غیر مسلموں کے لئے جو کسی اسلامی ریاست کے حدود میں رہتے ہوں اسلام نے چند حقوق معین کر دیئے ہیں اور وہ لازماً دستور اسلامی کا جزو ہوں گے۔ اسلامی اصطلاح میں ایسے غیر مسلم کو "ذمّی" کہا جاتا ہے یعنی جس کی حفاظت کا اسلامی ریاست نے ذمّہ لیا ہے۔ ذمّی کی جان و مال اور آبرو بالکل مسلمان کی جان و مال اور آبرو کی طرح محترم ہے۔ فوجداری اور دیوانی قوانین میں مسلم اور ذمی کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ ذمیوں کے پرسنل لا میں اسلامی ریاست کوئی مداخلت نہ کرے گی۔ ذمیوں کو ضمیر و اعتقاد اور مذہبی رسوم و عبادات میں پوری آزادی حاصل ہوگی۔ ذمّی اپنے مذہب کی تبلیغ ہی نہیں بلکہ قانون کی حد میں رہتے ہوئے اسلام پر تنقید بھی کر سکتا ہے۔ یہ اور ایسے ہی بہت سے حقوق اسلامی دستور میں غیر مسلم رعایا کو دیئے گئے ہیں، اور یہ مستقل حقوق ہیں جنہیں اس وقت تک سلب نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ ہمارے ذمّے سے خارج نہ ہو جائیں۔ کوئی

غیر مسلم حکومت اپنی مسلم رعایا پر چاہے کتنے ہی ظلم ڈھائے، ایک اسلامی ریاست کے لئے اس کے جواب میں اپنی غیر مسلم رعایا پر شریعت کے خلاف ذرا سی دست درازی کرنا بھی جائز نہیں، حتیٰ کہ ہماری سرحد کے باہر اگر سارے مسلمان قتل کر دیئے جائیں تب بھی ہم اپنی حد کے اندر ایک ذمّی کا خون حق کے بغیر نہیں بہا سکتے۔

اسلامی ریاست کے انتظام کی ذمہ داری ایک امیر کے سپرد کی جائیگی جسے صدر جمہوریہ کے مماثل سمجھنا چاہیئے۔ امیر کے انتخاب میں ان تمام بالغ مردوں اور عورتوں کو رائے دینے کا حق ہوگا جو دستور کے اصولوں کو تسلیم کرتے ہوں۔ انتخاب کی بنیاد یہ ہوگی کہ روحِ اسلام کی واقفیت، اسلامی سیرت، خدا ترسی اور تدبر کے اعتبار سے کون شخص سوسائٹی کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کا اعتماد رکھتا ہے۔ ایسے شخص کو امارت کے لئے منتخب کیا جائے گا۔ پھر اس کی مدد کیلئے ایک مجلس شوریٰ بنائی جائے گی اور وہ بھی لوگوں کی منتخب کردہ ہوگی۔ امیر کے لئے لازم ہوگا کہ ملک کا انتظام اہل شوریٰ کے مشورے سے کرے۔ ایک امیر اسی وقت تک حکمران رہ سکتا ہے جب تک اسے لوگوں کا اعتماد حاصل رہے۔ عدم اعتماد کی صورت میں اسے جگہ خالی کرنی ہوگی اور جب تک وہ لوگوں کا اعتماد رکھتا ہے اسے حکومت کے پورے اختیارات حاصل رہیں گے اور وہ شوریٰ کی اکثریت کے مقابلے میں ویٹو استعمال کر سکے گا۔ امیر اور اس کی حکومت پر عام شہریوں کو نکتہ چینی کا پورا حق حاصل ہوگا۔

اسلامی ریاست میں قانون سازی ان حدود کے اندر ہوگی جو شریعت میں مقرر کی گئی ہیں۔ خدا اور رسول کے واضح احکام صرف اطاعت کے لئے ہیں،

کوئی مجلس قانون ساز ان میں ردّو بدل نہیں کر سکتی۔ رہے وہ احکام جن میں دو یا زیادہ تعبیریں ممکن ہیں تو ان میں شریعت کا منشا معلوم کرنا ان لوگوں کا کام ہے جو شریعت کا علم رکھتے ہوں۔ اس لئے ایسے معاملات مجلس شوریٰ کی اس سب کمیٹی کے سپرد کئے جائیں گے جو علماء پر مشتمل ہوگی۔ اس کے بعد ایک وسیع میدان ان معاملات کا ہے جن میں شریعت نے کوئی حکم نہیں دیا ہے ایسے تمام معاملات میں مجلس شوریٰ قوانین بنانے کے لئے آزاد ہے۔

اسلام میں عدالت انتظامی حکومت کے ماتحت نہیں ہے بلکہ براہِ راست خُدا کی نمایندہ اور اس کو جواب دہ ہے۔ حاکمانِ عدالت کو مقرر تو انتظامی حکومت ہی کرے گی، مگر جب ایک شخص عدالت کی کرسی پر بیٹھ جائے گا تو وہ خُدا کے قانون کے مطابق لوگوں کے درمیان بے لاگ انصاف کرے گا اور اس کے انصاف کی زد سے خود حکومت بھی بچ نہ سکے گی، حتیٰ کہ خود حکومت کے رئیس اعلیٰ کو بھی مدعی یا مدعا علیہ کی حیثیت سے اس کے سامنے اسی طرح حاضر ہونا پڑیگا جیسے ایک عام شہری حاضر ہوتا ہے۔

(بہ اجازت ریڈیو پاکستان)

(۳)

اسلام کا معاشرتی نظام

یہ تقریر ۱ فروری ۱۹۴۸ء کو ریڈیو پاکستان لاہور
سے نشر کی گئی۔

اسلام کے معاشرتی نظام کا سنگِ بنیاد یہ نظریہ ہے کہ دُنیا کے سب انسان ایک نسل سے ہیں۔ خُدا نے سب سے پہلے ایک انسانی جوڑا پیدا کیا تھا پھر اسی جوڑے سے وہ سارے لوگ پیدا ہوئے جو دُنیا میں آباد ہیں۔ ابتدا میں ایک مدّت تک اس جوڑے کی اولاد ایک ہی اُمّت بنی رہی۔ ایک ہی اس کا دین تھا۔ ایک ہی اس کی زبان تھی۔ کوئی اختلاف اس کے درمیان نہ تھا۔ مگر جوں جوں ان کی تعداد بڑھتی گئی، وہ زمین پر پھیلتے چلے گئے اور اس پھیلاؤ کی وجہ سے قدرتی طور پر مختلف نسلوں، قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان کی زبانیں الگ ہو گئیں، ان کے لباس الگ ہو گئے، رہن سہن کے طریقے الگ ہو گئے اور جگہ جگہ کی آب و ہوا نے ان کے رنگ و روپ اور خد و خال تک بدل دیئے۔ یہ سب اختلافات فطری اختلافات ہیں۔ واقعات کی دُنیا میں موجود ہیں اس لئے اسلام ان کو بطور ایک واقعے کے تسلیم کرتا ہے۔ وہ ان کو مٹانا نہیں چاہتا بلکہ ان کا یہ فایدہ مانتا ہے کہ انسان کا باہمی تعارف اور تعاون اسی صورت سے ممکن ہے۔ لیکن ان اختلافات کی بنا پر انسانوں میں نسل، رنگ، زبان، قومیت اور وطنیت کے جو تعصبات پیدا ہو گئے ہیں ان سب کو اسلام غلط قرار دیتا ہے۔ انسان اور انسان کے درمیان اُونچ نیچ، شریف اور کمین، اپنے اور غیر کے جتنے فرق پیدائش کی بُنیاد پر کر لئے گئے ہیں اسلام کے نزدیک یہ سب جاہلیت کی باتیں ہیں۔ وہ تمام دُنیا کے انسانوں سے کہتا ہے کہ تم سب ایک ماں اور ایک باپ کی اولاد ہو لہٰذا ایک دوسرے کے بھائی ہو اور انسان ہونے کی حیثیت سے برابر ہو۔

انسانیت کا یہ تصوّر اختیار کرنے کے بعد اسلام کہتا ہے کہ انسان اور

انسان کے درمیان اصلی فرق اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ نسل، رنگ، وطن اور زبان کا نہیں بلکہ خیالات، اخلاق اور اصولوں کا ہو سکتا ہے۔ ایک ماں کے دو بچے اپنے نسب کے لحاظ سے چاہے ایک ہوں لیکن اگر ان کے خیالات اور اخلاق ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو زندگی میں دونوں کی راہیں الگ ہو جائیں گی۔ اس کے برعکس مشرق اور مغرب کے انتہائی فاصلے پر رہنے والے دو انسان اگرچہ ظاہر میں کتنے ہی ایک دوسرے سے دور ہوں، لیکن اگر خیالات متفق ہیں اور اخلاق ملتے جلتے ہیں تو ان کی زندگی کا راستہ ایک ہوگا۔ اس نظریئے کی بنیاد پر اسلام دنیا کے تمام نسلی، وطنی اور قومی معاشروں کے برعکس ایک فکری، اخلاقی اور اصولی معاشرہ تعمیر کرتا ہے، جس میں انسان اور انسان کے ملنے کی بنیاد اس کی پیدائش نہیں بلکہ ایک عقیدہ اور ایک اخلاقی ضابطہ ہے۔ ہر وہ شخص جو ایک خدا کو اپنا مالک و معبود مانے، اور پیغمبروں کی لائی ہوئی ہدایت کو اپنا قانونِ زندگی تسلیم کرے، اس معاشرے میں شامل ہو سکتا ہے، خواہ وہ افریقہ کا رہنے والا ہو یا امریکہ کا، خواہ وہ سامی نسل کا ہو یا آریہ نسل کا۔ خواہ وہ کالا ہو یا گورا، خواہ وہ ہندی بولتا ہو یا عربی۔ جو انسان بھی اس معاشرے میں شامل ہوں گے ان سب کے حقوق اور معاشرتی مرتبے یکساں ہوں گے، کسی قسم کے نسلی، قومی یا طبقاتی امتیازات ان کے درمیان نہ ہوں گے۔ کوئی اونچا اور کوئی نیچا نہ ہوگا۔ کوئی چھوت چھات ان میں نہ ہوگی۔ کسی کا ہاتھ لگنے سے کوئی ناپاک نہ ہوگا۔ شادی بیاہ اور کھانے پینے اور مجلسی میل جول میں ان کے درمیان کسی قسم کی رکاوٹیں نہ ہوں گی، کوئی اپنی پیدائش یا اپنے پیشے کے لحاظ سے ذلیل یا کمین نہ ہوگا۔ کسی کو اپنی ذات برادری یا حسب نسب کی بنا پر کوئی مخصوص

حقوق حاصل نہ ہوسکیں گے۔ آدمی کی بزرگی اس کے خاندان یا اس کے مال کی وجہ سے نہ ہوگی بلکہ صرف اس وجہ سے ہوگی کہ اس کے اخلاق زیادہ اچھے ہیں اور وہ خدا ترسی میں دوسروں سے بڑھا ہوا ہے۔

یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جو نسل و رنگ اور زبان کی حد بندیوں اور جغرافی سرحدوں کو توڑ کر روئے زمین کے تمام خطوں پر پھیل سکتا ہے اور اس کی بنیاد پر انسانوں کی ایک عالمگیر برادری قائم ہو سکتی ہے۔ نسلی اور وطنی معاشروں میں تو صرف وہ لوگ شامل ہو سکتے ہیں جو کسی نسل یا وطن میں پیدا ہوئے ہوں، اس سے باہر کے لوگوں پر ہر ایسے معاشرے کا دروازہ بند ہوتا ہے۔ مگر اس فکری اور اصولی معاشرے میں ہر وہ شخص برابر کے حقوق کے ساتھ شامل ہو سکتا ہے جو ایک عقیدے اور ایک اخلاقی ضابطے کو تسلیم کرے۔ رہے وہ لوگ جو اس عقیدے اور ضابطے کو نہ مانیں تو یہ معاشرہ انھیں اپنے دائرے میں تو نہیں لیتا، مگر انسانی برادری کا تعلق ان کے ساتھ قائم کرنے اور انسانیت کے حقوق انھیں دینے کے لئے تیار ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایک ماں کے دو بچے اگر خیالات میں مختلف ہیں تو ان کے طریق زندگی بہرحال مختلف ہوں گے، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ ایک دوسرے کے بھائی نہیں رہے۔ بالکل اسی طرح نسل انسانی کے دو گروہ یا ایک ملک میں رہنے والے لوگوں کے دو گروہ بھی اس عقیدے اور اصول میں اختلاف رکھتے ہیں تو ان کے معاشرے یقیناً الگ ہوں گے، مگر انسانیت بہرحال ان میں مشترک رہے گی۔

اس مشترک انسانیت کی بنا پر زیادہ سے زیادہ جن حقوق کا تصوّر کیا جا سکتا ہے وہ سب اسلامی معاشرے نے غیر اسلامی معاشروں کے لئے تسلیم کئے ہیں۔

اسلامی نظامِ معاشرت کی ان بنیادوں کو سمجھ لینے کے بعد آئیے اب ہم دیکھیں کہ وہ کیا اصول اور طریقے ہیں جو اسلام نے انسانی میل ملاپ کی مختلف صورتوں کے لئے مقرر کئے ہیں۔

انسانی معاشرت کا اوّلین اور بنیادی ادارہ خاندان ہے۔ خاندان کی بنا ایک مرد اور ایک عورت کے ملنے سے پڑتی ہے اس ملاپ سے ایک نئی نسل وجود میں آتی ہے۔ پھر اس سے رشتے اور کنبے اور برادری کے دوسرے تعلقات پیدا ہوتے ہیں اور بالآخر یہی چیز پھیلتے پھیلتے ایک وسیع معاشرے تک جا پہنچتی ہے پھر خاندان ہی وہ ادارہ ہے جس میں ایک نسل اپنے بعد آنے والی نسل کو انسانی تمدّن کی وسیع خدمات سنبھالنے کے لئے نہایت محبّت، ایثار، دلسوزی اور خیر خواہی کے ساتھ تیار کرتی ہے۔ یہ ادارہ تمدّنِ انسانی کے بقا اور نشو و نما کے لئے صرف رنگروٹ ہی بھرتی نہیں کرتا بلکہ اس کے کارکن دل سے اس بات کے خواہشمند ہوتے ہیں کہ اُن کی جگہ لینے والے خود ان سے بہتر ہوں۔ اس بنا پر یہ ایک حقیقت ہے کہ خاندان ہی انسانی تمدّن کی جڑ ہے اور اس جڑ کی صحّت و طاقت پر خود تمدّن کی صحت و طاقت کا مدار ہے۔ اسی لئے اسلام معاشرتی مسائل میں سب سے پہلے اس امر کی طرف توجّہ کرتا ہے کہ خاندان کے ادارے کو صحیح ترین بنیادوں

پر قائم کیا جائے۔

اسلام کے نزدیک مرد اور عورت کے تعلق کی صحیح صورت صرف وہ ہے جس کے ساتھ معاشرتی ذمّہ داریاں قبول کی گئی ہوں اور جس کے نتیجے میں ایک خاندان کی بنا پڑے۔ آزادانہ اور غیر ذمّہ دارانہ تعلق کو وہ محض ایک معصوم سی تفریح یا ایک معمولی سی بے راہ روی سمجھ کر ٹال نہیں دیتا بلکہ اس کی نگاہ میں یہ انسانی تمدّن کی جڑ کاٹ دینے والا فعل ہے، اس لئے ایسے تعلق کو وہ حرام اور قانونی جرم قرار دیتا ہے، اس کے لئے سخت سزا تجویز کرتا ہے تاکہ سوسائٹی میں ایسے تمدن کش تعلقات رائج نہ ہونے پائیں، اور معاشرت کو ان اسباب سے پاک کر دینا چاہتا ہے جو اس غیر ذمّہ دارانہ تعلق کے لئے محرک ہوتے ہوں یا اس کے مواقع پیدا کرتے ہوں — پردے کے احکام، مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول کی ممانعت، موسیقی اور تصاویر پر پابندیاں، اور فواحش کی اشاعت کے خلاف رکاوٹیں سب اسی کی روک تھام کے لئے ہیں۔ اور ان کا مرکزی مقصد خاندان کے ادارے کو محفوظ اور مضبوط کرنا ہے۔ دوسری طرف ذمّہ دارانہ تعلق یعنی نکاح کو اسلام محض جائز ہی نہیں بلکہ اسے ایک نیکی، ایک کارِ ثواب، ایک عبادت قرار دیتا ہے سن بلوغ کے بعد مرد اور عورت کے مجرد رہنے کو ناپسند کرتا ہے۔ ہر نوجوان کو اس بات پر اکساتا ہے کہ تمدّن کی جن ذمّہ داریوں کا بار اس کے ماں باپ نے اُٹھایا تھا اپنی باری آنے پر وہ بھی انہیں اُٹھائے۔ اسلام رہبانیت کو

نیکی نہیں سمجھتا بلکہ اسے فطرت اللہ کے خلاف ایک بدعت ٹھیراتا ہے۔ وہ ان تمام رسموں اور رواجوں کو بھی سخت ناپسند کرتا ہے جن کی وجہ سے نکاح ایک مشکل اور بھاری کام بن جاتا ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ معاشرے میں نکاح کو آسان ترین اور زنا کو مشکل ترین فعل ہونا چاہیے، نہ یہ کہ نکاح مشکل اور زنا آسان ہو۔ اسی لیے اس نے چند مخصوص رشتوں کو حرام ٹھیرانے کے بعد تمام دور و نزدیک کے رشتہ داروں میں ازدواجی تعلق کو جائز کر دیا ہے، ذات اور برادری کی تفریقیں اڑا کر تمام مسلمانوں میں آپس کے شادی بیاہ کی کھلی اجازت دے دی ہے، مہر اور جہیز اس قدر ہلکے رکھنے کا حکم دیا ہے جنھیں فریقین بآسانی برداشت کر سکیں، اور رسم نکاح ادا کرنے کے لیے کسی قاضی، پنڈت، پروہت یا دفتر و رجسٹر کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسلامی معاشرے کا نکاح ایک ایسی سادہ سی رسم ہے جو ہر کہیں دو گواہوں کے سامنے بالغ زوجین کے ایجاب و قبول سے انجام پا سکتی ہے مگر ضروری یہ ہے کہ یہ ایجاب و قبول خفیہ نہ ہو بلکہ بستی میں اعلان کے ساتھ ہو۔

خاندان کے اندر اسلام نے مرد کو ناظم کی حیثیت دی ہے تاکہ وہ اپنے گھر میں ضبط قائم رکھے۔ بیوی کو شوہر کی اور اولاد کو ماں اور باپ دونوں کی اطاعت و خدمت کا حکم دیا ہے۔ ایسے ڈھیلے ڈھالے نظام خاندانی کو اسلام پسند نہیں کرتا جس میں کوئی انضباط نہ ہو، اور گھر والوں کے اخلاق و معاملات درست رکھنے کا کوئی بھی ذمہ دار نہ ہو۔ نظم بہرحال ایک ذمہ دار ناظم ہی سے قائم

ہو سکتا ہے اور اسلام کے نزدیک اس ذمّہ داری کے لئے خاندان کا باپ ہی فطرتاً موزوں ہے مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ مرد کو گھر کا ایک جابر و قاہر فرماں روا بنا دیا گیا ہے اور عورت ایک بے بس لونڈی کی حیثیت سے اس کے حوالے کر دی گئی ہے اسلام کے نزدیک ازدواجی زندگی کی اصل رُوح محبّت و رحمت ہے۔ عورت کا فرض اگر شوہر کی اطاعت ہے تو مرد کا بھی یہ فرض ہے کہ اپنے اختیارات کو اصلاح کے لئے استعمال کرے نہ کہ زیادتی کے لئے۔ اسلام ایک ازدواجی تعلق کو اُسی وقت تک باقی رکھنا چاہتا ہے جب تک اس میں محبت کی شیرینی یا کم از کم رفاقت کا امکان باقی ہو۔ جہاں یہ امکان باقی نہ رہے وہاں وہ مرد کو طلاق اور عورت کو خلع کا حق دیتا ہے اور بعض صورتوں میں اسلامی عدالت کو یہ اختیارات عطا کرتا ہے کہ وہ ایسے نکاح کو توڑ دے جو رحمت کے بجائے زحمت بن گیا ہو۔

خاندان کے محدود دائرے سے باہر قریب ترین سرحد رشتہ داری کی ہے جس کا دائرہ کافی وسیع ہوتا ہے۔ جو لوگ ماں اور باپ کے تعلق سے یا بھائی اور بہنوں کے تعلق سے یا سسرالی تعلق سے ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوں، اسلام ان سب کو ایک دوسرے کا ہمدرد، مددگار اور غمگسار دیکھنا چاہتا ہے۔ قرآن میں جگہ جگہ ذوی القربیٰ یعنی رشتہ داروں سے نیک سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ حدیث میں صلۂ رحمی کی بار بار تاکید کی گئی ہے اور اسے بڑی نیکی شمار کیا گیا ہے۔ وہ شخص اسلام کی نگاہ میں سخت ناپسندیدہ ہے جو اپنے رشتہ داروں سے سرد مہری اور طوطا

(۱)- نیکی اور پرہیز گاری کے کاموں میں تعاون کرو اور بدی و زیادتی کے کاموں میں تعاون نہ کرو۔ (قرآن)

(۲)۔ تمھاری دوستی اور دشمنی خدا کی خاطر ہونی چاہیے، جو کچھ دو اس لئے دو کہ خدا اس کا دینا پسند کرتا ہے، اور جو کچھ روکو اس لئے روکو کہ خدا کو اس کا دینا پسند نہیں ہے (حدیث)

(۳)، تم وہ بہترین اُمّت ہو جسے والوں کی بھلائی کے لئے اُٹھایا گیا ہے۔ تمھارا کام نیکی کا حکم دینا اور بدی کو روکنا ہے۔ (قرآن)

(۴) آپس میں بدگمانی نہ کرو، ایک دوسرے کے معاملات کا تجسّس نہ کرو، ایک کے خلاف دوسرے کو نہ اُکساؤ، آپس کے حسد اور بغض سے بچو، ایک دوسرے کی کاٹ میں نہ پڑو، اللہ کے بندے اور آپس میں بھائی بن کر رہو (حدیث)

(۵)۔ کسی ظالم کو جانتے ہوئے اس کا ساتھ نہ دو۔ (حدیث)

(۶) غیر حق میں اپنی قوم کی حمایت کرنا ایسا ہے جیسے تمھارا اُونٹ کنوئیں میں گرنے لگا تو تم بھی اُس کی دُم پکڑ کر اُس کے ساتھ ہی جا گرے (حدیث)

(۷) دوسروں کے لئے وہی کچھ پسند کرو جو تم خود اپنے لئے پسند کرتے ہو (حدیث)

(۴)

اسلام کا اقتصادی نظام

یہ تقریر ۲ مارچ سنہ ۱۹۴۸ء کو ریڈیو پاکستان
سے نشر کی گئی

انسان کی معاشی زندگی کو انصاف اور راستی پر قائم رکھنے کے لئے اسلام نے چند اصول اور کچھ حدود مقرر کر دیئے ہیں۔ تاکہ دولت کی پیدائش، استعمال اور گردش کا سارا نظام انہی خطوط کے اندر چلے جو اس کے لئے کھینچ دیئے گئے ہیں۔ دولت کی پیداوار کے طریقے اور اس کی گردش کی صورتیں کیا ہوں؟ اسلام کو اس سوال سے کوئی بحث نہیں ہے۔ یہ چیزیں تو مختلف زمانوں میں تمدن کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ بنتی اور بدلتی رہتی ہیں۔ ان کا تعین انسانی حالات و ضروریات کے لحاظ سے خود بخود ہو جاتا ہے۔ اسلام جو کچھ چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ تمام زمانوں اور حالات میں انسان کے معاشی معاملات جو شکلیں بھی اختیار کریں ان میں یہ اصول مستقل طور پر قائم رہیں اور ان حدود کی لازماً پابندی کی جائے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے زمین اور اس کی سب چیزیں خدا نے نوع انسانی کے لئے بنائی ہیں، اس لئے ہر انسان کا یہ پیدائشی حق ہے کہ زمین سے اپنا رزق حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس حق میں تمام انسان برابر کے شریک ہیں کسی کو اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ نہ کسی کو اس معاملے میں دوسروں پر ترجیح ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ کسی شخص یا نسل یا طبقے پر ایسی کوئی پابندی از روئے شرع عائد نہیں ہو سکتی کہ وہ رزق کے وسائل میں سے بعض کو استعمال کرنے کا حقدار ہی نہ رہے، یا بعض پیشوں کا دروازہ اس کے لئے بند کر دیا جائے۔ اسی طرح ایسے امتیازات بھی شرعاً قائم نہیں ہو سکتے جن کی بنا پر کوئی ذریعہ معاش یا وسیلۂ رزق کسی مخصوص طبقے یا نسل یا خاندان کا اجارہ بن کر رہ جائے۔ خدا کی بنائی ہوئی زمین پر اس کے پیدا کئے ہوئے وسائل رزق میں سے اپنا حصہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا سب انسانوں

کا یکساں حق ہے اور اس کوشش کے مواقع سب کیلئے یکساں کھلے ہونے چاہئیں۔

قدرت کی جن نعمتوں کو تیار کرنے یا کارآمد بنانے میں کسی کی محنت وقابلیت کا کوئی دخل نہ ہو وہ سب انسانوں کے لئے مباح عام ہیں۔ ہر شخص کو حق ہے۔ کہ اپنی ضرورت بھر ان سے فائدہ اٹھائے۔ دریاؤں اور چشموں کا پانی، جنگل کی لکڑی، قدرتی درختوں کے پھل، خودرو گھاس اور چارہ، ہوا اور پانی اور صحرا کے جانور، سطح زمین پر کھلی ہوئی کانیں، اس قسم کی چیزوں پر نہ تو کسی کی اجارہ داری قائم ہو سکتی ہے۔ اور نہ ایسی پابندیاں لگائی جاسکتی ہیں کہ بندگان خدا کچھ دیئے بغیر ان سے اپنی ضرورتیں پوری نہ کر سکیں۔ ہاں جو لوگ تجارتی اغراض کے لئے بڑے پیمانے پر ان میں سے کسی چیز کو استعمال کرنا چاہیں ان پر ٹیکس لگایا جاسکتا ہے۔

خدا نے جو چیزیں انسان کے فائدے کے لئے بنائی ہیں انہیں لے کر بیکار ڈال رکھنا صحیح نہیں ہے۔ یا تو ان سے خود فائدہ اٹھاؤ، ورنہ چھوڑ دو تاکہ دوسرے ان سے متمتع ہوں۔ اسی اصول کی بنا پر اسلامی قانون یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کوئی شخص اپنی زمین کو تین سال سے زیادہ مدت تک افتادہ حالت میں نہیں رکھ سکتا۔ اگر وہ اس کو زراعت یا عمارت یا کسی دوسرے کام میں استعمال نہ کرے تو تین سال گزر جانے کے بعد وہ متروکہ زمین سمجھی جائے گی، کوئی دوسرا شخص اسے کام میں لے آئے تو اس پر دعویٰ نہ کیا جاسکے گا، اور اسلامی حکومت کو بھی یہ اختیار ہوگا کہ اس زمین کو کسی کے حوالے کر دے۔

جو شخص براہ راست قدرت کے خزانے میں سے کوئی چیز لے اور اپنی محنت و قابلیت سے اسکو کارآمد بنائے وہ اس چیز کا مالک ہے۔ مثلاً کسی افتادہ زمین کو جس پر کسی کے حقوق ملکیت ثابت نہ ہوں، اگر کوئی شخص اپنے قبضے میں لے لے اور کسی مفید

کام ہیں لے اسے استعمال کرنا شروع کر دے تو اس کو بید خل نہیں کیا جاسکتا۔ اسلامی نظریئے کے مطابق دنیا میں تمام مالکانہ حقوق کی ابتدا اسی طرح ہوئی ہے۔ پہلے پہل جب زمین پہ انسانی آبادی شروع ہوئی تو سب چیزیں سب انسانوں کے لیئے مباحِ عام تھیں۔ پھر جس جس شخص نے جس مباح چیز کو اپنے قبضے میں لے کر کسی طور پہ کار آمد بنا لیا وہ اس کا مالک ہو گیا، یعنی اسے یہ حق حاصل ہو گیا کہ اسی کا استعمال اپنے لیئے مخصوص رکھے اور دوسرے اسے استعمال کرنا چاہیں تو ان سے اس کا معاوضہ لے۔ یہ چیز انسان کے سارے معاشی معاملات کی فطری بنیاد ہے اور اس بنیاد کو اپنی جگہ قائم رہنا چاہیئے۔

جائز شرعی طریقوں سے جو مالکانہ حقوق کسی کو دنیا میں حاصل ہوں وہ بہر حال احترام کے مستحق ہیں۔ کلام اگر ہو سکتا ہے تو اس امر میں ہو سکتا ہے کہ کوئی ملکیت شرعاً صحیح ہے یا نہیں۔ جو ملکیتیں از روئے شرع ناجائز ہوں انہیں بے شک ختم ہو جانا چاہیئے۔ مگر جو ملکیتیں شرعاً صحیح ہوں، کسی حکومت اور کسی مجلس قانون ساز کو یہ حق نہیں ہے کہ انہیں سلب کر لے یا ان کے مالکوں کے شرعی حقوق میں کسی قسم کی کمی بیشی کرے۔ اجتماعی بہتری کا نام لے کر کوئی ایسا نظام قائم نہیں کیا جا سکتا جو شریعت کے دیئے ہوئے حقوق کو پامال کرنے والا ہو۔ جماعت کے مفاد کے لیئے افراد کی ملکیتوں پہ جو پابندیاں شریعت نے خود ہی لگا دی ہیں ان میں کمی کرنا جتنا بڑا ظلم ہے اتنا ہی بڑا ظلم ان پہ اضافہ کرنا بھی۔ یہ بات اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ افراد کے شرعی حقوق کی حفاظت کرے اور ان سے جماعت کے وہ حقوق وصول کرے جو شریعت نے ان پہ عائد کیئے ہیں۔

خدا نے اپنی نعمتوں کی تقسیم میں مساوات ملحوظ نہیں رکھی ہے بلکہ اپنی حکمت کی بنا پر بعض انسانوں کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ حسن، خوش آوازی، تندرستی، جسمانی طاقتیں، دماغی قابلیتیں، پیدائشی ماحول، اور اسی طرح کی دوسری چیزیں سب انسانوں کو یکساں نہیں ملیں۔ ایسا ہی معاملہ رزق کا بھی ہے۔ خدا کی بنائی ہوئی فطرت خود اس بات کی متقاضی ہے کہ انسانوں کے درمیان رزق میں تفاوت ہو۔ لہٰذا وہ تمام تدبیریں اسلامی نقطۂ نظر سے مقصد اور اصول میں غلط ہیں جو انسانوں کے درمیان ایک مصنوعی معاشی مساوات قائم کرنے کے لئے اختیار کی جائیں۔ اسلام جس مساوات کا قائل ہے وہ رزق میں مساوات نہیں بلکہ حصول رزق کی جد و جہد کے مواقع میں مساوات ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سوسائٹی میں ایسی قانونی اور رواجی رکاوٹیں باقی نہ رہیں جن کی بنا پر کوئی شخص اپنی قوت و استعداد کے مطابق معاشی جد و جہد نہ کر سکتا ہو، اور ایسے امتیازات بھی قائم نہ رہیں جو بعض طبقوں، نسلوں اور خاندانوں کی پیدائشی خوش نصیبی کو مستقل قانونی تحفظات میں تبدیل کر دیتے ہوں۔ یہ دونوں طریقے فطری نامساوات کی جگہ زبردستی ایک مصنوعی نامساوات قائم کرتے ہیں۔ اس لئے اسلام انہیں مٹا کر سوسائٹی کے معاشی نظام کو ایسی فطری حالت پر لے آنا چاہتا ہے جس میں ہر شخص کے لئے کوشش کے مواقع کھلے ہوں۔ مگر جو لوگ چاہتے ہیں کہ کوشش کے ذرائع اور نتائج میں بھی سب لوگوں کو زبردستی برابر کر دیا جائے، اسلام ان سے متفق نہیں ہے، کیونکہ وہ فطری نامساوات کو مصنوعی مساوات میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ فطرت سے قریب تر نظام صرف وہی ہو سکتا ہے جس میں ہر شخص معیشت کے میدان میں

اپنی دوڑ کی ابتدا اسی مقام اور اسی حالت سے کرے جس پر خدا نے اسے پیدا کیا ہے جو موٹر لئے ہوئے آیا ہے وہ موٹر ہی پر چلے، جو صرف دو پاؤں لایا ہے، وہ پیدل ہی چلے، اور جو لنگڑا پیدا ہوا ہے وہ لنگڑا کر ہی چلنا شروع کرے۔ سوسائٹی کا قانون نہ تو ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ موٹر والے کا مستقل اجارہ موٹر پر قائم کر دے اور لنگڑے کے لئے موٹر کا حصول ناممکن بنا دے، اور نہ ایسا ہی ہونا چاہیئے کہ سب کی دوڑ زبردستی ایک ہی مقام اور ایک ہی حالت سے شروع ہو اور آگے تک انہیں لازماً ایک دوسرے کے ساتھ باندھ رکھا جائے۔ برعکس اس کے قوانین ایسے ہونے چاہئیں جن میں اس امر کا کھلا امکان موجود رہے کہ جس نے اپنی دوڑ لنگڑا کر شروع کی تھی وہ اپنی محنت و قابلیت سے موٹر پا سکتا ہو تو ضرور پائے، اور جو ابتدا میں موٹر پر چلا تھا وہ بعد میں اپنی نااہلی سے لنگڑا ہو کر رہ جائے تو رہ جائے۔

اسلام صرف اتنا ہی نہیں چاہتا کہ اجتماعی زندگی میں یہ معاشی دوڑ کھلی اور بے لاگ ہو، بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس میدان میں دوڑنے والے ایک دوسرے کے لئے بے رحم اور بے درد نہ ہوں، ہمدرد اور مددگار ہوں۔ وہ ایک طرف اپنی اخلاقی تعلیم سے لوگوں میں یہ ذہنیت پیدا کرتا ہے کہ اپنے درماندہ اور پسماندہ بھائیوں کو سہارا دیں دوسری طرف وہ تقاضا کرتا ہے کہ سوسائٹی میں ایک مستقل ادارہ ایسا موجود رہے جو معذور اور بے وسیلہ لوگوں کی مدد کا ضامن ہو۔ جو لوگ معاشی دوڑ میں حصہ لینے کے قابل نہ ہوں وہ اس ادارے سے اپنا حصہ پائیں۔ جو لوگ اتفاقات زمانہ سے اس دوڑ میں گر پڑے ہوں انہیں یہ ادارہ

اٹھا کر پھر چلنے کے قابل بنائے۔ اور جن لوگوں کو جدوجہد کے میدان میں اترنے کے لئے سہارے کی ضرورت ہو انہیں اس ادارے سے سہارا ملے۔ اس مقصد کے لئے اسلام نے از روئے قانون یہ طے کیا ہے کہ ملک کی تمام جمع شدہ دولت پر ڈھائی فیصدی سالانہ اور اسی طرح پورے تجارتی سرمائے پر بھی ڈھائی فیصدی سالانہ زکوٰۃ وصول کی جائے، تمام عشری زمینوں کی زرعی پیداوار کا دس فیصدی یا پانچ فیصدی حصہ لیا جائے، بعض معدنیات کی پیداوار کا بیس فیصدی حصہ لیا جائے، مویشیوں کی ایک خاص تعداد پر بھی ایک خاص تناسب سے سالانہ زکوٰۃ لگائی جائے۔ اور یہ تمام سرمایہ غریبوں، یتیموں، اور محتاجوں کی مدد کے لئے استعمال کیا جائے۔ یہ ایک ایسا اجتماعی انشورنس ہے جس کی موجودگی میں اسلامی سوسائٹی کے اندر کوئی شخص زندگی کی ناگزیر ضروریات سے کبھی محروم نہیں رہ سکتا۔ کوئی محنت کش آدمی کبھی اتنا مجبور نہیں ہو سکتا کہ فاقے کے ڈر سے خدمت کی وہی شرائط منظور کرلے جو کارخانہ دار یا زمیندار پیش کر رہا ہو۔ کسی شخص کی طاقت اس کم سے کم معیار سے کبھی نیچے نہیں گر سکتی جو معاشی جدوجہد میں حصہ لینے کے لئے ضروری ہے۔

فرد اور جماعت کے درمیان اسلام ایسا توازن قائم کرنا چاہتا ہے جس میں فرد کی شخصیت اور اس کی آزادی بھی برقرار رہے اور اجتماعی مفاد کے لئے اس کی آزادی نقصان دہ بھی نہ ہو، بلکہ لازمی طور پر مفید ہو۔ اسلام کسی ایسی سیاسی یا معاشی تنظیم کو پسند نہیں کرتا جو فرد کو جماعت میں گم کردے اور اس کے لئے وہ آزادی باقی نہ چھوڑے جو اس کی شخصیت کے صحیح نشوونما کے لئے ضروری ہے۔

کسی ملک کے تمام ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنا دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ملک کے تمام افراد جماعتی شکنجہ میں جکڑ جائیں۔ اس حالت میں ان کی انفرادیت کا بقاوارتقا سخت مشکل بلکہ غیر ممکن ہے۔ انفرادیت کے لئے جس طرح سیاسی اور معاشرتی آزادی ضروری ہے اسی طرح معاشی آزادی بھی بہت بڑی حد تک ضروری ہے۔ اگر ہم آدمیت کا بالکل استیصال نہیں کر دینا چاہتے تو ہماری اجتماعی زندگی میں اتنی گنجائش ضرور رہنی چاہیئے کہ ایک بندۂ خدا اپنی روزی آزادانہ پیدا کرکے اپنے ضمیر کا استقلال برقرار رکھ سکے اور اپنی ذہنی و اخلاقی قوتوں کو اپنے رجحانات کے مطابق نشوونما دے سکے۔ راتب بندی کا رزق جس کی کنجیاں دوسروں کے ہاتھ میں ہوں، اگر فراواں بھی ہو تو خوشگوار نہیں کیونکہ اس سے جو کوتاہی آتی ہے محض شکم کی فربہی اس کی تلافی کبھی نہیں کر سکتی۔

جس طرح اسلام ایسے نظام کو ناپسند کرتا ہے اسی طرح وہ ایسے اجتماعی نظام کو بھی پسند نہیں کرتا جو افراد کو معاشرت اور معیشت میں بے لگام آزادی دیتا ہے اور انہیں کھلی چھٹی دے دیتا ہے کہ اپنی خواہشات یا اپنے مفاد کی خاطر جماعت کو جس طرح چاہیں نقصان پہنچائیں۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اسلام نے جو متوسط راہ اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ پہلے فرد کو جماعت کی خاطر چند حدود اور ذمہ داریوں کا پابند بنایا جائے، پھر اسے اپنے معاملات میں آزاد چھوڑ دیا جائے۔ ان حدود اور ذمہ داریوں کی ساری تفصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ میں ان کا صرف ایک مختصر سا نقشہ آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔

پہلے کسب معاش کو لیجیے۔ دولت کمانے کے ذرائع میں اسلام نے جتنی باریک

بینی کے ساتھ جائز و ناجائز کی تفریق کی ہے اتنی دنیا کے کسی قانون نے نہیں کی۔ وہ چن چن کر ان تمام ذرائع کو حرام قرار دیتا ہے جن سے ایک شخص دوسرے اشخاص کو یا بحیثیت مجموعی پوری سوسائٹی کو اخلاقی یا مادی نقصان پہونچا کر اپنی روزی حاصل کرتا ہے۔ شراب اور نشہ آور چیزوں کا بنانا اور بیچنا، فحش کاری اور رقص و سرود کا پیشہ، جوا، سٹہ، لاٹری، سود، قیاس اور دھوکے اور جھگڑے کے سودے، ایسے تجارتی طریقے جن میں ایک فریق کا فائدہ یقینی اور دوسرے کا مشتبہ ہو، ضرورت کی چیزوں کو روک کر ان کی قیمتیں چڑھانا، اور اسی طرح کے بہت سے وہ کاروبار جو اجتماعی طور پر ضرر رساں ہیں اسلامی قانون میں قطعی طور پر حرام کر دیئے گئے ہیں۔ اس معاملے میں اگر آپ اسلام کے معاشی قانون کا جائزہ لیں تو حرام طریقوں کی ایک طویل فہرست آپ کے سامنے آئے گی اور ان میں بہت سے وہ طریقے آپ کو ملیں گے جنہیں استعمال کر کے ہی موجودہ سرمایہ داری نظام میں لوگ کروڑپتی بنتے ہیں۔ اسلام ان سب طریقوں کو ازروئے قانون بند کرتا ہے اور آدمی کو صرف ان طریقوں سے دولت کمانے کی آزادی دیتا ہے جن سے وہ دوسروں کی کوئی حقیقی اور مفید خدمت انجام دے کر انصاف کے ساتھ اس کا معاوضہ حاصل کرے۔

حلال ذرائع سے کمائی ہوئی دولت پر اسلام آدمی کے حقوق ملکیت تسلیم کرتا ہے مگر یہ حقوق بھی غیر محدود نہیں ہیں۔ وہ آدمی کو پابند کرتا ہے کہ اپنی حلال کمائی کو خرچ بھی جائز ذرائع سے جائز راستوں ہی میں کرے۔ خرچ پر اس نے ایسی قیود لگا دی ہیں جن سے آدمی ایک ستھری اور پاکیزہ زندگی تو بسر کر سکتا ہے مگر

عیاشیوں میں دولت اڑا نہیں سکتا، نہ شان و شوکت کے اظہار میں اس قدر حد سے گزر سکتا ہے کہ دوسروں پر اس کی خدائی کا سکہ جمنے لگے۔ بیجا خرچ کی بعض صورتوں کو تو اسلامی قانون میں صراحتاً ممنوع ٹھہرایا گیا ہے۔ اور بعض دوسری صورتوں کی اگرچہ صراحت نہیں ہے لیکن اسلامی حکومت کو یہ اختیارات حاصل ہیں کہ اپنی دولت میں نارو اتصرف کرنے سے لوگوں کو حکماً روک دے۔

جائز اور معقول اخراجات سے جو دولت آدمی کے پاس بچے اسے وہ جمع بھی کر سکتا ہے اور مزید دولت پیدا کرنے میں بھی لگا سکتا ہے۔ مگر ان دونوں حقوق پر پابندیاں ہیں۔ جمع کرنے کی صورت میں اسے نصاب سے زائد دولت پر ڈھائی فیصدی سالانہ زکوٰۃ دینی ہوگی۔ کاروبار میں لگانا چاہے تو صرف جائز کاروبار ہی میں لگا سکتا ہے۔ جائز کاروبار خواہ آدمی خود کرے یا کسی دوسرے کو اپنا سرمایہ روپے، زمین یا آلات و اسباب کی صورت میں دے کر نفع و نقصان کا شریک ہو جائے، یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔ ان حدود کے اندر کام کر کے اگر کوئی شخص کروڑپتی بھی بن جائے تو اسلام کی نگاہ میں یہ کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ہے، بلکہ خدا کا انعام ہے۔ لیکن جماعتی مفاد کے لئے وہ اس پر دو شرطیں عائد کرتا ہے ایک یہ کہ وہ اپنے تجارتی مال پر زکوٰۃ اور زرعی پیداوار پر عُشر ادا کرے۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنی تجارت یا صنعت یا زراعت میں جن لوگوں کے ساتھ شرکت یا اُجرت کا معاملہ کرے ان سے انصاف کرے۔ یہ انصاف اگر وہ خود نہ کریگا تو اسلامی حکومت اسے انصاف پر مجبور کر دیگی۔

پھر جو دولت ان جائز حدود کے اندر فراہم ہو اس کو بھی اسلام زیادہ دیر

تک سمٹا نہیں رہنے دیتا بلکہ اپنے قانون وراثت کے ذریعے سے ہر پُشت کے بعد دوسری پُشت میں اسے پھیلا دیتا ہے۔ اس معاملے میں اسلامی قانون کا رجحان دنیا کے تمام دوسرے قوانین کے رجحانات سے مختلف ہے۔ دوسرے قوانین کوشش کرتے ہیں کہ جو دولت ایک دفعہ سمٹ چکی ہے وہ پشت در پشت سمٹی ہی رہے۔ برعکس اس کے اسلام ایسا قانون بناتا ہے کہ جو دولت ایک شخص نے اپنی زندگی میں فراہم کی ہے وہ اس کے مرتے ہی اس کے قریبی عزیزوں میں بانٹ دی جائے۔ قریبی عزیز نہ ہوں تو دور کے رشتہ دار حصہ رسدی اس کے وارث ہوں اور اگر کوئی دور کا رشتہ دار بھی نہ ہو تو پھر پوری مسلم سوسائٹی اُس کی حقدار ہے۔ یہ قانون کسی بڑی سرمایہ داری و زمینداری کو مستقل اور دائم نہیں رہنے دیتا۔ پچھلی ساری پابندیوں کے باوجود اگر دولت کے سمٹاؤ سے کوئی خرابی پیدا ہو بھی جائے تو یہ آخری ضرب اس کا ازالہ کر دیتی ہے۔

(بہ اجازت ریڈیو پاکستان)

اسلام کا روحانی نظام

یہ تقریر ۱۶؍مارچ ۱۹۴۸ء کو ریڈیو پاکستان
سے نشر کی گئی

اسلام کا روحانی نظام کیا ہے، اور زندگی کے پورے نظام سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اس سوال کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہم اُس فرق کو اچھی طرح سمجھ لیں جو روحانیت کے اسلامی تصور اور دوسرے مذہبی اور فلسفیانہ نظاموں کے تصورات میں پایا جاتا ہے۔ یہ فرق ذہن نشین نہ ہونے کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اسلام کے روحانی نظام پر گفتگو کرتے ہوئے آدمی کے دماغ میں بلا ارادہ بہت سے وہ تصورات گھومنے لگتے ہیں جو عموماً "روحانیت" کے لفظ سے وابستہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ پھر اس الجھن میں پڑ کر آدمی کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ آخر یہ کس قسم کا روحانی نظام ہے جو روح کے جانے پہچانے دائرے سے گزر کر مادہ و جسم کے دائرے میں دخل دیتا ہے اور صرف دخل ہی نہیں دیتا بلکہ اس پر حکمرانی کرنا چاہتا ہے۔

فلسفہ و مذہب کی دنیا میں عام طور پر جو تخیل کار فرما رہا ہے وہ یہ ہے کہ روح اور جسم ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دونوں کا عالم جدا ہے۔ دونوں کے تقاضے الگ بلکہ باہم مخالف ہیں۔ ان دونوں کی ترقی ایک ساتھ ممکن نہیں ہے۔ روح کے لئے جسم اور مادے کی دنیا ایک قید خانہ ہے۔ دنیوی زندگی کے تعلقات اور دلچسپیاں وہ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں ہیں جن میں روح جکڑی جاتی ہے۔ دنیا کے کاروبار اور معاملات وہ دلدل ہیں جس میں پھنس کر روح کی پرواز ختم ہو جاتی ہے۔ اس تخیل کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ روحانیت اور دنیاداری کے راستے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہو گئے۔ جن لوگوں نے دنیاداری اختیار کی وہ اول ہی قدم پر مایوس ہو گئے کہ یہاں روحانیت ان کے ساتھ نہ چل سکے گی۔ اس چیز نے ان کو مادہ پرستی میں غرق کر دیا۔ معاشرت، تمدن، سیاست، معیشت، غرض دنیوی زندگی کے سارے شعبے روحانیت

کے نور سے خالی ہو گئے، اور بالآخر زمین ظلم سے بھر گئی۔ دوسری طرف جو لوگ روحانیت کے طلبگار ہوئے انہوں نے اپنی روح کی ترقی کیلئے ایسے راستے تلاش کئے جو دنیا کے باہر ہی باہر نکل جاتے ہیں، کیونکہ ان کے نقطہ نظر سے روحانی ترقی کا کوئی ایسا راستہ تو ممکن ہی نہ تھا جو دنیا کے اندر سے ہو کر گذرتا ہو۔ ان کے نزدیک روح کو پروان چڑھانے کے لئے جسم کو مضمحل کرنا ضروری تھا اس لئے انہوں نے ایسی ریاضتیں ایجاد کیں جو نفس کو مارنے والی اور جسم کو بے حس یا بے کار کر دینے والی ہوں۔ روحانی تربیت کے لئے جنگلوں، پہاڑوں اور عزلت کے گوشوں کو انہوں نے موزوں ترین مقامات سمجھا تاکہ تمدن کا ہنگامہ گیان دھیان کے مشغولوں میں خلل نہ ڈالنے پائے۔ روح کے نشو و نما کی کوئی صورت انہیں اس کے سوا ممکن نظر نہ آئی کہ دنیا اور اس کے دھندوں سے دستکش ہو جائیں اور ان سارے رشتوں کو کاٹ پھینکیں جو اسے مادیات کے عالم سے وابستہ رکھتے ہیں۔

پھر جسم و روح کے اس تضاد نے انسان کے لئے کمال کے بھی دو مختلف مفہوم اور نصب العین پیدا کر دیئے۔ ایک طرف دنیوی زندگی کا کمال جس کا مفہوم یہ قرار پایا کہ انسان صرف مادی نعمتوں سے مالا مال ہو، اور اس کی انتہا یہ ٹھہری کہ آدمی ایک اچھا پرندہ، ایک بہترین مگرمچھ، ایک عمدہ گھوڑا، اور ایک کامیاب بھیڑیا بن جائے۔ دوسری طرف روحانی زندگی کا کمال جس کا مفہوم یہ قرار پایا کہ انسان کچھ فوق الفطری طاقتوں کا مالک ہو جائے اور اس کی انتہا یہ ٹھہری کہ آدمی ایک اچھا ریڈیو سیٹ، ایک طاقتور دوربین اور ایک نازک خوردبین بن جائے۔ یا اس کی نگاہ اور اس کے الفاظ ایک پورے دواخانے کا کام دینے لگیں۔

اسلام کا نقطہ نظر اس معاملے میں دنیا کے تمام مذہبی اور فلسفیانہ نظاموں

سے مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسانی روح کو خدا نے زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے۔ کچھ اختیارات، کچھ فرائض اور کچھ ذمہ داریاں اس کے سپرد کی ہیں۔ اور انہیں ادا کرنے کے لئے ایک بہترین اور موزوں ترین ساخت کا جسم اسے عطا کیا ہے۔ یہ جسم اس کو عطا ہی اس لئے کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اختیارات کے استعمال اور اپنی متعلقہ خدمات کی انجام دہی میں اس سے کام لے۔ لہٰذا یہ جسم اس روح کا قید خانہ نہیں بلکہ اس کا کارخانہ ہے۔ اور اس روح کے لئے کوئی ترقی اگر ممکن ہے تو اسی طرح ممکن ہے کہ وہ اس کارخانے کے آلات اور طاقتوں کو استعمال کر کے اپنی قابلیتوں کا اظہار کرے۔ پھر یہ دنیا کوئی دار العذاب نہیں ہے جس میں انسانی روح کسی طرح آ کر پھنس گئی ہو، بلکہ یہ تو وہ کارگاہ ہے جس میں کام کرنے کے لئے خدا نے اسے بھیجا ہے۔ یہاں کی بے شمار چیزیں اس کے تصرف میں دی گئی ہیں۔ یہاں دوسرے بہت سے انسان اسی خلافت کے فرائض انجام دینے کے لئے اس کے ساتھ پیدا کئے گئے ہیں۔ یہاں فطرت کے تقاضوں سے تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست اور دوسرے شعبہ ہائے زندگی اس کے لئے وجود میں آئے ہیں۔ یہاں اگر کوئی روحانی ترقی ممکن ہے تو اس کی صورت یہ نہیں ہے کہ آدمی اس کارگاہ سے منہ موڑ کر کسی گوشے میں جا بیٹھے، بلکہ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ اس کے اندر کام کر کے اپنی قابلیت کا ثبوت دے۔ یہ اس کے لئے ایک امتحان گاہ ہے۔ زندگی کا ہر پہلو اور ہر شعبہ گویا امتحان کا ایک پرچہ ہے۔ گھر، محلہ، بازار، منڈی، دفتر، کارخانہ، مدرسہ، کچہری، تھانہ، چھاؤنی، پارلیمنٹ، صلح کانفرنس اور میدان جنگ، سب مختلف مضمونوں کے پرچے ہیں جو اسے کرنے کے لئے دیئے گئے ہیں۔ وہ اگر ان میں سے کوئی پرچہ بھی نہ کرے یا اکثر پرچوں کو سادہ ہی چھوڑ دے تو نتیجے میں آخر صفر کے

سوا اور کیا پا سکتا ہے۔ کامیابی اور ترقی کا امکان اگر ہو سکتا ہے تو اسی طرح ہو سکتا ہے کہ وہ اپنا سارا وقت اور اپنی ساری توجہ امتحان دینے میں صرف کرے اور جتنے پرچے بھی اسے دیئے جائیں ان سب پر کچھ نہ کچھ کر کے دکھائے۔

اس طرح اسلام زندگی کے راہبانہ تصور کو رد کر دیتا ہے اور انسان کے لئے روحانی ترقی کا راستہ دنیا کے باہر سے نہیں بلکہ اس کے اندر سے نکالتا ہے روح کے نشو ونما اور بالیدگی اور فلاح وکامرانی کی اصل جگہ اس کے نزدیک کارگاہ حیات کے عین منجدھار میں واقع ہے نہ کہ اس کے کنارے پر۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیئے کہ وہ ہمارے سامنے روح کی ترقی اور تنزل کا معیار کیا پیش کرتا ہے۔ اس سوال کا جواب اسی خلافت کے تصور میں موجود ہے جس کا ابھی میں ذکر کر چکا ہوں۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انسان اپنے پورے کارنامہ حیات کے لئے خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔ اس کا فرض یہ ہے کہ زمین میں جو اختیارات اور ذرائع اسے دیئے گئے ہیں انہیں خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کرے۔ جو قابلیتیں اور طاقتیں اسے بخشی گئی ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ خدا کی رضا حاصل کرنے میں صرف کرے۔ جن مختلف قسم کے تعلقات میں دوسرے انسانوں کے ساتھ اسے وابستہ کیا گیا ہے ان میں ایسا رویہ اختیار کرے جو خدا کو پسند ہے اور فی الجملہ اپنی تمام کوششیں اور محنتیں اس راہ میں صرف کر دے کہ زمین اور اس کی زندگی کا انتظام اتنا بہتر ہو جتنا اس کا خدا بہتر دیکھنا چاہتا ہے اس خدمت کو انسان جسقدر زیادہ احساس ذمہ داری، فرض شناسی، اطاعت و فرمانبرداری اور مالک کی رضا جوئی کے ساتھ انجام دیگا اسی قدر زیادہ وہ خدا سے قریب ہوگا، اور خدا کا قرب ہی اسلام کی نگاہ میں روحانی ترقی ہے۔ اس کے برعکس وہ

جتنا سست، کام چور، اور نافرض شناس ہوگا، یا جس قدر سرکش، باغی، اور نافرمان ہوگا اتنا ہی وہ خدا سے دور رہیگا، اور خدا سے دوری ہی کا نام اسلام کی زبان میں روحانی تنزل ہے۔

اس تشریح سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے دین دار اور دنیادار دونوں کا دائرۂ عمل ایک ہی ہے ایک ہی کارگاہ ہے جس میں دونوں کام کرینگے بلکہ دیندار آدمی دنیادار سے بھی زیادہ انہماک کے ساتھ مشغول ہوگا۔ گھر کی چار دیواری سے لیکر بین الاقوامی کانفرنس کے چوراہے تک جتنے بھی زندگی کے معاملات ہیں ان سب کی ذمہ داریاں دیندار بھی دنیادار کے برابر بلکہ اس سے کچھ بڑھکر ہی اپنے ہاتھ میں لیگا۔ البتہ جو چیز ان دونوں کے راستے ایک دوسرے سے الگ کردیگی وہ خدا کے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت ہے۔ دیندار جو کچھ کریگا اس احساس کے ساتھ کریگا کہ وہ خدا کے سامنے ذمہ دار ہے، اس غرض سے کریگا کہ اسے خدا کی خوشنودی حاصل ہو، اور اس قانون کے مطابق کریگا جو خدا نے اس کے لئے مقرر کردیا ہے۔ اس کے برعکس دنیادار جو کچھ کرے گا غیر ذمہ دارانہ کرے گا، خدا سے بے نیاز ہو کر کریگا، اور اپنے من مانے طریقوں سے کرے گا۔ یہی فرق دیندار کی پوری مادی زندگی کو سراسر روحانی زندگی بنا دیتا ہے اور دنیادار کی ساری زندگی کو روحانیت کے نور سے محروم کردیتا ہے۔

اب میں مختصر طور پر آپ کو بتاؤں گا کہ اسلام دنیوی زندگی کے اس منجدھار میں انسان کے روحانی ارتقا کا راستہ کس طرح بناتا ہے۔

اس راستے کا پہلا قدم ایمان ہے، یعنی آدمی کے دل و دماغ میں اس خیال کا بس جانا کہ خدا ہی اس کا مالک، حاکم اور معبود ہے، خدا ہی کی رضا اس کی تمام کوششوں

کا مقصود ہے، اور خدا ہی کا حکم اس کی زندگی کا قانون ہے۔ یہ خیال جس قدر زیادہ پختہ اور راسخ ہوگا اتنی ہی زیادہ مکمل اسلامی ذہنیت بنے گی اور اسی قدر زیادہ ثابت قدمی کے ساتھ انسان روحانی ترقی کی راہ پر چل سکے گا۔

اس راہ کی دوسری منزل اطاعت ہے، یعنی آدمی کا بالفعل اپنی خود مختاری سے دست بردار ہو جانا اور عملاً اس خدا کی بندگی اختیار کر لینا جسے وہ عقیدۃً اپنا خدا تسلیم کر چکا ہے۔ اسی اطاعت کا نام قرآن کی اصطلاح میں اسلام ہے۔

تیسری منزل تقویٰ کی ہے جسے ہم عام فہم زبان میں فرض شناسی اور احساس ذمہ داری سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے ہر پہلو میں یہ سمجھتے ہوئے کام کرے کہ اسے اپنے افکار، اقوال اور افعال کا خدا کو حساب دینا ہے، ہر اس کام سے رک جائے جس سے خدا نے منع کیا ہے، ہر اس خدمت پر کمربستہ ہو جائے جس کا خدا نے حکم دیا ہے، اور پوری ہوشمندی کے ساتھ حلال و حرام، صحیح و غلط، اور خیر و شر کے درمیان تمیز کرتا ہوا چلے۔

آخری اور سب سے اونچی منزل احسان کی ہے۔ احسان کے معنی یہ ہیں کہ بندے کی مرضی خدا کی مرضی کے ساتھ متحد ہو جائے۔ جو کچھ خدا کی پسند ہے بندے کی اپنی پسند بھی وہی ہو، اور جو کچھ خدا کو ناپسند ہے بندے کا اپنا دل بھی اسے ناپسند کرے۔ خدا جن برائیوں کو اپنی زمین میں دیکھنا نہیں چاہتا بندہ صرف خود ہی ان سے نہ بچے بلکہ انہیں دنیا سے مٹا دینے کے لئے اپنی ساری قوتیں اور اپنے تمام ذرائع صرف کر دے۔ اور خدا جن بھلائیوں سے اپنی زمین کو آراستہ دیکھنا چاہتا ہے، بندہ صرف اپنی ہی زندگی کو ان سے مزین کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ اپنی جان لڑا کر

دنیا بھر میں انہیں پھیلانے اور قائم کرنے کی کوشش کرے۔ اس مقام پر پہنچ کر بندے کو اپنے خدا کا انتہائی قرب نصیب ہوتا ہے اور اسی لئے یہ انسان کے روحانی ارتقا کی بلند ترین منزل ہے۔

روحانی ترقی کا یہ راستہ صرف افراد ہی کے لئے نہیں ہے بلکہ جماعتوں اور قوموں کے لئے بھی ہے۔ ایک فرد کی طرح ایک قوم بھی ایمان، اطاعت، اور تقویٰ کی منزلوں سے گزر کر احسان کی انتہائی منزل تک پہنچ سکتی ہے۔ اور ایک ریاست بھی اپنے پورے نظام کے ساتھ مومن، مسلم، متقی اور محسن بن سکتی ہے۔ بلکہ درحقیقت اسلام کا منشا مکمل طور پر تو پورا ہی اُس وقت ہوتا ہے جبکہ ایک پوری قوم کی قوم اس راہ پر گامزن ہو اور دنیا میں ایک متقی اور محسن ریاست قائم ہو جائے۔

اب روحانی تربیت کے اس نظام پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجیے جو افراد اور سوسائٹی کو اس طرز پر تیار کرنے کے لئے اسلام نے تجویز کیا ہے۔ اس نظام کے چار ارکان ہیں:۔

پہلا رکن نماز ہے۔ یہ روزانہ پانچ وقت آدمی کے ذہن میں خدا کی یاد تازہ کرتی ہے، اُس کا خوف دلاتی ہے، اس کی محبت پیدا کرتی ہے، اس کے احکام بار بار سامنے لاتی ہے، اور اس کی اطاعت کی مشق کراتی ہے۔ یہ نماز محض انفرادی نہیں ہے بلکہ اسے جماعت کے ساتھ فرض کیا گیا ہے تاکہ پوری سوسائٹی مجموعی طور پر روحانی ترقی کی اس راہ پر سفر کرنے کے لئے تیار ہو۔

دوسرا رکن روزہ ہے جو ہر سال پورے ایک مہینے تک مسلمان افراد کو فرداً فرداً اور مسلم سوسائٹی کو بحیثیت مجموعی تقویٰ کی تربیت دیتا رہتا ہے۔

تیسرا رکن زکوٰۃ ہے جو مسلمان افراد میں مالی ایثار، آپس کی ہمدردی اور تعاون کا

جذبہ پیدا کرتا ہے۔ آج کل کے لوگ غلطی سے زکوٰۃ کو "ٹیکس" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ زکوٰۃ کی روح ٹیکس کی اسپرٹ سے بالکل مختلف ہے۔ زکوٰۃ کے اصل معنی نشو و نما اور پاکیزگی کے ہیں۔ اس لفظ سے اسلام یہ حقیقت آدمی کے ذہن نشین کرتا ہے کہ خدا کی محبت میں اپنے بھائیوں کی جو مالی امداد تم کرو گے اس سے تمہاری روح کو بالیدگی اور تمہارے اخلاق کو پاکیزگی نصیب ہو گی۔

چوتھا رکن حج ہے۔ یہ خدا پرستی کے محور پر اہل ایمان کی ایک عالمگیر برادری بناتا ہے اور ایک ایسی بین الاقوامی تحریک چلاتا ہے جو دنیا میں صدیوں سے دعوت حق پر لبیک کہہ رہی ہے اور ان شاء اللہ ابد تک کہتی رہے گی۔

(باجازت ریڈیو پاکستان لاہور)

پردہ اور حقوق الزوجین

چھپ کر آگیا ہے

اسلامی مقالات کا سلسلہ

مطبوعہ دین پریس، لاہور

جماعت اسلامی کی دعوت

از

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

شائع کردہ

مکتبہ جماعت اسلامی، اچھرہ، لاہور

قیمت ۶ آنہ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی طابع و ناشر نے

دی انوار اسلام پریس لاہور میں چھپوا کر

مکتبہ جماعت اسلامی، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

طبع اوّل　　دسمبر ۱۹۴۸ء　　۴۰۰۰

جماعت اسلامی کی دعوت

[۹--۱۰ مئی ۱۹۴۷ء کو دارالاسلام (پٹھانکوٹ) میں جماعت کا جو اجتماع منعقد ہوا تھا، افسوس ہے کہ اس کی روداد مشرقی پنجاب کے فسادِ عظیم کی نذر ہوگئی، بلکہ اس کے مسودات کا بھی بڑا حصہ دینا نگر میں ہمارے کاتب کی خانہ بربادی کے ساتھ تلف ہوگیا۔ اب خوش قسمتی سے کاغذات میں میری دو تقریروں کے مسودے مل گئے ہیں جنھیں اجتماع کے بعد قلمبند کیا گیا تھا۔ پہلی تقریر افتتاحی تقریر تھی۔ اس میں جماعت اسلامی کے مقصد کی تشریح کی گئی تھی۔ دوسری تقریر جلسۂ عام میں کی گئی تھی اور اس میں "بناؤ اور بگاڑ" کے متعلق سنت اللہ کو بہ تفصیل بیان کیا گیا تھا۔ اگرچہ یہ دونوں تقریریں ڈیڑھ سال پرانی ہوچکی ہیں، مگر ان کا مضمون پرانا نہیں ہوا ہے۔ توقع ہے کہ ان کا مطالعہ ناظرین کے لئے فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔]

رفقاء اور حاضرین! سب سے پہلے میں آپ حضرات کو خدا سے ڈرنے اور اس کی ناراضی سے بچنے اور اسی کی خوشنودی چاہنے کی تلقین کرتا ہوں۔ ہماری اس دعوت کا سارا انحصار ہی تعلق باللہ اور توجہ الی اللہ پر ہے۔ کوئی شخص خدا کا کلمہ بلند کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں کرسکتا، بلکہ سچ یہ ہے کہ خود راہِ راست

پر قائم بھی نہیں رہ سکتا، اگر خدا کا خوف اس کے دل میں نہ ہو اور تقویٰ کی گرفت اس کی خواہشات پر مضبوط نہ ہو اور اس کی تمام جدوجہد اور دوڑ دھوپ میں رضائے الٰہی کی طلب کار فرما نہ ہو۔ دنیا میں آدمی کی راست روی کی ضامن صرف ایک ہی چیز ہے، اور وہ ہے خدا کا خیال۔ یہ خیال اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی دل سے نکل جائے، اگر ذرا سی غفلت بھی طاری ہو جائے، تو انسان کا قدم سیدھی راہ سے ہٹنے لگتا ہے۔ پھر جسے محض راہ راست پر چلنا ہی نہ ہو بلکہ دنیا کو اس پر چلانا اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو اس کی طرف کھینچ کر لانا بھی ہو، اس کے لئے تو ناگزیر ہے کہ خدا سے اس کا تعلق ہر وقت مضبوط اور خدا کی طرف اس کی توجہ ہر آن مرکوز رہے، ورنہ اس سے غافل ہو کر وہ اپنے آپ کو مصلح سمجھتے ہوئے نہ معلوم کس کس قسم کے فسادوں کا مرتکب ہو جائیگا۔ لہٰذا میری پہلی نصیحت آپ کو اور ان سب لوگوں کو جو اس تحریک میں حصہ لینا چاہیں، یہ ہے کہ اپنے ذہن میں اللہ کی ذات وصفات کا تصور ہر وقت تازہ رکھیں اور اپنے تمام کاموں میں اسی کی خوشنودی پر نظر جمائے رہیں۔ جن تحریکوں کے پیش نظر صرف دنیا اور اس کے معاملات ہی ہیں وہ تو چل سکتی ہیں بغیر اس کے کہ خدا کا خیال کبھی دل میں آئے، مگر یہ تحریک ایک قدم بھی ٹھیک نہیں چل سکتی جب تک کہ اس کے خادم پورے شعور کے ساتھ خدا سے خشیت اور تقویٰ اور رضا طلبی کا تعلق نہ جوڑے رکھیں۔

دوسری چیز جس کی میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں، یہ ہے کہ آپ صرف

اس اجتماع میں بلکہ اپنے تمام اجتماعی کاموں میں نظم وضبط اور سکون و وقار
اور اسلام کے دوسرے اجتماعی آداب کی پوری پوری پابندی ملحوظ رکھیں۔
بلاشبہ اس معاملہ میں آپ نے پچھلے چند برسوں کے اندر نمایاں ترقی کی ہے
جس پر میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں اور آپ کو مبارک باد دیتا ہوں، یہ محض خدا
کا فضل اور اس کے دین کی برکت ہے کہ آپ اتنی قلیل مدت میں اپنے اجتماعی
برتاؤ کو اس قدر منظم، مہذب اور باوقار بنانے میں کامیاب ہو گئے جو
اب بھی اپنی ابتدائی حالت میں ہی اس ملک کی تمام دوسری جماعتوں پر
بین امتیاز رکھتا ہے۔ لیکن آپ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ یہ آخری
حد ہے جس پر آپ پہنچ چکے ہیں۔ ابھی آپ کو اپنی بہت سی خامیوں کی تلافی
کرنی ہے۔ بہت سی اجتماعی خوبیوں کو اپنے اندر پرورش کرنا ہے، اور ابھی
بہت فاصلہ پر ہے۔ وہ حد کمال جس پہ آپ کو پہنچنا ہے۔ آپ اپنے مقصد
کے لئے دنیا کی جن زبردست طاقتوں کے مقابلہ میں جدوجہد کرنے اٹھے ہیں وہ
آج نظم وضبط کی انتہائی حد پر پہنچی ہوئی ہیں اور ان کے مقابلہ میں آپ کا نظم
ابھی کسی شمار میں آنے کے قابل نہیں ہے۔ اگر آپ کے پیش نظر محض کسی ایک
چھوٹے یا بڑے علاقہ میں صرف انتظام کرنے والے ہاتھوں کا بدلنا نہیں ہے
بلکہ سرے سے اس نظام کو بدل دینا ہے جس پر نوع انسانی کی زندگی کا انتظام
اس وقت چل رہا ہے؛ تو آپ کو سمجھنا چاہئیے کہ اس غرض کے لئے آپ کو آخری
فیصلہ کُن مقابلہ ہندوستان کے مقتدیوں سے نہیں بلکہ مغرب کے اماموں
سے پیش آئیگا۔ اور ان کا حال یہ ہے کہ انہوں نے اپنی پوری پوری قوموں کو

باقاعدہ سوچنے، باقاعدہ کام کرنے اور منظم اجتماعی سعی کرنے کی ایسی مکمل تربیت دی ہے جس کے ثمرات پچھلی جنگ میں ساری دنیا دیکھ چکی ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ جنگ کیسی تھی اور کتنے ناپاک مقاصد کے لئے تھی۔ غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ دنیا کے ان مفسد اماموں نے تنظیم اور انضباط اور مرتب اجتماعی عمل کا جو کمال دکھایا ہے کیا اس کے مقابلہ میں کوئی مصلح امامت کبھی قائم ہو سکتی ہے جب تک کہ وہ ان صفات میں ان سے بازی نہ لے جائے؟ پہلے بھی امامت دنیا میں انقلاب اسی وقت آیا تھا جب صحابہ کرام نے محض اپنے عقیدے و مقصد کی پاکیزگی اور اپنے اخلاق کی فضیلت ہی سے نہیں بلکہ اپنی تنظیم سے بھی دنیا کے آئمہ شر کو شکست دے دی تھی۔ اور اب بھی یہ انقلاب اس کے بغیر رونما نہیں ہو سکتا کہ جو لوگ اس کے خواہشمند ہیں وہ اپنے آپ کو افکار، اخلاق اور انتظامی صلاحیت میں دنیا کے موجودہ منتظمین سے فائق تر ثابت کر دیں۔

تیسری بات جس کی طرف میں اس موقع پر آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، یہ ہے کہ آپ اجتماع کے ان دنوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں اور دوسری قسم کی دلچسپیوں میں وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے دیں۔ یہ دو تین دن جو سال میں ایک مرتبہ آپ کو ملتے ہیں، اُن کو غنیمت سمجھئے اور ان کے ایک ایک لمحے کو اپنے نصب العین کی خدمت کے لئے استعمال کیجئے۔ دوسری باتوں کے لئے دوسرے اوقات بہت ہیں۔ اگرچہ ایک وہ شخص جو اس مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنا چکا ہو، دوسرے اوقات میں بھی اپنے ذہن

کو دوسری فکروں میں الجھانا اور اپنی قوت کو دوسری غیر متعلق باتوں میں صرف کرنا
پسند نہ کریگا، لیکن خصوصیت کے ساتھ اجتماع کے ایام میں تو کسی شخص کا دوسری
باتوں اور دلچسپیوں میں مشغول ہونا اس بات کی کھلی علامت ہے کہ اُسے اپنے
اس نصب العین کے ساتھ کوئی دلی لگاؤ نہیں ہے۔ اس وقت آپ کی پوری
جماعتی طاقت ایک جگہ مجتمع ہے۔ تمام مختلف مقامات کے رفقاء یہاں اکٹھے
ہو گئے ہیں۔ بہت سے کارکن ہمدرد، عام متاثرین اور جویائے حال اصحاب
بھی تشریف لائے ہوئے ہیں۔ اس قیمتی موقع سے پورا فائدہ اٹھایئے۔ دور
و نزدیک کے رفقاء سے تعارف پیدا کیجئے۔ باہم سر جوڑ کر مشورہ کیجئے۔ آپس
میں تعاون کی تدبیریں سوچئے۔ ہمدردوں کے جذبۂ اخلاص و عمل کو اُبھاریئے
اور نئے لوگوں کو اپنی دعوت سمجھایئے اور اپنی تمام فکر کو اس سوال پر مرکوز کر دیجئے
کہ ہم اپنے مقصد تک پہنچنے کے لئے کیا کیا تدبیریں کس کس طرح کر سکتے ہیں۔ آپ
کو چاہیئے کہ اجتماعات کیلئے جب آپ نکلیں اُس وقت سے لیکر اپنے گھروں
کو واپس ہونے تک اپنے آپ کو راہِ خدا میں سمجھیں۔ اور اس دوران میں آپ
کی ساری فکر، تمام توجہ اور پوری مصروفیت اس دعوتِ حق اور اس کے
متعلق امور کے لئے وقف ہو۔

اب میں چند الفاظ ان حضرات سے بھی کہنا چاہتا ہوں جو یہ معلوم
کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں کہ یہ اجتماع کیسا ہے اور اس کا مقصد کیا
ہے۔ ان میں سے بعض تو ہم سے کچھ نہ کچھ پہلے بھی واقف ہونگے مگر بعض
ایسے بھی ضرور ہوں گے جو آج پہلی مرتبہ ہم سے روشناس ہو رہے ہیں۔

ایسے اصحاب ہماری پوری بات تو ہمارے لٹریچر کے مطالعہ سے ہی سمجھ سکتے ہیں، مگر میں کوشش کروںگا کہ مختصر الفاظ میں اس جماعت کی دعوت کا خلاصہ صاف اور واضح طور پر ان کے سامنے پیش کردوں تاکہ یہ تعارف اُن کے تفصیلی مطالعہ کے لئے مددگار ہوسکے۔

ہماری یہ جماعت جس غرض کیلئے اٹھی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں، اور آغاز کار کے طور پر اس ملک میں، ایک ایسی سوسائٹی منظم کی جائے جو اسلام کے اصلی اصولوں پر شعور و اخلاص کے ساتھ خود عامل ہو، دنیا کے سامنے اپنے قول و عمل سے اس کی صحیح نمائندگی کرے، اور بالآخر جہاں جہاں بھی اس کی طاقت جڑ پکڑ جائے وہاں کے افکار، اخلاق، تمدن، معاشرت، سیاست اور معیشت کے نظام کو موجودہ دہریت و مادہ پرستی کی بنیادوں سے اکھاڑ کر سچی خدا پرستی، یعنی توحید کی بنیاد پر قائم کردے۔ اس جماعت کو یہ یقین ہے کہ موجودہ تہذیب اور اس کا پورا نظامِ زندگی جن اصولوں پر قائم ہے وہ قطعاً فاسد اصول ہیں اور اگر دنیا کا انتظام انہی اصولوں پر چلتا رہا تو بڑے ہولناک نتائج سے دوچار ہوگی ـــــــ اس کے جو نتائج اب تک نکل چکے ہیں وہ بھی کچھ کم ہولناک نہیں ہیں، مگر انھیں کوئی نسبت اس انجام کی ہولناکی سے نہیں ہے جس کی طرف یہ تہذیب دنیا کو لئے جارہی ہے ـــ اور یہ ظاہر ہے کہ ہم اس دنیا سے کہیں باہر نہیں جی رہے ہیں بلکہ اس کے اندر ہی سانس لے رہے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم ان اصولوں کو فاسد اور بدانجام سمجھتے ہوئے بھی منفعلانہ طریقے سے (Passively) اسی نظام

کے تحت زندگی بسر کئے جائیں اور تہذیب حاضر کے مغربی اماموں
اور مشرقی مقلدوں کی پیشوائی و سربراہ کاری کے آگے سپر ڈالے رہیں،
تو جس تباہی کے گڑھے میں یہ دُنیا گرے گی اسی میں اس کے ساتھ ساتھ
ہم بھی جا گریں گے اور ہم اس انجام کے مستحق ہوں گے۔ ہم پوری بصیرت
کے ساتھ یہ جانتے ہیں، اور اپنے اس علم پر یقین رکھتے ہیں کہ خدا نے
انسان کی رہنمائی کے لئے اپنے پیغمبروں سے جو ہدایت نازل کی ہے
اسی کی پیروی میں ہماری اور سب انسانوں کی فلاح مضمر ہے، اور انسانی
زندگی کا پورا نظام اسی وقت صحیح چل سکتا ہے جبکہ اُسے ان اصولوں
پر قائم کیا جائے جو انسانوں کو خالق کی دی ہوئی اس ہدایت میں ہم کو ملتے
ہیں۔ ہمارے اس علم و یقین سے یہ فرض خود بخود ہم پر عائد ہو جاتا ہے ——
اور یہی فرض خدا نے بھی اپنے مطیع فرمان بندوں پر عائد کیا ہے ——
کہ ہم اس نظام زندگی کے خلاف جنگ کریں جو فاسد اصولوں پر چل رہا
ہے اور وہ صالح نظام قائم کرنے کے لئے جدوجہد کریں جو خدائی ہدایت
کے دیئے ہوئے اصولوں پر مبنی ہو۔ یہ کوشش ہمیں صرف اسی لئے نہیں
کرنی چاہیئے کہ دنیا کی خیر خواہی ہم سے اس کا مطالبہ کرتی ہے۔ نہیں ہم
خود اپنے بھی سخت بدخواہ ہوں گے اگر اسی سعی و جہد میں اپنی جان نہ کھپائیں
کیونکہ جب اجتماعی زندگی کا سارا نظام فاسد اصولوں پر چل رہا ہو، جب
باطل نظریات و افکار ساری دنیا پر چھائے ہوئے ہوں، جب خیالات کو
ڈھالنے اور اخلاق و سیرت کو بنانے کی عالمگیر طاقتوں پر فاسد نظام تعلیم

گمراہ کن ادبیات، فتنہ انگیز صحافت اور شیطنت سے لبریز ریڈیو اور سنیما کا تسلط ہو، جب رزق کے تمام وسائل پر ایک ایسے معاشی نظام کا قبضہ ہو جو حرام و حلال کی قیود سے نا آشنا ہے، جب تمدن کی صورت گری کرنے اور اس کو ایک خاص راہ پر چلنے کی ساری طاقت ایسے قوانین اور ایسی قانون ساز مشینری کے ہاتھ میں ہو جو اخلاق و تمدن کے سراسر مادہ پرستانہ تصورات پر مبنی ہیں، اور جب قوموں کی امامت اور انتظام دنیا کی پوری زمام کار ان لیڈروں اور حکمرانوں کے ہاتھ میں ہو جو خدا کے خوف سے خالی اور اس کی رضا سے بے نیاز ہیں اور اپنے کسی معاملہ میں بھی یہ دریافت کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے کہ ان کے خالق کی ہدایت اس معاملہ میں کیا ہے تو ایسے نظام کی ہمہ گیر گرفت میں رہتے ہوئے ہم خود اپنے آپ کو ہی اس کے برے اثرات اور بدتر نتائج سے کب بچا سکتے ہیں۔ یہ نظام جس جہنم کی طرف جا رہا ہے اسی طرف وہ دنیا کے ساتھ ہمیں بھی گھسیٹے لئے جا رہا ہے۔ اگر ہم اس کی مزاحمت نہ کریں اور اس کو بدلنے کی کوشش میں ایڑی چوٹی کا زور نہ لگائیں تو یہ ہماری، اور ہماری آئندہ نسلوں کی دنیا خراب اور عاقبت خراب کر کے چھوڑے گا۔ لہٰذا محض دنیا کی اصلاح ہی کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے بچاؤ کے لئے بھی یہ فرض ہم پر عائد ہوتا ہے — اور یہ سب فرضوں سے بڑا فرض ہے — کہ ہم جس نظام زندگی کو پوری بصیرت کے ساتھ فاسد و مہلک جانتے ہیں اسے بدلنے کی سعی کریں اور جس

نظام کے برحق اور واحد ذریعۂ فلاح و نجات ہونے پر ایمان رکھتے ہیں اسے عملاً قائم کرنے کی جد و جہد کریں۔

اس مختصر گذارش سے آپ یہ بات پا گئے ہوں گے کہ ہمارا اصل مدعا موجودہ نظام کے چلانے والے ہاتھوں کا بدلنا نہیں ہے بلکہ خود نظام کا بدلنا ہے۔ ہماری کوششوں کا مقصود یہ نہیں ہے کہ نظام تو یہی رہے اور انہی اصولوں پر چلتا رہے مگر اس کو مغربی نہ چلائے مشرقی چلائے، یا انگریز نہ چلائے ہندوستانی چلائے، یا ہندو نہ چلائے "مسلمان" چلائے۔ ہمارے نزدیک محض ہاتھوں کے بدل جانے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ سؤر تو بہر حال سؤر ہی ہے اور اپنی ذات میں ناپاک ہے، خواہ اسے کافر باورچی پکائے یا مسلمان باورچی۔ بلکہ مسلمان باورچی کا سور پکانا اور بھی زیادہ افسوسناک ہے اور گمراہ کن بھی۔ بہت سے بندگان خدا حتیٰ کہ اچھے خاصے پرہیزگار لوگ بھی اس ظالم کے ہاتھ کا پکا ہوا سور اس اطمینان پر کھا جائیں گے کہ یہ مسلمان نے پکایا ہے۔ اور اگر اس بخت و پز کے دوران میں چمچے کی ہر گردش پر وہ بآواز بلند بسم اللہ پڑھ دیا کرے اور اس کے چنے ہوئے دستر خوان پر مسلمانوں کو کافر کے دستر خوان کی بہ نسبت تناول ماحضر کی زیادہ آسانیاں اور آزادیاں میسر ہوں اور محفل طعام کے گرد و پیش کچھ ایسے لوازم بھی فراہم کر دئے جائیں جو عام طور پر اسلامی لوازم سمجھے جاتے ہیں، تو اس قسم کی نمائشی باتیں اس حرام خوراک کو قبول کر لینے کے لئے کوئی سفارش

نہ ہونی چاہئیں۔ بلکہ یہ ظاہر فریبیاں اس معاملہ کو اور بھی زیادہ پر خطر بنا دیتی ہیں۔ لہٰذا ہم کسی ایسی ظاہری تبدیلی پر نہ خود مطمئن ہو سکتے ہیں اور نہ کسی کو مطمئن ہوتے دیکھ سکتے ہیں جس میں یہ فاسد نظام تو جوں کا توں قائم رہے اور صرف اس کے چلانے والے ہاتھ بدل جائیں۔ ہماری نظر ہاتھوں پر نہیں بلکہ ان اصولوں پر ہے جن پر زندگی کا نظام چلایا جاتا ہے وہ اصول اگر فاسد ہوں تو ہم ان کے خلاف جنگ جاری رکھیں گے اور انہیں صالح اصولوں سے بدلنے کی کوشش کریں گے۔

یہ تو ہے ہمارا مدعا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ بھی واضح طور پر سمجھ لیں کہ موجودہ تہذیب کے وہ اصول کیا ہیں جن کو ہم مٹانا چاہتے ہیں اور ان کے جواب میں وہ دوسرے اصول کون سے ہیں جن کو ہم قائم کرنا چاہتے ہیں۔

موجودہ تہذیب جس پر آج دنیا کا پورا فکری، اخلاقی، تمدنی، سیاسی اور معاشی نظام چل رہا ہے دراصل تین بنیادی اصولوں پر قائم ہے :۔

(۱) Secular یعنی لادینی یا دنیاویت

(۲) Nationalism یعنی قوم پرستی

(۳) Democracy یعنی حاکمیت جمہور

ان میں سے پہلے اصول، یعنی لادینی کا مطلب یہ ہے کہ خدا اور اس کی ہدایت اور اس کی عبادت کے معاملہ کو ایک ایک شخص کی ذاتی حیثیت تک محدود کر دیا جائے اور انفرادی زندگی کے اس چھوٹے سے دائرے کے سوا دنیا کے سارے معاملات کو ہم خالص دنیوی نقطۂ نظر سے اپنی صواب دید کے مطابق خود جس طرح

چاہیں طے کریں۔ ان معاملات میں یہ سوال خارج از بحث ہونا چاہیئے کہ خدا کیا کہتا ہے اور اس کی ہدایت کیا ہے اور اس کی کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ ابتداءً یہ طرزِ عمل اہلِ مغرب نے عیسائی پادریوں کی اس خود ساختہ دینیات (Theology) سے بیزار ہو کر اختیار کیا تھا جو ان کے لئے زنجیرِ پا بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہی طرزِ عمل ایک مستقل نظریۂ حیات بن گیا اور تہذیبِ جدید کا پہلا سنگِ بنیاد قرار پایا۔ آپ نے اکثر یہ فقرہ سنا ہوگا کہ "مذہب ایک پرائیویٹ معاملہ ہے خدا اور بندے کے درمیان"۔ یہ مختصر سا فقرہ دراصل تہذیبِ حاضر کا "کلمہ" ہے۔ اس کی شرح یہ ہے کہ اگر کسی کا ضمیر گواہی دیتا ہے کہ خدا ہے اور اس کی پرستش کرنی چاہیئے تو وہ اپنی انفرادی زندگی میں بخوشی اپنے خدا کو پوجے، مگر دنیا اور اس کے معاملات سے خدا اور مذہب کا کوئی تعلق نہیں۔ اس "کلمہ" کی بنیاد پر جس نظامِ زندگی کی عمارت اٹھی ہے اس میں انسان اور انسان کے تعلق اور انسان اور دنیا کے تعلق کی تمام صورتیں خدا اور مذہب سے آزاد ہیں۔ معاشرت ہے تو اس سے آزاد، تعلیم ہے تو اس سے آزاد، معاشی کاروبار ہے تو اس سے آزاد، قانون ہے تو اس سے آزاد، پارلیمنٹ ہے تو اس سے آزاد، سیاست اور انتظامِ ملکی ہے تو اس سے آزاد، بین الاقوامی ربط و ضبط ہے تو اس سے آزاد۔ زندگی کے ان بیشمار مختلف پہلوؤں میں جو کچھ بھی طے کیا جاتا ہے اپنی خواہش اور دانست کے مطابق طے کیا جاتا ہے اور اس سوال کو نہ صرف ناقابلِ لحاظ، بلکہ اصولاً غلط اور انتہائی تاریک خیالی سمجھا

جاتا ہے کہ ان امور کے متعلق خدا نے بھی کچھ اصول اور احکام ہمارے لئے مقرر کئے ہیں یا نہیں۔ رہی انفرادی زندگی تو وہ بھی لادینی تعلیم اور بے دین اجتماعیت کی بدولت اکثر و بیشتر افراد کے معاملہ میں نری دنیاوی (Secular) ہی ہو کر رہ گئی ہے اور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ کیونکہ اب بہت ہی کم افراد کا ضمیر واقعی یہ گواہی دیتا ہے کہ خدا ہے اور اس کی بندگی کرنی چاہئے۔ خصوصاً جو لوگ اس وقت تمدن کے اصلی کارفرما اور کارکن ہیں، ان کے لئے تو مذہب اب ایک پرائیویٹ معاملہ بھی نہیں رہا ہے۔ ان کا ذاتی تعلق بھی خدا سے ٹوٹ چکا ہے۔

دوسرے اصول، یعنی قوم پرستی کی ابتدا، تو پوپ اور قیصر کے عالمگیر استبداد کے خلاف رجعت کے طور پر ہوئی تھی اور اس کا مطلب صرف اتنا تھا کہ مختلف قومیں اپنی اپنی سیاست و مصلحت کی آپ ہی مالک و مختار ہوں، کسی عالمگیر روحانی یا سیاسی اقتدار کے ہاتھوں میں شطرنج کے مہروں کی طرح نہ کھیلیں، مگر اس معصوم آغاز سے چل کر جب یہ تخیل آگے بڑھا تو رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ جس جگہ سے بے دینی کی تحریک نے خدا کو بے دخل کیا تھا وہاں قومیت کو لا بٹھایا گیا۔ اب ہر قوم کے لئے بلند ترین اخلاقی قدر اس کا قومی مفاد اور اس کے قومی حوصلے (Ambitions) ہیں۔ نیکی وہ ہے جو قوم کے لئے مفید ہو، خواہ وہ جھوٹ ہو، بے ایمانی ہو، ظلم ہو، یا اور کوئی ایسا فعل ہو جو پرانے مذہب و اخلاق میں بدترین گناہ سمجھا جاتا تھا۔ اور بدی وہ ہے جس سے قوم کے مفاد کو نقصان پہنچے،

خواہ وہ سچائی ہو، انصاف ہو، ادائے حق ہو یا اور کوئی ایسی چیز ہو جسے کبھی فضائل اخلاق میں شمار کیا جاتا تھا۔ افرادِ قوم کی خوبی اور زندگی و بیداری کا پیمانہ یہ ہے کہ قوم کا مفاد ان سے جس قربانی کا مطالبہ بھی کرے، خواہ وہ جان و مال اور وقت کی قربانی ہو یا اخلاق و انسانیت اور شرافتِ نفس کی، بہر حال وہ اس میں دریغ نہ کریں اور متحد و منظم ہو کر قوم کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کو پورا کرنے میں لگے رہیں۔ اجتماعی کوششوں کی غایت اب یہ ہے کہ ہر قوم ایسے افراد کی زیادہ سے زیادہ تعداد بہم پہنچائے اور ان میں ایکا اور نظم پیدا کرے تاکہ وہ دوسری قوموں کے مقابلہ میں اپنی قوم کا جھنڈا بلند کریں۔

تیسرے اصول، یعنی جمہور کی حاکمیت (Sovereignty of the People) کو ابتداءً بادشاہوں اور جاگیرداروں کے اقتدار کی گرفت توڑنے کے لئے پیش کیا گیا تھا، اور اس حد تک بات درست تھی کہ ایک شخص یا ایک خاندان یا ایک طبقہ کو لاکھوں کروڑوں انسانوں پر اپنی مرضی مسلط کر دینے اور اپنی اغراض کے لئے انہیں استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن اس منفی پہلو کے ساتھ اس کا مثبت پہلو یہ تھا کہ ایک ایک ملک اور ایک ایک علاقے کے باشندے اپنے آپ حاکم اور اپنے آپ مالک ہیں۔ اسی مثبت پہلو پر ترقی کر کے جمہوریت نے اب جو شکل اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ ہر قوم اپنی مرضی کی مختارِ کل ہے۔ اس کی مجموعی خواہش (یا عملاً اس کی اکثریت کی خواہش) کو پابند کرنے والی

کوئی چیز نہیں ہے۔ اخلاق ہو یا تمدن، معاشرت ہو یا سیاست، ہر چیز کے لئے برحق اصول وہ ہیں جو قومی خواہش سے طے ہوں، اور جن اصولوں کو قوم کی رائے عام رد کر دے وہ باطل ہیں۔ قانون قوم کی مرضی پر منحصر ہے جو قانون چاہے بنالے اور جس قانون کو چاہے توڑ دے یا بدل دے۔ حکومت قوم کی رضا کے مطابق بننی چاہیئے، قوم ہی کی رضا کا اسے پابند ہونا چاہیئے، اور اس کی پوری طاقت قومی خواہش کو پورا کرنے پر صرف ہونی چاہیئے۔

یہ تین اصول، جن کی تشریح میں نے مختصراً آپ کے سامنے بیان کی ہے، موجودہ دور کے نظام زندگی کی بنیاد ہیں، اور انہی اصولوں پر وہ بے دین جمہوری قومی ریاست Secular Democratic National State بنتی ہے جسے آج کل اجتماعی تنظیم کی مہذب ترین معیاری صورت سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے نزدیک یہ تینوں اصول غلط ہیں۔ صرف غلط ہی نہیں، ہم پوری بصیرت کے ساتھ یہ یقین رکھتے ہیں کہ یہی اصول اُن تمام مصائب کی جڑ ہیں جن میں آج انسانیت مبتلا ہے ہماری عداوت دراصل ان ہی اصولوں سے ہے اور ہم اپنی پوری طاقت کے ساتھ ان کے خلاف لڑنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ان اصولوں پر کیا اعتراض ہے اور کیوں اعتراض ہے؟ اس کی تفصیل کے لئے تو بڑی لمبی بحث درکار ہے، مگر میں اسے چند الفاظ میں آپ کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کرونگا تاکہ آپ ہماری اس لڑائی کی اہمیت اچھی طرح سمجھ سکیں اور آپ کو اندازہ ہو کہ کیوں یہ معاملہ

اتنا سنگین ہے کہ ان اصولوں کے خلاف جنگ کرنا ناگزیر ہے۔

سب سے پہلے اس لادینی یا دنیاویت کو لیجئے جو اس نظام زندگی کا اولین سنگِ بنیاد ہے۔ یہ نظریہ کہ خدا اور مذہب کا تعلق صرف آدمی کی انفرادی زندگی سے ہے، سراسر ایک مہمل نظریہ ہے جسے عقل و خرد سے کوئی سروکار نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ خدا اور انسان کا معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہوسکتا۔ یا تو خدا انسان کا اور اس ساری کائنات کا، جس میں انسان رہتا ہے، خالق اور مالک اور حاکم ہے، یا نہیں ہے۔ اگر وہ نہ خالق ہے نہ مالک اور نہ حاکم تب تو اس کے ساتھ پرائیویٹ تعلق کی بھی کوئی ضرورت نہیں۔ نہایت لغو بات ہے کہ ایک ایسی غیر متعلق ہستی کی خواہ مخواہ پرستش کی جائے جس کا ہم سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے۔ اور اگر وہ فی الواقع ہمارا اور اس تمام جہانِ ہست و بود کا خالق، مالک اور حاکم ہے تو اس کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ اس کی عملداری (Jurisdiction) محض ایک ایک شخص کی پرائیویٹ زندگی تک محدود ہو اور جہاں سے ایک اور ایک دو آدمیوں کا اجتماعی تعلق شروع ہوتا ہے وہیں سے اس کے اختیارات ختم ہو جائیں۔ یہ حد بندی اگر خدا نے خود کی ہے تو اس کی کوئی سند ہونی چاہیے، اور اگر اپنی اجتماعی زندگی میں انسان نے خدا سے بے نیاز ہو کر خود ہی خود مختاری اختیار کی ہے تو یہ اپنے خالق اور مالک اور حاکم سے اس کی کھلی بغاوت ہے۔ اس بغاوت کے ساتھ یہ دعویٰ کہ ہم اپنی انفرادی زندگی میں خدا کو اور اس کے دین کو مانتے ہیں صرف وہی شخص کر سکتا

ہے جس کی عقل ماری گئی ہو۔ اس سے زیادہ لغو بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ایک ایک شخص فرداً فرداً تو خدا کا بندہ ہو، مگر یہ الگ الگ بندے جب مل کر ایک معاشرہ بنائیں تو بندے نہ رہیں۔ اجزا میں سے ہر ایک بندہ اور ان اجزا کا مجموعہ غیر بندہ، یہ ایک ایسی بات ہے جس کا تصور صرف ایک پاگل ہی کر سکتا ہے۔ پھر یہ بات کسی طرح ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ اگر ہمیں خدا کی اور اس کی رہنمائی کی ضرورت نہ اپنی خانگی معاشرت میں ہے، نہ محلے اور شہر میں، نہ مدرسے اور کالج میں، نہ منڈی اور بازار میں، نہ پارلیمنٹ اور گورنمنٹ ہاؤس میں، نہ ہائی کورٹ اور سکرٹریٹ میں، نہ چھاونی اور پولیس لائن میں اور نہ میدان جنگ اور صلح کانفرنس میں، تو آخر اس کی ضرورت ہے کہاں؟ کیوں ایسے خدا کو مانا جائے اور اس کی خواہ مخواہ پوجا پاٹ کی جائے جو یا تو اتنا بیکار ہے کہ زندگی کے کسی معاملہ میں بھی ہماری رہنمائی نہیں کرتا، یا معاذ اللہ ایسا نادان ہے کہ کسی معاملہ میں بھی اس کی کوئی ہدایت ہمیں معقول اور قابل عمل نظر نہیں آتی؟

یہ تو محض اس معاملہ کا عقلی پہلو ہے۔ عملی پہلو سے دیکھئے تو اس کے نتایج بڑے ہی خوفناک ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی کے جس معاملے کا تعلق بھی خدا سے ٹوٹتا ہے اس کا تعلق شیطان سے جڑ جاتا ہے۔ انسان کی پرائیویٹ زندگی درحقیقت کسی چیز کا نام نہیں ہے۔ انسان ایک متمدن ہستی ہے اور اس کی پوری زندگی اصل میں اجتماعی زندگی ہے۔ وہ پیدا ہی ایک ماں اور ایک باپ کے معاشرتی تعلق سے ہوتا ہے۔ دنیا

میں آتے ہی وہ ایک خاندان میں آنکھیں کھولتا ہے۔ ہوش سنبھالتے ہی اس کو ایک سوسائٹی سے، ایک برادری سے، ایک بستی سے، ایک قوم سے، ایک نظامِ تمدن اور نظامِ معیشت و سیاست سے واسطہ پیش آتا ہے۔ یہ بیشمار روابط جو اس کو دوسرے انسانوں سے اور دوسرے انسانوں کو اس سے جوڑے ہوئے ہیں، انہی کی درستی پر ایک ایک انسان کی اور مجموعی طور پر تمام انسانوں کی فلاح و بہبودی کا انحصار ہے۔ اور وہ صرف خدا ہی ہے جو انسان کو ان روابط کے لئے صحیح اور منصفانہ اور پائیدار اصول و حدود بتاتا ہے۔ جہاں انسان اس کی ہدایت سے بے نیاز ہو کر خود مختار بنا، پھر نہ تو کوئی مستقل اصول باقی رہتا ہے اور نہ انصاف اور راستی۔ اس لئے کہ خدا کی رہنمائی سے محروم ہو جانے کے بعد پھر خواہش اور ناقص علم و تجربہ کے سوا کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہتی جس کی طرف انسان رہنمائی کے لئے رجوع کر سکے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جس سوسائٹی کا نظام لادینی یا دنیاویت کے اصول پر چلتا ہے اس میں خواہشات کی بنا پر روز اصول بنتے اور ٹوٹتے ہیں۔ آپ خود دیکھ رہے ہیں کہ انسانی تعلقات کے ایک ایک گوشے میں ظلم، بے انصافی، بے ایمانی اور آپس کی بے اعتمادی گھس گئی ہے۔ تمام انسانی معاملات پر انفرادی، طبقاتی، قومی اور نسلی خودغرضیاں مسلّط ہو گئی ہیں۔ دو انسانوں کے تعلق سے لے کر قوموں کے تعلق تک کوئی رابطہ ایسا نہیں رہا ہے جس میں ٹیڑھ نہ آگئی ہو۔ ہر ایک شخص نے، ہر ایک گروہ نے، ہر ایک جتھے نے، ہر ایک قوم اور ملک نے اپنے اپنے دائرۂ اختیار

ہیں، جہاں تک بھی اس کا بس چلا ہے، پوری خود غرضی کے ساتھ اپنے مطلب کے اصول اور قاعدے اور قانون بنا لئے ہیں، اور کوئی بھی اس کی پروا نہیں کرتا کہ دوسرے اشخاص، گروہوں، طبقوں اور قوموں پر اس کا کیا اثر پڑیگا۔ پرواہ کرنے والی صرف ایک ہی طاقت رہ گئی ہے اور وہ ہے جوتا۔ جہاں مقابلے میں جوتا یا جوتے کا اندیشہ ہوتا ہے صرف وہیں اپنی حد سے زیادہ پھیلے ہوئے ہاتھ اور پاؤں کچھ سکڑ جاتے ہیں، مگر ظاہر ہے کہ جوتا کسی عالم اور منصف ہستی کا نام نہیں ہے۔ وہ ایک اندھی طاقت کا نام ہے۔ اس لئے اس کے زور سے کبھی توازن قائم نہیں ہوتا۔ جس کا جوتا زبردست ہوتا ہے وہ دوسروں کو صرف اتنا ہی نہیں سکیڑتا جتنا اسے سکڑنا چاہیئے۔ بلکہ وہ خود اپنی حد سے زیادہ پھیلنے کی فکر میں لگ جاتا ہے۔ پس لادینی اور دنیاویت کا ماحصل صرف یہ ہے کہ جو بھی اس طرزِ عمل کو اختیار کرے گا بے لگام، غیر ذمہ دار اور بندۂ نفس ہو کر رہیگا، خواہ وہ ایک شخص ہو یا ایک گروہ یا ایک ملک اور قوم، یا مجموعۂ اقوام۔

اب دوسرے اصول کو لیجئے۔ قوم پرستی کی تشریح ابھی تھوڑی دیر پہلے میں آپ کے سامنے کر چکا ہوں۔ وہ اگر آپ کے ذہن میں تازہ ہے تو آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہ کتنی بڑی لعنت ہے جو اس دور میں انسانیت پر مسلط ہوئی ہے۔ ہمارا اعتراض قومیت (Nationality) پر نہیں ہے۔ کیونکہ وہ ایک فطری حقیقت ہے۔ ہم قومی خیر خواہی کے بھی مخالف نہیں ہیں بشرطیکہ اس کے اندر دوسری قوموں کی بدخواہی

شامل نہ ہو۔ ہمیں قومی محبت پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے بشرطیکہ وہ قومی تعصب اور اپنی قوم کی بیجا پاسداری اور دوسروں سے نفرت کی حد تک نہ جا پہنچے۔ ہم قومی آزادی کو بھی صحیح سمجھتے ہیں کیونکہ اپنے معاملات کو خود انجام دینا اور اپنے گھر کا آپ انتظام کرنا ہر قوم کا حق ہے اور ایک قوم پر دوسری قوم کی حکومت درست نہیں ہے۔ دراصل جو چیز قابل اعتراض، بلکہ قابل نفرت ہے وہ قوم پرستی (Nationalism) ہے

اس قوم پرستی کی کوئی حقیقت اس کے سوا نہیں ہے کہ وہ قومی خود غرضی کا دوسرا نام ہے۔ اگر ایک سوسائٹی کے اندر اس شخص کا وجود ایک لعنت ہے جو اپنے نفس اور اپنی غرض کا بندہ ہو اور اپنے مفاد کے لئے سب کچھ کر گزرنے کے لئے تیار ہو، اگر ایک بستی کے اندر وہ خاندان ایک لعنت ہے جس کے افراد اپنے خاندانی مفاد کے اندھے پرستار ہوں اور جائز و ناجائز تمام ذرائع سے بس اپنا بھلا کرنے پر تلے ہوئے ہوں، اگر ایک ملک کے اندر وہ طبقہ ایک لعنت ہے جو اپنی طبقاتی خود غرضی میں اندھا ہو رہا ہو، اور دوسروں کے بھلے برے کی پروا کئے بغیر صرف اپنے فائدے کے پیچھے پڑ جائے (مثلاً بلیک مارکٹنگ کرنے والے)، تو آخر انسانیت کے وسیع دائرے میں وہ خود غرض قوم ایک لعنت کیوں نہیں ہے جو اپنے قومی مفاد کو اپنا خدا بنالے اور اس کی پرستش کا یہ اصول مقرر کرلے کہ "حق وہ ہے جو قومی اغراض کے مطابق ہو اور باطل وہ جو اُن کے مطابق نہ ہو"۔ آپ کا ضمیر گواہی دیگا کہ تمام خود غرضیوں اور نفسانیتوں کی طرح یہ قومی خود غرضی و نفسانیت

بھی یقیناً ایک لعنت ہے، مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ آج اس تہذیب جدید نے تمام قوموں کو اسی لعنت میں مبتلا کر دیا ہے اور اس کی بدولت ساری دنیا ایسے قومی اکھاڑوں میں تبدیل ہو گئی ہے جن میں سے ہر اکھاڑے کی دوسرے اکھاڑے سے لاگ ڈانٹ ہے اور دو عالمگیر دنگل ہو چکنے کے بعد ابھی پسینہ بھی خشک نہیں ہوا ہے کہ تیسرے دنگل کے لئے ڈنڑ خم تازہ کئے جا رہے ہیں۔

تیسرا اصول پہلے دونوں اصولوں کے ساتھ مل کر اس بلا کی تکمیل کر دیتا ہے۔ جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، موجودہ تہذیب میں جمہوریت کے معنی ہیں جمہور کی حاکمیت یعنی ایک علاقے کے لوگوں کی مجموعی خواہش کا اپنے علاقے میں مختار مطلق ہونا، اور ان کا قانون کے تابع نہ ہونا بلکہ قانون کا ان کی خواہش کے تابع ہونا، اور حکومت کی غرض صرف یہ ہونا کہ اس کا نظم اور اس کی طاقت لوگوں کی اجتماعی خواہشات کو پورا کرنے کے کام آئے۔ اب غور کیجئے کہ پہلے تو لادینی نے ان لوگوں کو خدا کے خوف اور اخلاق کے مستقل اصولوں کی گرفت سے آزاد کر کے بے لگام اور غیر ذمہ دار اور بندۂ نفس بنا دیا، پھر قوم پرستی نے ان کو شدید قسم کی قومی خود غرضی اور اندھی عصبیت اور قومی غرور کے نشہ سے بدمست کر دیا، اور اب یہ جمہوریت انہی بے لگام بدمست بندگان نفس کی خواہشات کو قانون سازی کے مکمل اختیارات دیتی ہے، اور حکومت کا واحد مقصد یہ قرار دیتی ہے کہ اس کی طاقت ہر اس چیز کے حصول میں صرف ہو جس کی یہ اجتماعی طور پر خواہش کریں۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح کی خود مختار

صاحب حاکمیت قوم کا حال آخر ایک طاقت ور اور آزاد بدمعاش کے حال سے کس بات میں مختلف ہے؟ جو کچھ ایک بدمعاش فرد خود مختار اور طاقت ور ہو کر چھوٹے پیمانے پر کریگا وہی تو اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر اس طرح کی ایک قوم کریگی۔ پھر جب دنیا میں صرف ایک ہی قوم ایسی نہ ہو بلکہ ساری متمدن قومیں اسی ڈھنگ پر لادینی، قوم پرستی اور جمہوریت کے اصولوں پر منظم ہوں تو دنیا بھیڑیوں کا میدان جنگ نہ بنے گی تو اور کیا بنے گی؟

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا، پر ہم اس نظام اجتماعی کو فاسد سمجھتے ہیں جو ان تین اصولوں کی بنیاد پر بنے۔ ہماری دشمنی لادینی قومی جمہوری نظام سے ہے، خواہ اس کے قائم کرنے اور چلانے والے مغربی ہوں یا مشرقی، غیر مسلم ہوں یا نام نہاد مسلمان۔ جہاں جس ملک اور جس قوم پر بھی یہ بلا مسلط ہوگی، ہم بندگان خدا کو اس سے ہوشیار کرنے کی فکر کریں گے اور انہیں دعوت دیں گے کہ اسے دفع کرو۔

ان تین اصولوں کے جواب میں ہم دوسرے تین اصول پیش کرتے ہیں، اور سب انسانوں کے ضمیر سے اپیل کرتے ہیں کہ انہیں جانچ کر، پرکھ کر خود دیکھ لو کہ تمہارا اپنا بھلا اور ساری دنیا کا بھلا ان پاک اصولوں میں ہے یا ان خبیث اصولوں میں؟

لادینی کے مقابلہ میں خدا کی بندگی و اطاعت،

قوم پرستی کے مقابلہ میں انسانیت،

جمہور کی حاکمیت کے مقابلہ میں خدا کی حاکمیت و جمہور کی خلافت۔
پہلے اصول کا مطلب یہ ہے کہ ہم سب اس خدا کو اپنا آقا تسلیم کریں جو ہمارا اور تمام کائنات کا خالق، مالک اور حاکم ہے۔ ہم اس سے آزاد اور بے نیاز بن کر نہیں بلکہ اس کے تابع فرمان اور اس کی رہنمائی کے پیرو بن کر زندگی بسر کریں۔ ہم صرف اس کی پوجا ہی نہ کریں بلکہ اس کی اطاعت اور بندگی بھی کریں۔ ہم صرف فرداً فرداً اپنی پرائیویٹ حیثیت ہی میں اس کے احکام اور ہدایات کے پابند نہ ہوں بلکہ اپنی اجتماعی زندگی کے بھی ہر پہلو میں اسی کے پابند ہوں۔ ہماری معاشرت، ہمارا تمدن، ہماری معیشت، ہمارا نظامِ تعلیم و تربیت، ہمارے قوانین، ہماری عدالتیں، ہماری حکومت، ہماری صلح و جنگ اور ہمارے بین الاقوامی تعلقات، سب کے سب ان اصولوں اور حدوں کے پابند ہوں جو خدا نے مقرر کئے ہیں۔ ہم اپنے دنیوی معاملات کو طے کرنے میں بالکل آزاد نہ ہوں بلکہ ہماری آزادی ان سرحدوں کے اندر محدود ہو جو خدا کے مقرر کیے ہوئے اصول اور حدود نے کھینچ دی ہیں۔ یہ اصول اور حدود ہر حال میں ہمارے اختیارات سے بالاتر ہیں۔

دوسرے اصول کا مطلب یہ ہے کہ خدا پرستی کی بنیاد پر جو نظامِ زندگی بنے اس میں قوم، نسل، وطن، رنگ اور زبان کے فرق و امتیاز کی بناء پر کسی قسم کے تعصبات اور خود غرضیاں راہ نہ پائیں۔ وہ ایک قومی نظام کے بجائے ایک اصولی نظام ہونا چاہیے جس کے دروازے ہر اس انسان کے لئے کھلے ہوئے ہوں جو اس کے بنیادی اصولوں کو مان لے، اور جو

انسان بھی ان کو مان جائے وہ بغیر کسی امتیاز کے پورے مساویانہ حقوق کے ساتھ اس میں شریک ہو سکے۔ اس نظام میں شہریت (Citizenship) محض ایک ریاست کے جغرافی حدود تک محدود نہ رہے۔ بلکہ اصولی بنیادوں پر عام ہو۔ جو لوگ ان اصولوں پر مطمئن نہ ہوں یا کسی وجہ سے ان کو ماننے کے لئے تیار نہ ہوں، ان کو مٹانے اور دبانے اور ہضم کرنے کی کوشش نہ ہو بلکہ وہ متعین حقوق کے ساتھ اس نظام کی حفاظت (Protection) میں ہیں اور ان کے لئے ہر وقت یہ موقع کھلا رہتا ہے کہ جب بھی ان اصولوں کی صحت و تندرستی پر ان کا اطمینان ہو جائے وہ برابر کے حقوق کے ساتھ اپنی آزادانہ مرضی سے اس نظام کے کارفرما بن سکیں۔ یہ چیز جس کو ہم اصول انسانیت سے تعبیر کر رہے ہیں قومیت کی نفی نہیں کرتی بلکہ اسے اس کی صحیح فطری حد میں رکھتی ہے۔ اس میں قومی محبت کے لئے جگہ ہے، مگر قومی تعصب کے لئے جگہ نہیں ہے۔ قومی خیر خواہی جائز ہے مگر قومی خود غرضی حرام ہے قومی آزادی مسلم ہے اور ایک قوم پر دوسری قوم کے خود غرضانہ تسلط سے بھی سخت انکار ہے، مگر ایسی قومی آزادی ہرگز تسلیم نہیں ہے جو انسانیت کو ناقابل عبور سرحدوں میں تقسیم کر دے۔ اصول انسانیت کا مطالبہ یہ ہے کہ اگرچہ ہر قوم اپنے گھر کا انتظام آپ کرے، اور کوئی قوم من حیث القوم دوسری قوم کی تابع نہ ہو، لیکن تمام وہ قومیں جو تہذیب انسانی کے بنیادی اصولوں میں متفق ہو جائیں، ان کے درمیان انسانی فلاح و ترقی کے کاموں میں پورا تعاون ہو، مسابقت (Competition) کے بجائے معاونت ہو،

باہم امتیازات اور تعصبات اور تفریقیں نہ ہوں، تہذیب وتمدن اور اسباب زندگی کا آزادانہ لین دین ہو، اور اس مہذب نظام زندگی کے تحت زندگی بسر کرنے والی دنیا کا ہر انسان اس پوری دنیا کا شہری ہو نہ کہ ایک ملک اور ایک قوم کا، حتی کہ وہ کہہ سکے کہ " ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست"۔

موجودہ حالت کو ہم ایک قابل نفرت حالت سمجھتے ہیں جس میں ایک انسان نہ تو خود ہی اپنی قوم اور ملک کے سوا کسی دوسری قوم اور ملک کا وفادار ہو سکتا ہے اور نہ کوئی قوم اپنے افراد کے سوا دوسری کسی قوم کے افراد پر اعتماد کر سکتی ہے۔ آدمی اپنے ملک کے حدود سے باہر نکلتے ہی یہ محسوس کرتا ہے کہ خدا کی زمین میں ہر جگہ اس کے لئے رکاوٹیں ہی رکاوٹیں ہیں ہر جگہ وہ چوروں اور اچکوں کی طرح شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ہر جگہ پوچھ گچھ ہے، تلاشیاں ہیں، زبان و قلم اور نقل و حرکت پر پابندیاں ہیں، اور کہیں اس کے لئے نہ آزادی ہے نہ حقوق۔ ہم اس کے مقابلہ میں ایسا عالمگیر نظام چاہتے ہیں جس میں اصولوں کی وحدت کو بنیاد بنا کر قوموں کے درمیان وفاق قائم ہو اور اس وفاق میں بالکل مساویانہ اور مشترک شہریت (Common Citizenship) اور قطعاً بے روک ٹوک آمد و رفت کا طریقہ رائج ہو۔ ہماری آنکھیں پھر ایک دفعہ یہ منظر دیکھنا چاہتی ہیں کہ آج کا کوئی ابن بطوطہ اٹلانٹک کے ساحل سے بحرالکاہل کے ساحل تک اس طرح جائے کہ کہیں وہ غیر (Alien) نہ ہو اور ہر جگہ اس کے لئے جج، مجسٹریٹ، وزیر یا سفیر بن جانے کا موقع ہو۔

اب تیسرے اصول کو لیجئے۔ ہم جمہوری حاکمیت کے بجائے جمہوری خلافت کے قائل ہیں۔ شخصی بادشاہی (Monarchy) اور امیروں کے اقتدار اور طبقوں کی اجارہ داری کے ہم بھی اتنے ہی مخالف ہیں جتنا موجودہ زمانے کا کوئی بڑے سے بڑا جمہوریت پرست ہو سکتا ہے۔ اجتماعی زندگی میں تمام لوگوں کے یکساں حقوق، مساویانہ حیثیت اور کھلے مواقع پر ہمیں بھی اتنا ہی اصرار ہے جتنا مغربی جمہوریت کے کسی بڑے سے بڑے حامی کو ہو سکتا ہے۔ ہم بھی اس بات کے قائل ہیں کہ حکومت کا انتظام اور حکمرانوں کا انتخاب تمام باشندوں کی آزادانہ مرضی اور رائے سے ہونا چاہیئے۔ ہم بھی اس نظام زندگی کے سخت مخالف ہیں جس میں لوگوں کے لئے اظہار رائے کی آزادی، اجتماع کی آزادی اور سعی و عمل کی آزادی نہ ہو، یا جس میں پیدائش اور نسل اور طبقات کی بنا پر بعض لوگوں کے لئے مخصوص حقوق اور بعض دوسرے لوگوں کے لئے مخصوص رکاوٹیں ہوں۔ یہ امور جو جمہوریت کا اصل جوہر (Essence) ہیں، ان میں ہماری جمہوریت اور مغربی جمہوریت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اہل مغرب نے ہمیں سکھائی ہو۔ ہم اس جمہوریت کو اس وقت سے جانتے ہیں اور دنیا کو اس کا بہترین عملی نمونہ دکھا چکے ہیں جبکہ مغربی جمہوریت پرستوں کی پیدائش میں ابھی سینکڑوں برسوں کی دیر تھی۔ دراصل ہمیں اس نوخیز جمہوریت سے جس چیز میں اختلاف اور نہایت سخت اختلاف ہے وہ یہ ہے کہ وہ جمہور کی مطلق العنان بادشاہی کا اصول پیش کرتی ہے اور ہم اس کو حقیقت کے

اعتبار سے غلط اور نتائج کے اعتبار سے تباہ کن سمجھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بادشاہی (Sovereignty) صرف اس کا حق ہے جس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے، جو ان کی پرورش اور بالیدگی کا سامان کر رہا ہے، جس کے سہارے پر ان کی اور ساری دنیا کی ہستی قائم ہے اور جس کے زبردست قانون کی گرفت میں کائنات کی ایک ایک چیز جکڑی ہوئی ہے۔ اس کی واقعی اور حقیقی بادشاہی کے اندر جس بادشاہی کا بھی دعویٰ کیا جائے گا، خواہ وہ ایک شخص اور ایک خاندان کی بادشاہی ہو یا ایک قوم اور اس کے عوام کی، بہر حال وہ ایک غلط فہمی کے سوا کچھ نہ ہوگا اور اس غلط فہمی کی چوٹ اصل بادشاہ پر نہیں بلکہ اس احمق مدعی ہی پر پڑے گی جس نے اپنی قدر خود نہ پہچانی۔ اس حقیقت کی موجودگی میں صحیح بھی یہی ہے اور نتائج کے اعتبار سے انسان کی بھلائی بھی اسی میں ہے کہ خدا کو حاکم مان کر انسانی زندگی کا نظامِ حکومت خلافت ونیابت کے نظریہ پر بنایا جائے۔ یہ خلافت بلاشبہ جمہوری ہونی چاہیے۔ جمہور کی رائے ہی سے حکومت کے امیر یا ناظمِ اعلیٰ کا انتخاب ہونا چاہیے، انہی کی رائے سے اہل شوریٰ منتخب ہونے چاہئیں، انہی کے مشورے سے حکومت کے سارے انتظامات چلنے چاہئیں، اور ان کو تنقید و احتساب کا کھلا حق ہونا چاہیے، لیکن یہ سب کچھ اس احساس و شعور کے ساتھ ہونا چاہیے کہ ملک خدا کا ہے، ہم مالک نہیں بلکہ نائب ہیں، اور ہمیں اپنے ہر کام کا حساب اصل مالک کو دینا ہے۔ نیز وہ اخلاقی اصول اور قانونی احکام اور حدود اپنی جگہ اٹل ہونے چاہئیں جو خدا نے ہماری زندگی کے

لئے مقرر کر دیئے ہیں۔ ہماری پارلیمنٹ کا اساسی نظریہ یہ ہونا چاہیئے کہ جن امور میں خدا نے ہمیں ہدایات دی ہیں ان میں ہم قانون سازی نہیں کریں گے بلکہ اپنی ضروریات کے لئے خدا کی ہدایات سے تفصیلی قوانین اخذ کریں گے، اور جن امور میں خدا نے ہدایات نہیں دی ہیں ان میں ہم یہ سمجھیں گے کہ خدا نے خود ہی ہم کو آزادی عمل بخشی ہے اس لئے صرف انہی امور میں ہم باہمی مشورے سے قوانین بنائیں گے، مگر یہ قوانین لازماً اس مجموعی سانچے کے مزاج سے مطابقت رکھنے والے ہوں گے جو خدا کی اصولی ہدایات نے ہمارے لئے بنا دیا ہے۔ پھر یہ ضروری ہے کہ اس پورے نظام تمدن و سیاست کی کار فرمائی اور اس کا انتظام ان لوگوں کے سپرد ہو جو خدا سے ڈرنے والے اور اس کی اطاعت کرنے والے اور ہر کام میں اس کی رضا چاہنے والے ہوں، جن کی زندگی گواہ ہو کہ وہ خدا کے حضور اپنی پیشی اور جواب دہی کا یقین رکھتے ہیں، جن کی پبلک اور پرائیویٹ دونوں قسم کی زندگیوں سے یہ شہادت ملے کہ وہ بے لگام گھوڑے کی طرح نہیں ہیں جو ہر کھیت میں چرتا اور ہر حد کو پھاندتا پھرتا ہو بلکہ ایک الٰہی ضابطہ کی رسی سے بندھے ہوئے اور ایک خدا پرستی کے کھونٹے سے مربوط ہیں، اور ان کی ساری چلت پھرت اسی حد تک محدود ہے جہاں تک وہ رسی انہیں جانے دیتی ہے۔

حضرات! یہ تینوں اصول جن کی بہت ہی مختصر تشریح میں نے آپ کے سامنے بیان کی ہے، موجودہ تہذیب کی قوم پرستانہ لادینی جمہوری حاکمیت

کے مقابلہ میں ایک خدا پرستانہ انسانی جمہوری خلافت قائم کرنا چاہتے ہیں اور اسی کا قیام ہمارا نصب العین ہے۔ یہ بات تو آپ بیک نظر معلوم کر سکتے ہیں کہ ان دونوں نظاموں کے درمیان کھلا اختلاف ہے۔ اب یہ فیصلہ آپ کے اپنے ضمیر پر منحصر ہے کہ ان میں سے کون بہتر ہے، کس میں آپ کی فلاح ہے، کس کے قیام کا آپ کو خواہشمند ہونا چاہئیے اور کس کے قائم کرنے اور قائم رکھنے میں آپ کی قوتیں صرف ہونی چاہئیں۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان سے تو میں صاف کہتا ہوں کہ موجودہ زمانے کی لادینی قومی جمہوریت تمہارے دین و ایمان کے قطعاً خلاف ہے۔ تم اس کے آگے سر تسلیم خم کرو گے تو قرآن سے پیٹھ پھیرو گے۔ اس کے قیام و بقار میں حصہ لو گے تو اپنے رسول سے غداری کرو گے۔ اور اس کا جھنڈا اڑانے کے لئے اٹھو گے تو اپنے خدا کے خلاف علم بغاوت بلند کرو گے۔ جس اسلام کے نام پر تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو اس کی روح اس ناپاک نظام کی روح سے، اس کے بنیادی اصول اس کے بنیادی اصولوں سے اور اس کا ہر جز اس کے ہر جزو سے برسر جنگ ہے۔ اسلام اور یہ نظام ایک دوسرے سے کہیں بھی مصالحت نہیں کرتے۔ جہاں یہ نظام برسر اقتدار ہو گا وہاں اسلام نقش بر آب رہیگا اور جہاں اسلام برسر اقتدار ہو گا وہاں اس نظام کے لئے کوئی جگہ نہ ہوگی۔ تم اگر واقعی اسی اسلام پر ایمان رکھتے ہو جسے قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے تو تمہارا فرض ہے کہ جہاں بھی تم ہو اس قوم پرستانہ لادینی جمہوریت کی مزاحمت کرو اور اس کے مقابلہ میں خدا پرستانہ

انسانی خلافت قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرو خصوصیت کے ساتھ
جہاں تم بحیثیت ایک قوم کے برسرِ اقتدار ہو وہاں تو اگر تمہارے اپنے
ہاتھوں سے اسلام کے اصلی نظام کے بجائے یہ کافرانہ نظام بنے اور
چلے تو حیف ہے تمہاری اس جھوٹی مسلمانی پر جس کا نام لینے میں تم اتنے
بلند آہنگ اور جس کا کام کرنے میں تم اتنے جی چور ہو۔

اس سلسلہ میں جملہ معترضہ کے طور پر اپنے مسلمان بھائیوں سے مجھے
ایک بات اور بھی کہنی ہے۔ بعض مذہبی جامہ پہننے والے لوگ آپ کو اس
غلط فہمی میں ڈال رہے ہیں اور شاید خود بھی اس دھوکے میں ہیں کہ "حکومت
تو ایک انعام ہے جو نمازیں پڑھنے اور نیکیاں کرنے کے صلے میں خدا
کی طرف سے ملا کرتا ہے، اس کے حصول کی کوشش محض دنیا پرستی اور اس کو
نصب العین بنانا خلافِ اسلام ہے"۔ یہ باتیں جو لوگ کرتے ہیں انہوں نے
اس معاملہ کو سرے سے سمجھنے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی ہے، اور اگر وہ
بُرا نہ مانیں تو میں کہونگا کہ وہ سمجھنا چاہتے بھی نہیں ہیں، کیونکہ اس طرح وہ عیش
منغض ہو جائیگا جو موجودہ نظام کی فرماں روائی میں ان کو حاصل ہے، یا
حاصل ہونے کا لالچ ہے۔ یہ لوگ اس سارے معاملہ کو انعام کے پہلو سے
دیکھ رہے ہیں اور فرض کا پہلو ان کی نگاہ سے اوجھل ہے۔ میں کہتا ہوں
کہ بیشک خلافت الٰہیہ کا قائم ہو جانا ایک انعام ہے، مگر اس کے قیام کی
کوشش کرنا ایک فرض بھی تو ہے، تاکہ خلافت شیطانیہ کی جگہ وہ نظام
حق برپا ہو جس میں برائیاں دبیں اور نیکیاں پروان چڑھ سکیں۔ تم فرض سے

جی چراتے ہو اور انعام کی اُمید رکھتے ہو؟ یہ بوالفضولی تمہیں کو مبارک رہے!

رہے غیر مسلم حضرات، تو ان سے میری خیر خواہانہ گذارش یہ ہے کہ براہ کرم اصول کے معاملہ میں اُن تعصبات کے قفل اپنے دلوں پر نہ چڑھائیے جو پچھلی تاریخ اور آج کی کشمکش کی وجہ سے ہمارے اور آپ کے درمیان پیدا ہو گئے ہیں۔ اصول کسی قوم کی آبائی جائداد نہیں ہوتے، نہ ان پر کسی قومیت کا ٹھپا لگا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اگر صحیح اور مفید ہیں تو سب انسانوں کے لئے صحیح اور مفید ہیں، اور اگر غلط ہیں تو سب ہی کے لئے غلط ہیں، بلا لحاظ اس کے کہ کون ان کا پیش کرنے والا ہے اور کس زبان میں انہیں پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر حفظان صحت کے اصولوں میں، طب کے اصولوں میں، تجارت اور صنعت و حرفت اور زراعت کے اصولوں میں، سائنس اور دوسرے علوم و فنون کے اصولوں میں یہ سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا کہ وہ فلاں ملک اور فلاں قوم کی چیزیں ہیں اس لئے دوسرے ان سے تعصب کریں۔ آپ جس صحیح اصول کو قبول کرنے میں بھی تعصب سے کام لینگے اپنا ہی نقصان کریں گے۔ بالکل یہی معاملہ اخلاق، تمدن، معاشرت، تہذیب، معیشت اور سیاست کے اصولوں کا بھی ہے۔ یہ بھی درحقیقت غیر قومی اور غیر نسلی چیزیں ہیں۔ ان کو بھی ان کے حسن و قبح (Merits) ہی کے لحاظ سے قبول یا رد کرنا چاہیئے۔ آپ صحیح اصول اختیار کریں گے تو اپنا بھلا کریں گے، کسی پر کوئی احسان نہ کریں گے۔ غلط اصولوں کی پیروی کریں گے تو

تو اپنے نقصان کریں گے، کسی کا کچھ نہ بگاڑیں گے۔

آپ نے خود بھی دنیا کے دوسرے اصولوں کے معاملہ میں تعصب نہیں برتا ہے۔ یہ لادینی، یہ قوم پرستی، یہ مغربی جمہوریت آپ کے پاس اُن انگریزوں ہی کے ذریعہ سے تو آئی ہے جو دو سو برس آپ پر ظالمانہ حکومت کرتے رہے اور جن کے خلاف چالیس پچاس سال آپ آزادی کی جنگ لڑتے رہے۔ پھر ان دشمنوں کے لائے ہوئے اصولوں کو قبول کرنے میں آپ نے کیوں تعصب سے کام نہ لیا؟ یہ سوشلزم اور کمیونزم جن کی طرف آپ میں سے بہت سے لوگ لپک رہے ہیں، جرمنی کے ایک یہودی دماغ سے نکلے اور روس میں پروان چڑھے۔ ان قوموں سے آخر آپ کا کیا رشتہ ہے؟ پھر آپ نے انہیں اجنبی کیوں نہ سمجھا؟ اگر ان کے معاملہ میں آپ تعصب کو بالائے طاق رکھ سکتے ہیں اور اصول کو اصول ہی کی حیثیت سے دیکھ سکتے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ جو اصول ہم آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں ان پر غور کرنے میں یہ خیال آپ کی نظر و فکر کو اُلجھا دے کہ ان کے پیش کرنے والے لوگ ایسی قوم کے افراد ہیں جس سے آپ کچھ تاریخی شکایات رکھتے ہیں یا جس کے ساتھ آج آپ کی لڑائی ٹھنی ہوئی ہے۔

ہم دلائل کے ساتھ اُن غلط اصولوں پر تنقید کر رہے ہیں جو ہمارے نزدیک انسانیت کے لئے تباہ کن ہیں اور ان کے جواب میں وہ اصول پیش کر رہے ہیں جن کے اندر ہمیں اپنی، آپ کی، اور سب انسانوں کی فلاح نظر آتی ہے۔ آپ کھلے دل سے دیکھئے کہ آپ کا اپنا بھلا فی الواقع

کن اصولوں کی پیروی میں ہے خود جانچ کر دیکھ لیجئے کہ خدا پرستی بہتر ہے یا بے دینی۔ قوم پرستی بہتر ہے یا انسانیت، جمہور کی مطلق العنانی بہتر ہے یا خدا کی بادشاہی کے تحت جمہوری خلافت، انسانی معاملات کی باگیں خدا سے بے خوف لوگوں کے ہاتھوں میں رہنی بہتر ہیں یا ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں جو خدا سے ڈرنے والے ہوں۔ اگر آپ کا دل گواہی دے کہ یہ چیز جو ہم پیش کر رہے ہیں زیادہ صحیح اور نتائج کے لحاظ سے زیادہ اچھی ہے تو اسے اختیار کر کے آپ خود اپنی ہی خیر خواہی کریں گے۔

اس کے بعد صرف ایک عملی سوال حل طلب باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اس خدا پرستانہ نظام کو چلانے کے لئے ہدایات کہاں سے حاصل کی جائیں؟ وہ خدائی قانون و دستور کونسا ہے جس پر ہم اپنی ریاست کی بنیاد رکھیں؟ بظاہر یہ سوال بہت پیچیدہ ہے، کیونکہ جس آسانی کے ساتھ حکومت الٰہیہ، رام راج یا (Kingdom of God) کے سادہ تصور پر لوگوں کے درمیان اتفاق ہو سکتا ہے۔ اسی آسانی کے ساتھ کسی دستور و قانون کو خدائی دستور و قانون کی حیثیت سے قبول کر لینے پر اتفاق نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ پیچیدگی بھی سخت نہیں ہے کہ اس کو کسی طرح رفع کیا ہی نہ جا سکتا ہو۔

اب یہ بات تقریباً طے شدہ ہے کہ ملک تقسیم ہو جائیگا۔ ایک حصہ مسلمان اکثریت کے سپرد کیا جائیگا اور دوسرا حصہ غیر مسلم اکثریت کے زیر اثر ہو گا۔ پہلے حصہ میں ہم کوشش کریں گے کہ رائے عام کو ہموار کر کے اس دستور و قانون پر ریاست کی بنیاد رکھیں جسے ہم مسلمان خدائی دستور

وقانون مانتے ہیں۔ غیر مسلم حضرات وہاں ہماری مخالفت کرنے کے بجائے ہمیں کام کرنے کا موقع دیں اور دیکھیں کہ ایک بے دین قومی جمہوریت کے مقابلہ میں یہ خدا پرستانہ جمہوری خلافت، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایت پر قائم ہوگی، کہاں تک خود باشندگان پاکستان کے لئے اور کہاں تک تمام دنیا کے لئے رحمت وبرکت ثابت ہوتی ہے۔ دوسرے حصے میں آپ کی اکثریت اور ہماری اقلیت ہوگی۔ وہاں ہم آپ سے عرض کریں گے کہ خدارا دنیا کی بگڑی ہوئی قوموں سے وہ اصول نہ لیجئے جن کی وجہ سے وہ خود بھی خراب ہو رہی ہیں اور دنیا کو بھی خراب کر رہی ہیں۔ ان کے بجائے آپ پہلے یہ تین اصول مان لیجئے جن کو ہر زمانے میں خدا کے نیک بندے لے کر آئے ہیں، جنہیں آپ کے بزرگ بھی اسی طرح پیش کرتے تھے جس طرح ہمارے بزرگوں نے پیش کیا تھا۔ پھر اپنے بزرگوں کی تعلیمات میں تلاش کیجئے کہ ان اصولوں کے مطابق ایک ریاست — زمانہ حال کی ایک ترقی پذیر ریاست — کا نظام چلانے کے لئے کوئی مفصل ہدایت ملتی ہے یا نہیں۔ رام چندر جی، کرشن جی، بودھ مہاراج، گورونانک اور دوسرے تمام رشیوں اور منیوں کی تعلیم اور ان کی سیرتوں کا جائزہ لیجئے۔ ویدوں اور پرانوں اور شاستروں اور گرنتھوں کو دیکھئے اگر ان میں کوئی ہدایت آپ کو ملے تو ہم کہیں گے کہ آپ ہندوستان کی ریاست کا نظام اسی پر قائم کیجئے اور ہم سے وہی برتاؤ کیجئے جو آپ کا دین ہمارے لئے تجویز کرتا ہے۔ ہم اس نظام کی مزاحمت نہیں کریں گے

اسے کام کرنے کا پورا موقع دیں گے اور بغیر کسی تعصب کے یہ دیکھیں گے کہ آپ خدا پرستی، انسانیت اور خدا پرستانہ جمہوریت کی جو تعمیر پیش کرتے ہیں وہ کہاں تک ہندوستان کے لئے اور کہاں تک دنیا کے لئے رحمت و برکت کی موجب ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اگر آپ اپنے ہاں ایسا کوئی مفصل ہدایت نامہ نہ پائیں، تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ خدا نے آپ کے ہاں بھیجا نہیں تھا، بلکہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ اپنی طویل تاریخ کے انقلابات میں اسے یا اس کے ایک بڑے حصے کو آپ کھو بیٹھے ہیں۔ وہی چیز اسی خدا کی بھیجی ہوئی، ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس سے اوپرے نہیں، یہ آپ ہی کی کھوئی ہوئی چیز ہے جو ایک دوسرے ذریعہ سے آپ کے پاس واپس آئی ہے۔ آپ اسے پہچاننے کی کوشش کریں، اسے جانچیں، پرکھیں اور برت کر دیکھیں کہ اس میں واقعی آپ کی اور دنیا کی فلاح ہے یا نہیں۔

مطبوعات

مکتبہ جماعت اسلامی

کتاب	حصہ	قیمت
الجہاد فی الاسلام		۸/-/۰
رسالہ دینیات		۱/۸/۰
حقوق الزوجین		۱/۸/۰
مسئلہ قومیت		۱/۸/۰
مسئلہ جبر و قدر		۱/-/۰
سود		۲/۸/۰
تجدید و احیائے دین		۱/-/۰
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر		۱/۴/۰
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں		۱/۴/۰
سیاسی کشمکش	حصہ اول	۱/۴/۰
"	حصہ دوم	۲/۸/۰

سیاسی کشمکش	حصہ سوم	۲/۸/-
خطبات	نیا ایڈیشن	۳/-/-
پردہ		۲/۸/-
تنقیحات		۲/۸/-
تفہیمات		۳/۸/-
حقیقت شرک		۲/-/-
حقیقت توحید		۱/۲/-
حقیقت تقویٰ		-/۱۲/-
اسلام اور ضبط ولادت		۱/-/-
دستور جماعت اسلامی		-/۳/-
روداد جماعت اسلامی	حصہ اول	۱/-/-
"	حصہ دوم	-/۱۴/-
"	حصہ سوم	۲/-/-
"	حصہ پنجم	۲/-/-
"	حلقہ خواتین	-/۱۲/-
دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات		۲/۸/-
اشتراکیت اور اسلامی نظام		زیر طبع
اسلامی قانون		۱/-/-
سلامتی کا راستہ		-/۶/-

اسلام کا نظریۂ سیاسی	-/۸/۰
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے۔	-/۸/۰
انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	-/۸/۰
اسلام اور جاہلیت	-/۷/۰
اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	-/۶/۰
دین حق	-/۶/۰
نیا نظام تعلیم	-/۶/۰
مذہب کا انقلابی تصور	-/۶/۰
جہاد فی سبیل اللہ	-/۶/۰
شہادت حق	-/۶/۰
تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں	-/۶/۰
ایک اہم استفتا	-/۳/۰
اسلام کا نظام حیات	-/۱۰/۰
نشان راہ	-/۶/۰
ہندوستان میں تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل	-/۸/۰
اسلامی معاشیات کے اصول	-/۶/۰

انگریزی کتب

رسالہ دینیات	(انگریزی)	۳/۸/۰

اسلام کا نظریہ سیاسی	(انگریزی)	-/۱۲/-
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	"	-/۱۲/-
اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	"	-/۱۲/-
انسان کا معاشی مسئلہ	"	-/۱۲/
نیشنلزم اینڈ انڈیا	"	-/۱۲/-
الحاد کے بعد کیا؟	"	-/۱۲/-
اسلام کیا ہے؟	"	۱/۸/-

عربی کتب

اسلام کا نظریہ سیاسی	۱/-/-
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	۱/-/-
دین حق	۱/-/-

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور۔

نیا نظامِ تعلیم

از

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

مکتبہ جماعتِ اسلامی

ذیلدار پارک اچھرہ، لاہور۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی طابع و ناشر نے
طارق پرنٹنگ پریس ذیلدار روڈ
اچھرہ لاہور میں چھپوا کر مکتبہ جماعت
اسلامی ذیلدار پارک اچھرہ لاہور
سے شائع ہوا۔

نیا نظامِ تعلیم

یہ خطبہ ۵ جنوری ۳۱ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی انجمن الاصلاح طلبہ کے سامنے پڑھا گیا تھا

حضرات! خوش قسمتی سے آج مجھے اُس جگہ اپنے خیالات کے اظہار کا موقع مل رہا ہے جہاں موجودہ عہد میں سب سے پہلے اسلامی نظامِ تعلیم کی اصلاح کا خیال پیدا ہوا، اور سب سے پہلا قدم اس کی طرف اٹھایا گیا۔ اسی وجہ سے میں نے اس موقع کے لئے تعلیمی اصلاح ہی کے سوال کو اپنا موضوعِ بحث منتخب کیا ہے۔ میرے اس انتخاب میں ایک بڑا محرک یہ بھی ہے کہ اس وقت ہماری دینی درسگاہوں میں عموماً اصلاحِ تعلیم کے مسئلے پر گفتگو چھڑی ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ضرورت کا احساس تو پیدا ہو گیا ہے۔ مگر جس انداز سے یہ ساری گفتگو ہو رہی ہے اس سے صاف عیاں ہے کہ اصلاح کی خواہش کرنے والوں کے ذہن میں مسئلہ کی نوعیت کا کوئی واضح تصور نہیں ہے۔

لوگ اس گمان میں ہیں کہ پرانی تعلیم جو آج اپنی صورت میں ہے اس کا نصاب بہت
پرانا ہو گیا ہے۔ اور اس میں بعض علوم کا عنصر بعض علوم سے کم یا زیادہ ہے
اور جدید زمانہ کے بعض ضروری علوم اس میں شامل نہیں ہیں۔ اس لئے اصلاح
کی ساری بحث صرف اس حد تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے کہ کچھ کتابوں کو
نصاب سے خارج کر کے کچھ دوسری کتابوں کو داخل کر دیا جائے، اور اس تعلیمی
کے نصاب میں ترمیم ہو کہ بعض اجزا گھٹائے اور بعض بڑھائے جائیں، اور
قدیم علوم کے ساتھ تاریخ، جغرافیہ، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ علوم
کی بھی کچھ کتابیں طلبہ کو پڑھائی جائیں۔ ایسی ہی کچھ جزوی ترمیمات طرز تعلیم
اور انتظام مدارس میں بھی تجویز کی جاتی ہیں۔ اور بہت زیادہ روشن خیالی
پر جو لوگ اتر آتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ صاحب ہر مولوی کو میٹرک تک انگریزی
پڑھا دی جائے تاکہ کم از کم تار پڑھنے اور لکھنے کے قابل تو ہو جائے۔ لیکن یہ حقیقت
جو آج دکھائی جا رہی ہے، یہ سب بہت پرانی ہو چکی ہے۔ اس کی عمر اتنی ہی
ہے جتنی آپ کے دار العلوم ندوۃ العلماء کی عمر ہے۔ اس کا زیادہ سے زیادہ
فائدہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ پہلے سے کچھ زیادہ کامیاب
قسم کے مولوی پیدا ہو جائیں جو کچھ جرمنی اور امریکہ کی باتیں بھی کہنے لگیں
اس ذرا سی اصلاح کا یہ نتیجہ کبھی نہیں نکل سکتا کہ دنیا کی امامت و قیادت
کی باگیں علمائے اسلام کے ہاتھ میں آ جائیں اور وہ دنیا جو آج آگ کی طرف
چلانے والے ائمہ (Leaders) کے پیچھے چلی رہی ہے، جنت
کی طرف لے جانے والے ائمہ کی رہبری قبول کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ نتیجہ

اگر حاصل کرنا مقصود ہو تو آپ کو مکمل انقلابی اصلاحات کے لئے تیار ہونا پڑے گا۔
اور اس سارے نظامِ تعلیم کو اُدھیڑ کر از سرِ نو ایک دوسرا ہی نظامِ تعلیم بنانا
ہوگا۔ اس صحبت میں اسی نئے نظامِ تعلیم کا نقشہ میں آپ کے سامنے پیش
کرنا چاہتا ہوں۔

علم اور امامت کا رشتہ

سب سے پہلے یہ امر محتاجِ طلب ہے کہ دنیا میں امامت و قیادت
(Leader Ship) کا مدار آخر ہے کس چیز پر؟ کیا چیز ہے جس کی بنا
پر کبھی مصر امام بنتا ہے اور دنیا اس کے پیچھے چلتی ہے، کبھی بابل امام
بنتا ہے اور دنیا اس کی پیروی کرتی ہے، کبھی یونان امام بنتا ہے اور
دنیا اس کا اتباع کرتی ہے، کبھی اسلام قبول کرنے والی اقوام امام بنتی ہیں
اور دنیا ان کے نقشِ قدم پر ہو لیتی ہے، اور کبھی یورپ امام بنتا ہے اور
دنیا اس کی متبع بن جاتی ہے؟ پھر وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے امامت
آج ایک کو ملتی ہے، کل اس سے چھن کر دوسرے کی طرف چلی جاتی ہے،
اور پرسوں اس سے بھی سلب ہو کر تیسرے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے؟ کیا
یہ محض ایک بے ضابطہ اتفاقی امر ہے یا اس کا کوئی ضابطہ اور اصول مقرر
بھی ہے؟ اس مسئلہ پر جتنا زیادہ غور کیا جاتا ہے اس کا جواب یہی ملتا ہے کہ
ہاں اس کا ضابطہ ہے۔ اور وہ ضابطہ یہ ہے کہ امامت کا دامن ہمیشہ
علم سے وابستہ رہے گا۔ انسان کو بہ حیثیت ایک نوع کے زمین کی
خلافت ملی ہی علم کی وجہ سے ہے۔ اور جو جمع، تعمیر اور فوائد و [illegible]

چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو دوسری مخلوقات ارضی کو یا تو نہیں دی گئیں یا اس کی نسبت کمتر دی گئی ہیں۔ اس لئے وہ اس بات کا اہل ہوا کہ دوسری مخلوقات پر خداوند عالم کا خلیفہ بنایا جائے۔ اب خود اس نوع میں سے جو طبقہ یا گروہ علم کی صفت میں دوسرے طبقوں اور گروہوں سے آگے بڑھ جائے گا۔ وہ اسی طرح ان سب کا امام بنے گا جس طرح انسان من حیث النوع دوسری انواع ارضی پر اسی چیز کی وجہ سے خلیفہ بننے کا اہل ہوا ہے۔

تقسیم امامت کا ضابطہ

اس جواب سے خود بخود دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ علم سے مراد کیا ہے؟ اور اس میں آگے بڑھنے اور پیچھے رہ جانے کا مفہوم کیا ہے؟ اس مسئلہ کا حل سمع، بصر اور فواد ہی کے الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ کلام الٰہی میں یہ تینوں لفظ مجرد سننے، دیکھنے اور سوچنے کے معنی میں استعمال نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ سمع سے مراد دوسروں کی فراہم کردہ معلومات حاصل کرنا ہے۔ البصر سے مراد خود مشاہدہ کرکے واقفیت بہم پہنچانا ہے۔ اور فواد سے مراد ان دونوں ذرائع سے حاصل کی ہوئی معلومات کو مرتب کرکے نتائج اخذ کرنا ہے۔ یہی تینوں مل کر وہ علم بنتا ہے جس کی قابلیت انسان کو دی گئی ہے جس کے لحاظ اگر دیکھا جائے تو تمام انسان ان تینوں قوتوں سے کام لے رہے ہیں اور اسی وجہ سے مخلوقات ارضی پر خلیفانہ تسلط ہر انسان کو حاصل ہے۔ مزید زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھیے گا تو معلوم ہوگا کہ جو انسان انفرادی طور پر ان تینوں قوتوں سے کم کام لیتے ہیں وہ پست اور مغلوب رہتے ہیں انہیں تابع اور محکوم بن کر رہنا پڑتا ہے ان کا کام پیچھے چلنا ہوتا ہے بخلاف اس کے جو ان قوتوں سے زیادہ کام لیتے ہیں وہ برتر و

غالب ہوتے ہیں، متبوع اور مطاع بنتے ہیں، اور رہنمائی و پیشوائی انہی کے
حصے میں آتی ہے۔ مگر امامت ملنے اور چھننے کا ضابطہ معلوم کرنے کے لئے
آپ کو اس سے بھی زیادہ تفصیلی نگاہ ڈالنی ہوگی۔ اس تفصیلی نگاہ میں آپ
کو یہ حقیقت نظر آئے گی کہ ایک گروہ انسانوں کا امام اس وقت بنتا ہے
جب وہ ایک طرف ان معلومات کا زیادہ سے زیادہ حصہ جمع کرتا ہے جو ماضی
اور حال کے انسانوں سے حاصل ہو سکتی ہیں، دوسری طرف خود اپنے مشاہدے
سے مزید معلومات فراہم کرنے میں لگا رہتا ہے، تیسری طرف ان دونوں قسم
کی معلومات کو مرتب کرکے ان سے نتائج اخذ کرتا ہے، اور پھر ان نتائج
سے کام لیتا ہے۔ پہلے کی جو چیزیں غلط ـــ کم از کم اس کے اخذ
کردہ نتائج کے لحاظ سے غلط ـــ ثابت ہوتی ہیں ان کی اصلاح
کرتا ہے، پہلے کی جن چیزوں کا نقص ـــ کم از کم اس کے فہم کے لحاظ
سے ـــ اس پر کھلتا ہے ان کی تکمیل کرتا ہے، اور جو نئی چیزیں
علم میں آتی ہیں ان سے اپنی حد وسع تک زیادہ سے زیادہ کام لینے کی کوشش
کرتا ہے۔ یہ صفات جب تک اس گروہ میں تمام دوسرے انسانی گروہوں
سے زیادہ رہتی ہیں، وہی پوری نوع کا امام ہوتا ہے اور جو ان
صفات کے اعتبار سے کمتر ہوتے ہیں ان کے لئے اللہ کی مشیت تقدیر
یہ ہے کہ وہ اس کی اطاعت بھی کریں اور اتباع بھی ـــ اگر
قسمت کی یاوری نے اطاعت سے بچا بھی لیا تو ان کے لئے اتباع سے
تو کوئی مفر نہیں ہوتا، خواہ جان بوجھ کر بالارادہ کریں، خواہ بے جانے

بوجہ اضطرار اگریں ـــــ اس دورِ عروج کے بعد جب اس گروہ کے
زوال کا وقت آتا ہے تو وہ تھک کر اور اپنے کئے ہوئے کام کو کافی سمجھ
کر مشاہدہ سے مزید معلومات حاصل کرنے اور فواد سے مزید اخذِ نتائج کی
کوشش چھوڑ دیتا ہے۔ اور اس کا تمام سرمایۂ علمی صرف سمع سے حاصل
شدہ معلومات تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب اس کے لئے علم کے
معنی صرف یہ جاننے کے ہو جاتے ہیں کہ پہلے جو معلومات حاصل کی گئی
تھیں اور جو نتائج اخذ کئے گئے تھے وہ کیا تھے۔ اب وہ اس غلط
فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ جو علم پہلے حاصل کیا جا چکا ہے وہ کافی ہے۔ اس
میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں، پہلے جو نتائج اخذ کئے جا چکے ہیں وہ
صحیح ہیں، ان میں کسی اصلاح و ترقی کا موقع نہیں، پہلے جتنی تعمیر ہو
چکی ہے وہ مکمل ہے، نہ اس میں ترمیم ہی کی جا سکتی ہے اور نہ اس سے
آگے مزید تعمیر ہی ممکن ہے۔ اس مرحلہ پہ پہنچ کر یہ گروہ خود امامت سے
ہٹ جاتا ہے اور نہ ہٹنا چاہے تو زبردستی ہٹا دیا جاتا ہے۔ پھر جو
دوسرا گروہ مزید اکتسابِ علم، مزید اخذِ نتائج اور مزید تعمیرِ حیات کا عزم
لے کر آگے بڑھتا ہے امامت و قیادت اس کا حصہ ہوتی ہے۔ اور وہ
صاحب جو پہلے امام تھے اب مقتدی بنتے ہیں، جو پہلے مطاع و متبوع تھے
اب مطیع و تابع بنتے ہیں، جو پہلے جیتے جاگتے علم کے مالک اور دنیا کے
استاد بنے ہوئے تھے۔ اب عجائب خانۂ آثارِ قدیمہ میں بھیج دیئے جاتے
ہیں۔ تاکہ بیٹھے علومِ اوائل کی تشریح کرتے رہیں۔

موجودہ اسلامی نظامِ تعلیم کا بنیادی نقص

اس مختصر بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امامت، خواہ وہ آگ کی طرف لے جانے والی ہو یا جنت کی طرف، بہرحال اس گروہ کا حصہ ہے، جو سمع و بصر و فواد کو تمام انسانی گروہوں سے بڑھ کر استعمال کرے۔ یہ انسان کے حق میں اللہ کا بنایا ہوا اٹل ضابطہ ہے اور اس میں کوئی رو رعایت نہیں ہے۔ کوئی گروہ خواہ خدا شناس ہو یا ناخدا شناس، بہرحال وہ یہ شرط پوری کرے گا تو دنیا کا امام بن جائے گا اور نہ کرے گا تو مقتدی ہی نہیں بلکہ اکثر حالات میں مطیع بھی بننے سے نہ بچ سکے گا۔

آپ کو جس چیز نے امامت کے منصب سے ہٹایا اور ناخدا شناس اہلِ مغرب کو اس پر لا بٹھایا۔ وہ دراصل یہی ضابطہ ہے۔ آپ کے ہاں مدتہائے دراز سے علم کی جو حالت تھی اس میں بصر اور فواد دونوں معطل تھے، اور سمع کا کام بھی صرف پہلے کے حاصل شدہ معلومات فراہم کرنے تک محدود تھا۔ بخلاف اس کے ناخدا شناس یورپ علم کے میدان میں آگے بڑھا اور اس نے سمع سے بھی آپ سے بڑھ کر کام لیا اور بصر و فواد کا کام تو پچھلی ڈھائی تین صدیوں میں تمام تر اسی نے انجام دیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا اور یہی ہوا کہ وہ امام بن گیا اور آپ مقتدی بن کر رہ گئے۔ آپ کی دینی تعلیم کے تمام مراکز ابھی تک اپنی اسی غلطی پر اڑے ہوئے ہیں جس نے آپ کو اس درجہ پر پہنچایا ہے۔ ان کے ہاں علم محض علوم اوائل کے ٹھیلنے

تک محدود ہے۔ ندوہ اور ازہر نے اصلاح کی طرف قدم بڑھایا مگر اس کا ماحصل صرف اس قدر ہے کہ سمع کا دائرہ حالی کی معلومات تک بڑھا دیا جائے بصر اور فواد پھر بھی معطل کے معطل ہی رہے۔ اس علم کا فائدہ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ آپ گھٹیا قسم کے نہ سہی بڑھیا قسم کے مقتدی بن جائیں۔ امامت بہر حال آپ کو نہیں مل سکتی۔ اس وقت تک جتنی اصلاحی تجویزیں میری نظر سے گذری ہیں۔ وہ سب کی سب بہتر مقتدی ہی بنانے والی ہیں۔ امام بنانے والی کوئی تجویز ابھی تک نہیں سوچی گئی۔ حالانکہ دنیا کی واحد خداشناس جماعت ہونے کی وجہ سے آپ پر جو فرض عائد ہوتا ہے۔ اس کو آپ انجام نہیں دے سکتے۔ جب تک کہ آپ ناخداشناس لوگوں سے دنیا کی امامت کا منصب چھین کر خود اس پر قبضہ نہ کریں۔ اور اس کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ آپ مجرد سماعی علم پر قناعت کا خیال چھوڑ دیں اور بصر و فواد سے نہ صرف کام لیں بلکہ اس میں دنیا کے تمام گروہوں پر فوقیت لے جائیں۔

کِس قسم کی اصلاح درکار ہے۔

یہ جو میں نے عرض کیا کہ دنیا کی واحد خداشناس جماعت ہونے کی حیثیت سے آپ پر جو فرض عائد ہوتا ہے اس کو آپ انجام نہیں دے سکتے۔ جب تک یہ کام نہ کریں۔ یہ دراصل میری اس تمام بحث کا مرکزی نقطہ ہے۔ اس لئے میں اس کی مزید تشریح کروں گا۔ اگر محض ایک انسانی گروہ ہونے کی حیثیت سے مطلقاً امام بننے کا سوال ہوتا تب تو آپ

کو کسی اصلاحِ تعلیم یا تجدیدِ نظامِ تعلیمی کی ضرورت نہیں، سیدھا راستہ کھلا ہوا ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی، یا مصر و ایران و ٹرکی کی سرکاری یونیورسٹیوں کے طرزِ تعلیم کے میدان میں پیش قدمی فرمایئے اور اسی قسم کی امامت کے لئے امیدوار بن جایئے جیسی اس وقت یورپ اور امریکہ کو حاصل ہے اور جس کے لئے اب جاپان مسابقت کر رہا ہے مگر خدا شناس گروہ ہونے کی حیثیت سے آپ کی یہ پوزیشن نہیں ہے۔

آپ کی پوزیشن یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ محض اپنے لئے امامت چاہتے ہوں۔ خواہ وہ امامت داعیہ الی النار ہو یا داعیہ الی الجنۃ۔ یورپ سے آپ کا جھگڑا اس بات پر نہیں ہے کہ وہ دنیا کا امام نہ رہے اس کی جگہ آپ امام ہو جائیں۔ بلکہ اس سے آپ کا جھگڑا اصول اور مقصد کا جھگڑا ہے۔ وہ ناخدا شناسی بلکہ خدا سے بغاوت اور طغیان کی بنا پر دنیا کی امامت کر رہا ہے۔ اور آگ کی طرف ساری دنیا کو لئے جا رہا ہے۔ بخلاف اس کے آپ خدا شناس گروہِ انسانی ہیں۔ خدا کی اطاعت پر آپ کے مسلک کی بنیاد ہے۔ آپ کے ایمان کی رو سے آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ نہ صرف خود آگ کے راستے سے بچ کر جنت کے راستے پر جائیں بلکہ دنیا کو بھی اسی راستے پر چلائیں۔ اور یہ فرض آپ انجام نہیں دے سکتے جب تک کہ آپ اس سے امامت چھین کر خود امام نہ بنیں۔ یہاں سوال نسلی یا جغرافی نہیں خالص اصولی ہے۔ ناخدا شناسی کی امامت اگر ترک یا ایرانی یا مصری یا ہندوستانی کی ہو تو وہ بھی اسی طرح مٹا دینے کے قابل ہے جس طرح فرنگی یا جاپانی کی۔ اور خدا شناسی کی بنیاد پر جو امامت ہو وہی مطلوب ہے، خواہ اس کے علمبردار ہندی ہوں یا فرنگی ہوں یا

کوئی اور۔

ناخدا شناس امامت کے نتائج

کسی امامت کے داعی الی الجنۃ یا داعی الی النار ہونے کا مدار بالکل اس کے خدا شناس یا ناخدا شناس ہونے پر ہے۔ جب کوئی ایسا گروہ جو خدا شناس نہ ہو اپنے علمی اجتہاد کی بدولت دنیا کا امام بن جاتا ہے تو وہ تمام سعی و تجربی معلومات کو اس نقطۂ نظر سے جمع کرتا ہے اور اسی نقطۂ نظر کے مطابق انہیں مرتب کرتا ہے کہ اس کائنات کا کوئی خدا نہیں ہے۔ انسان محض ایک غیر مسئول (Irresponsible) ہستی ہے۔ دنیا کی جو چیزیں اس کے لئے مسخر ہیں وہ سب اس کی ملک ہیں۔ جن سے کام لینے کا مقصد اور طریقہ متعین کرنے میں وہ خود مختار محض ہے، اور اس کی تمام سعی و جہد کا منتہائے مقصود اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی خواہشات نفس کی خدمت کرے۔ معلومات کے اس اساس پر مرتب ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حکمت نظری اور حکمت عملی دونوں کا نشو و نما خدا پرستی کی بالکل مخالف سمت میں ہوتا ہے۔ یہی حکمت تمام دنیا کے قلوب و اذہان پر چھا جاتی ہے۔ اسی سے خالص مادہ پرستانہ اخلاقیات پیدا ہوتے ہیں، اسی پر انسان اور انسان کے درمیان تعلق کے تمام ضابطے بنتے ہیں، اسی کے مطابق انسان اپنی حاصل شدہ قوتوں کا مصرف متعین کرتا ہے، اور فی الجملہ ساری انسانی زندگی کا بہاؤ اس راستہ کی طرف چل پڑتا ہے۔ جس کی آخری منزلوں پر پہنچ کر اس دنیا ہی سے عذاب جہنم کی ابتدا ہو جاتی ہے جیسا کہ آج

آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ ناخدا شناس حکمت جب تک دنیا کے
افکار، اخلاق، تمدن، ہر چیز پر چھائی رہتی ہے، خدا شناسی کے نقطۂ نظر اور اس
اخلاق و تمدن کے لئے جو اس نقطۂ نظر پر مبنی ہو، زمین و آسمان کے درمیان کوئی جگہ
نہیں رہتی۔ لوگوں کے سوچنے کا انداز اس کے خلاف ہوتا ہے۔ طبائع کی افتاد
اور مزاجوں کی پسند اس کے خلاف ہوتی ہے۔ انسانی معلومات کی بگڑی ہوئی
ترتیب اس کے خلاف شہادت دیتی ہے۔ اخلاق کے سارے اصول اور قدر و
قیمت کے سارے معیار اس سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے تمام ضابطے
اور انسانی سعی و عمل کے سارے ہنگامے اس کو اپنے درمیان جگہ دینے سے
انکار کر دیتے ہیں۔ اور اس صورت حال میں صرف یہی نہیں ہوتا کہ خدا
پرستی کے مسلک کی ہر چیز دنیا میں نامقبول اور نامعقول ہو کر رہ جاتی ہے،
بلکہ خود وہ لوگ جو اس مسلک کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں، فی الواقع اس کی
پیروی کر نہیں سکتے، زندگی کے دریا کا بہاؤ زبردستی کھینچ کر ان کو اپنے رستے
پر لے جاتا ہے، اور اس کے خلاف زیادہ سے زیادہ کشمکش وہ بس اتنی ہی
کر سکتے ہیں کہ سر کے بل بہنے کے بجائے احتجاجاً پاؤں کے بل بہیں۔

جو گروہ خیالات کے میدان میں امام بنتا ہے اور کائنات فطرت کی طاقتوں کو
اپنے علم سے مسخر کر کے ان سے کام لیتا ہے اس کی امامت صرف خیالات ہی
کے عالم تک محدود نہیں رہتی۔ بلکہ زندگی کے پورے دائرے پر چھا جاتی ہے۔
زمین پر اس کا تسلط ہوتا ہے۔ رزق کی کنجیاں اس کے قبضہ میں ہوتی ہیں۔
حاکمانہ اختیارات اسے حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے انسانی حیات اجتماعی

کا سارا کاروبار اس ڈھنگ اور اس نقشے پر چلنے لگتا ہے جس پر وہ گروہ اپنی ذہنیت اور اپنے زاویۂ نظر کے مطابق اسے چلانا چاہتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ اگر وہ گروہ جس کو یہ تسلط دنیا اور اس کے معاملات پر حاصل ہے، خدا سے پھرا ہوا ہو، تو اس کے حیطۂ اقتدار میں رہتے ہوئے کوئی ایسا گروہ پنپ نہیں سکتا، جو خدا کی طرف پھرنا چاہتا ہو۔ جس گاڑی میں آپ بیٹھے ہوئے ہیں اگر اس کا ڈرائیور اسے کلکتہ کی طرف لے جا رہا ہو تو آپ کراچی کی طرف جا ہی کب سکتے ہیں۔ چار و ناچار آپ کو اسی طرف جانا پڑے گا جدھر ڈرائیور جانا چاہتا ہے۔ آپ بہت بگڑیں گے تو اتنا کر لیں گے کہ اسی گاڑی میں بیٹھے ہوئے اپنا رخ کلکتہ سے کراچی کی طرف پھیر لیں، اور برضا و رغبت نہ سہی کشاں کشاں اس منزل پر جا پہنچیں جو آپ کی منزل مقصود کے عین مخالف سمت میں واقع ہے۔

موجودہ صورت حال

یہ صورت حال فی الواقع اس وقت درپیش ہے۔ آپ کے امامت سے ہٹنے کے بعد یورپ نے علم کے میدان میں پیش قدمی کی تو ناگزیر اسباب سے اس کی نگاہ کا زاویہ خدا سے بیزاری (Theophobia) کی طرف پھیر دیا۔ اسی نقطۂ نظر سے اس نے تمام علمی معلومات کو جمع کیا، اسی نقطۂ نظر سے اس نے معلومات کو مرتب کر کے نتائج اخذ کیے، اسی نقطۂ نظر سے اس نے زندگی کے مقاصد، اخلاق کے اصول، تمدن کے ضوابط اور انفرادی و اجتماعی برتاؤ کے ڈھنگ متعین کیے، اور اسی نقطۂ نظر سے اس نے ان تمام قوتوں کے مصرف تجویز کیے جو اسے تحقیق و اجتہاد کی بدولت حاصل ہوئی تھیں۔ پھر جب اس علم کے

زور پر وہ اٹھا تو ایک طرف زمینیں کی زمینیں اور قومیں کی قومیں اس کے آگے مسخر ہوتی چلی گئیں، اور دوسری طرف وہی علم، وہی ذہنیت، وہی مقاصد، وہی خیالات، وہی فکری ساخت، وہی اخلاقی روش، وہی تمدنی قواعد وضوابط غرض وہی سب کچھ جو اس امام غالب کے پاس تھا، تمام دنیا پر چھا گیا۔ اب حال یہ ہے کہ ایک بچہ جب سے ہوش سنبھالتا ہے اسی وقت سے اس کے ذہن اور اس کی زندگی کی تعمیر اس نقشہ پر ہونے لگتی ہے جو یورپ کی امامت نے بنایا ہے۔ سبھی معلومات اسی ترتیب سے اس کے دماغ میں اترتی ہیں، مشاہدے کے لئے وہی نقطۂ نظر اسے ملتا ہے، نتائج اخذ کرنے کی ساری تربیت اسی طرز پر اسے حاصل ہوتی ہے، حق اور باطل، صحیح اور غلط، مقبول اور مردود کی تعیین کے لئے وہی معیار اسے میسر آتا ہے، اخلاق کے وہی اصول، زندگی کے وہی مقاصد اور سعی وعمل کے وہی راستے اس کے سامنے روشن ہوتے ہیں، اپنے گردوپیش زندگی کا سارا کارخانہ اسی ڈھنگ پر اسے چلتا ہوا ملتا ہے، اور جب وہ اس طرح پروان چڑھنے کے بعد کارگاہِ حیات میں حصہ لینے کے لئے تیار ہوتا ہے تو چونکہ یہی ایک مشین دنیا میں چل رہی ہے اور کوئی دوسری مشین چلنے والی موجود نہیں ہے۔ اس لئے اسی کا پرزہ اس کو بن جانا پڑتا ہے۔ ناخدا شناس تہذیب وتمدن کے اس کامل تسلط میں اول تو یہی سخت مشکل ہے کہ خدا پرستانہ نظریۂ حیات، مقصدِ زندگی اور اصولِ اخلاق کو دلوں اور دماغوں میں راہ مل سکے، کیونکہ علوم وفنون کی ساری ترتیب اور زندگی کی پوری روش اس کے بالکل برعکس

سمت میں پھری ہوئی ہے۔ لیکن اگر کچھ لوگ ایسے بھی نکل آئیں جن کے ذہن
میں یہ تخم جڑ پکڑ لے، تب بھی گرد و پیش کی پوری فضا اس کو نشو و نما دینے سے
انکار کر دیتی ہے۔ اس کو نہ کہیں علوم سے تائید ملتی ہے، نہ زندگی کے
بنے اور جمے ہوئے نقشے اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ نہ دنیا کے چلتے ہوئے
معاملات ہی میں کہیں اس کی جگہ نظر آتی ہے۔ جس قدر معلومات گذشتہ
پانسو برس کی مدت میں انسان کو حاصل ہوئی ہیں، ان کو مرتب کرنے اور
ان سے نتائج اخذ کرنے کا سارا کام ناخداشناس لوگوں نے کیا ہے۔ خدا
پرستی کے نقطۂ نظر سے ان کی ترتیب کا اور اخذ نتائج کا کوئی کام ہوا ہی
نہیں۔ فطرت کی جو طاقتیں اس دوران میں انسان کے لئے مسخر ہوئیں اور
قوتِ طبیعی کی مزید دریافت سے جو فوائد حاصل ہوئے ہیں ان سے بھی
خدا پرستوں نے نہیں بلکہ خدا کے باغیوں نے کام لیا۔ اس لئے ناگزیر تھا
کہ تمدنِ انسانی میں ان سب کا مصرف وہی مقرر ہوتا جو ان کے مقاصد
زندگی اور اصولِ اخلاق کے مناسب حال تھا۔ اسی طرح اجتماعی معاملات
کی تنظیم کے جتنے نظری خاکے اور عملی طریقے اس دوران میں سوچے اور عملاً
چلائے گئے ان سب کے سوچنے اور چلانے والے وہ دماغ اور وہ
ہاتھ نہ تھے جن پر خدا پرستی کا مسلک فرمانروا ہوتا، بلکہ وہ تھے جو خدا
کی اطاعت سے منحرف تھے۔ اس لئے نظریات اور عملیات کے میدان میں
آج سارے کے سارے وہی نقشے چھائے ہوئے ہیں جو انہوں نے بنائے
ہیں، اور ایسا کوئی نقشہ جو خدا پرستانہ مسلک کی بنیاد پر بنا ہو عملاً تو کیا

موجود ہوتا، نظریہ کی شکل میں بھی ایسی تفصیلی ترتیب کے ساتھ مرتب نہیں ہے جو آج
کے حالات سے ربط رکھتا ہو اور جس میں آج کے مسائل حیات کا پورا پورا حل
مل سکے۔ اب اگر اس مسلک پر اعتقاد رکھنے والا کوئی شخص راہب بن
کر دنیا اور اس کی زندگی سے الگ تھلگ کسی گوشے میں جا بیٹھے اور
پانسو برس پہلے کی فضا اپنے اوپر طاری کر لے تب تو بات دوسری ہے،
ورنہ اس دنیا کے معاملات میں ایک زندہ انسان کی حیثیت سے حصہ لینے
کی صورت میں تو قدم قدم پر اس کے لئے مشکلات ہی مشکلات ہیں۔ اپنے
مسلک میں نیک نیت اور صحیح الاعتقاد ہونے کے باوجود بارہا وہ نادانستہ
ان فکری اور عملی راہوں پر چل پڑتا ہے، جو اس کے مسلک سے بالکل متضاد
ہیں۔ نئی معلومات جب اس کے سامنے آتی ہیں تو اس کے لئے سخت دشوار
ہوتا ہے کہ حقائق (Facts) کو ان ناخدا شناس لوگوں کے
نقطۂ نظر اور اخذ کردہ نتائج سے الگ کر سکے جنہوں نے ان کی دریافت،
ترتیب اور استنتاج کا سارا کام انجام دیا ہے، اس لئے اکثر وہ اس
طرح حقائق کے ساتھ ان کے نظریات اور نتائج کو بھی ہضم کر جاتا ہے
کہ اسے اس امر کا شعور تک نہیں ہوتا کہ امرت کے ساتھ کتنا زہر اس
کے اندر اتر گیا، اسی طرح زندگی کے عملی معاملات سے جب اس کو واسطہ
پیش آتا ہے تو وہ سخت مشکل میں پڑ جاتا ہے کہ کونسی راہ اختیار کرے۔
بہت سے اجتماعی نظریات جو فی الاصل اس مسلک کے خلاف ہیں، اس کے
دل و دماغ پر زبردستی چھا جاتے ہیں، کیونکہ دنیا میں ہر طرف چلن ہی ان

کا ہے۔ بہت سے عملی طریقوں کو غلط سمجھنے کے باوجود محض اس بنا پر وہ اختیار کرتا ہے کہ ان سے ہٹ کر وہ کوئی دوسری راہ سوچ نہیں سکتا۔ اور بہت سی غلط راہوں پر اسے مجبوراً اس لئے چلنا پڑتا ہے کہ ان پر چلے بغیر کوئی چارۂ کار ہی نہیں ہے۔

انقلابِ امامت کے لئے انقلاب تعلیم ناگزیر ہے

حضرات! یہ ہے وہ صورت حال جس میں اس وقت آپ مبتلا ہیں۔ میں نے اس صورت حال کا جو تجزیہ کیا ہے، اگر اس میں کوئی غلطی آپ پاتے ہیں تو براہ کرم مجھے بھی اس سے آگاہ کریں تاکہ میں اس پر نظرثانی کر سکوں۔ لیکن اگر یہ تجزیہ صحیح ہے تو اس سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:۔

اوّلاً، ناخدا شناس ائمہ کی امامت میں رہ کر خدا شناسی و خدا پرستی کا مسلک زندہ نہیں رہ سکتا۔ لہٰذا جو کوئی اس مسلک پر اعتقاد رکھتا ہو اس کے عین ایمان و اعتقاد کا اقتضا یہ ہے کہ اس امامت کو مٹانے اور خدا شناس امامت کو دنیا میں قائم کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔

ثانیاً، جو نظامِ تعلیم محض پرانے سمعی علوم کی حد تک محدود ہے۔ اس میں یہ طاقت ہرگز نہیں ہے کہ امامت میں اتنا بڑا انقلاب کرنے کے لئے آپ کو تیار کر سکے۔ لہٰذا اگر آپ اس پر راضی ہوں کہ خدا پرستی کا مسلک بتدریج مٹتے مٹتے دنیا سے فنا ہو جائے تب تو شوق سے اسی نظامِ تعلیم پر چلتے رہیں، ورنہ اسے آپ کو بدلنا ہوگا۔

ثالثاً، جو نظام تعلیم تمام علوم کو اسی ترتیب اور اسی زاویۂ نظر سے لیتا ہے جو ناخدا شناس ائمہ کی ترتیب اور ان کا زاویۂ نظر ہے ۔ اور جو اس تمدنی مشین کا پرزہ بننے کے لئے انسانوں کو تیار کرتا ہے جو ائمۂ ضلال نے بنائی ہے، وہ دراصل ارتداد کا مجرب نسخہ ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی فریب نہیں ہو سکتا کہ اس نوعیت کی کسی تعلیم گاہ پر مسلم یونیورسٹی، یا اسلامیہ ہائی اسکول کے الفاظ کا اطلاق کیا جائے۔ اور اس تعلیم کے ساتھ دینیات کے کسی کورس کو الگ سے لا کر جوڑ دینا ۹۵ فیصدی تو بالکل ہی لاحاصل ہے، اور ۵ فی صدی فائدہ اگر اس سے حاصل ہو بھی سکتا ہے تو وہ بیش از یں نیست کہ لوگ کچھ مدت تک کفر کے راستے پر خدا کا نام لیتے ہوئے چلتے رہیں۔

رابعاً، اصلاح تعلیم کا یہ لائحہ کہ علوم اسلامی کے ساتھ نئے علوم کا جوڑ لگایا جائے، یہ بھی امامت میں انقلاب بپا کرنے کے لئے آپ کو تیار نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ فلسفہ، سائنس، تاریخ، سیاسیات، معاشیات اور دوسرے علوم جو اس وقت مدوّن و مرتب صورت میں آپ کو ملتے ہیں وہ سب کے سب ناخدا شناس لوگوں کی فکر و تحقیق کا نتیجہ ہیں اور ان کی ترتیب و تدوین میں اس گروہ کا نقطۂ نظر اس طرح پیوست ہے کہ حقائق واقعیہ کو نظریات اور اوہام و تعصبات اور اہواء و رجحانات سے الگ چھانٹ لینا اور خدا پرستی کے نقطۂ نظر سے ان کو بطور خود مرتب کر کے دوسرے نظریات قائم کرنا نہ ہر طالب علم کے بس کی بات

ہے نہ ہر استاد کے بس کی۔ اب اگر آپ ایک طرف پرانے علوم کو پرانی ترتیب کے ساتھ اور نئے علوم کو اس خاص ترتیب کے ساتھ جو اس وقت پائی جاتی ہے، ملا کر پڑھائیں گے تو ان دو متضاد طاقتوں کے میل سے عجیب عجیب قسم کے مرکبات پیدا ہوں گے۔ کوئی پرانے علوم سے مغلوب ہو گا، تو مولوی بن جائے گا۔ کوئی نئے علوم سے مفتوح ہو گا تو "مسٹریت" کی طرف چلا جائے گا۔ بلکہ "کامریڈیت" تک جا پہنچے گا۔ کوئی دونوں کے درمیان مذبذب ہو کر مضمحل ہو جائے گا۔ بہت ہی کم آدمی اس نظام تعلیمی سے ایسے نکل سکتے ہیں جو دونوں قسم کے علوم کو جوڑ کر کوئی صحیح مرکب بنا سکیں۔ اور ان کا بھی اس قدر طاقتور ہونا بہت مشکل ہے کہ اُٹھ کر خیالات اور زندگی کے دھارے کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیر دیں۔

یہ نتائج جو میں نے حالات کے تجزیہ سے اخذ کئے ہیں۔ اگر ان میں کوئی غلطی ہو تو میں پھر عرض کرتا ہوں کہ آپ مجھے اس سے آگاہ فرمائیں لیکن اگر ان نتائج کو بھی آپ تسلیم کرتے ہیں، تو اب میں کہتا ہوں کہ اس میں انقلاب کرنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ ان تینوں نظامات تعلیمی سے ہٹ کر ایک بالکل نیا نظام تعلیم بنایا جائے جس کا نقشہ ابتدائی تعلیم سے لے کر انتہائی مدارج تک تینوں سے مختلف ہو۔

نئے نظامِ تعلیم کا خاکہ

اس انقلابی اصلاح کی ضرورت ثابت کرنے کے بعد میں اس نظامِ تعلیم کا ایک خاکہ آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں :-

پہلی خصوصیت سب سے پہلی چیز جو اس نئے نظام میں ہونی چاہیئے ، وہ یہ ہے کہ دینی اور دنیوی علوم کی انفرادیت مٹا کر دونوں کو یک جان کر دیا جائے - علوم کو دینی اور دنیوی دو الگ الگ قسموں میں منقسم کرنا دراصل دین اور دنیا کی علیحدگی کے تصور پر مبنی ہے - اور یہ تصور بنیادی طور پر غیر اسلامی ہے - اسلام جس چیز کو دین کہتا ہے ، وہ دنیا سے الگ کوئی چیز نہیں ہے - بلکہ دنیا کو اس نقطۂ نظر سے دیکھنا کہ یہ اللہ کی سلطنت ہے ، اور اپنے آپ کو یہ سمجھنا کہ ہم اللہ کی رعیت ہیں ، اور دنیوی زندگی میں ہر طرح سے وہ رویّہ اختیار کرنا جو اللہ کی رضا اور اس کی ہدایت کے مطابق ہو ، اسی چیز کا نام دین ہے - اس تصوّرِ دین کا اقتضا یہ ہے - کہ تمام دنیوی علوم کو دینی علوم بنا دیا جائے - ورنہ اگر کچھ علوم دنیوی ہوں اور وہ خدا پرستی کے نقطۂ نظر سے خالی رہیں ، اور کچھ دوسرے علوم دینی ہوں اور وہ دنیوی علوم سے الگ پڑھائے جائیں ، تو ایک بچہ شروع ہی سے اس ذہنیت کے ساتھ پرورش پائے گا کہ دنیا کچھ

اور چیز کا نام ہے اور دین کسی اور چیز کا - اس کے لئے یہ دونوں دو مختلف عنصر ہوں گے اور ان کے درمیان توافق پیدا کر کے ایک ایسی ہموار زندگی بنانا اس کے لئے مشکل ہوگا جو اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَافَّةً کی مصداق ہو سکے۔

مثال کے طور پر اگر آپ تاریخ، جغرافیہ، طبیعات، کیمیا، حیاتیات (Biology) حیوانیات (Zoology) ارضیات (Geology) ریاضی، ہیئت (Astronomy) معاشیات (Economics) سیاسیات اور دوسرے تمام علوم ایک شخص کو اس طرح پڑھاتے ہیں کہ اول سے آخر تک کسی جگہ خدا کا نام نہیں آتا، نہ آفاق و انفس کے آثار پر اس حیثیت سے نظر ڈالی جاتی ہے کہ یہ آیاتِ الٰہی ہیں، نہ قوانین طبعی کا ذکر اس حیثیت سے کیا جاتا ہے کہ یہ ایک حکیم کے بنائے ہوئے قوانین ہیں، نہ واقعات کی توجیہ اس حیثیت سے کی جاتی ہے کہ ان میں کسی قادر و توانا کا ارادہ کام کر رہا ہے، نہ عملی علوم میں اس مقصد کا کہیں نشان پایا جاتا ہے کہ ان سے خدا کی رضا کے مطابق کام لینا ہے۔ نہ معاملاتِ زندگی کی بحث میں اس ضابطہ کا کہیں بیان آتا ہے جو ان کو چلانے کے لئے خدا نے بتایا ہے، نہ سرگذشت حیات میں اس کے الٰہی مبدا و غایت کی بحث کسی جگہ آتی ہے تو علوم کے اس پورے مجموعہ سے اس کے ذہن میں دنیا اور اس کی زندگی کا جو تصور پیدا ہوگا وہ خدا کے تصور

سے بالکل خالی ہوگا، ہر چیز سے اس کا تعارف خدا کے بغیر ہوگا، اور ہر معاملہ میں وہ اپنا راستہ خدا اور اس کی رضا سے الگ بنائے گا۔ پھر جب تمام شعبوں سے یہ نقطۂ نظر اور معلومات کی یہ ترتیب لئے ہوئے ایک شعبہ میں جاکر وہ الگ سے خدا کا ذکر سنے گا، اور ان مقاصدِ زندگی اور ان قوانین اخلاقی اور ان ضوابط شرعی کی تعلیم حاصل کرے گا۔ جنہیں آپ دینیات کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، تو اس کی سمجھ میں نہ آئے گا کہ اس نقشہ میں خدا کو اور اس سے تعلق رکھنے والی ان ساری چیزوں کو کہاں جگہ دوں۔ پہلے تو اسے خدا کی ہستی کا ثبوت ہی درکار ہوگا۔ پھر وہ اس بات کا ثبوت مانگے گا کہ مجھے اس کی ہدایت درکار بھی ہے۔ اور اس کے پاس سے ہدایت آتی بھی ہے یا نہیں۔ اور ان سب باتوں کے بعد بھی اس کے لئے اپنی دنیوی معلومات کو اس نئی چیز کے ساتھ یکجاں کر کے ایک ہمرنگ نقشہ بنانا مشکل ہوگا۔ وہ خواہ کتنا ہی پختہ ایمان لے آئے۔ مگر بہر حال اس کے لئے دین عین اس کی زندگی نہ ہوگا بلکہ زندگی کا ایک ضمیمہ ہی بن کر رہ جائے گا۔

یہ ساری خرابی دینی اور دنیوی علوم کی تقسیم کا نتیجہ ہے۔ اور جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، یہ تقسیم بالکل اسلامی نقطۂ نظر کے خلاف ہے۔ نئے نظامِ تعلیم میں دینیات کے الگ کورس کی ضرورت نہیں، بلکہ سارے کورس کو دینیات کے کورس میں تبدیل کر دینا چاہیے۔ شروع ہی سے ایک بچہ کو دنیا سے اس طرح روشناس کرایئے

کہ گویا وہ خدا کی سلطنت میں ہے، اس کے اپنے وجود میں اور تمام آفاق میں خدا کی آیات پھیلی ہوئی ہیں، ہر چیز میں وہ خدا کی حکمت اور قدرت کے آثار دیکھ رہا ہے۔ اس کا اور ہر شئے کا براہ راست تعلق خداوند عالم سے ہے جو آسمان سے زمین تک تمام معاملات دنیا کی تدبیر کر رہا ہے۔ دنیا میں جتنی قوتیں اس کو حاصل ہیں اور جو اشیاء اس کے لئے مسخر ہیں، سب کی سب خدا نے اس کو دی ہیں، ان سب سے خدا کی مرضی کے مطابق اور اس کے بتائے ہوئے طریقہ پر اسے کام لینا ہے اور اپنے اس کام کی جواب دہی خدا کے سامنے اس کو کرنی ہے۔

ابتدائی مراحل میں تو کوئی دوسرا نقطۂ نظر طالب علم کے سامنے آنا ہی نہیں چاہیئے۔ البتہ بعد کے مراحل میں تمام علوم اس کے سامنے اس طرح آنے چاہئیں کہ معلومات کی ترتیب، حقائق کی توجیہ اور واقعات کی تعبیر تو بالکلیہ اسلامی نقطۂ نظر سے ہو، مگر اس کے مخالف تمام دوسرے نظریات بھی پوری تنقید و تنقیح کے ساتھ اُس حیثیت سے اس کے سامنے رکھ دیئے جائیں کہ یہ ضَالِّین اور مَغضُوبِ عَلَیہِم کے نظریات ہیں، اسی طرح عملی زندگی سے تعلق رکھنے والے جملہ علوم کی بنیاد میں تو مقصدِ حیات، اصولِ اخلاق اور مناہج عمل اسلام کے پیوست کئے جائیں اور دوسروں کے اصول اور طریقے اس حیثیت سے طالب علم کو پڑھائے جائیں کہ ان کی فکری اساس، منزلِ

مقصود اور راہِ عمل اسلام سے کتنی اور کس کس پہلو سے مختلف ہے۔ یہ طریقہ ہے تمام علوم کو دینی علوم میں تبدیل کرنے کا، اور جب اس طریقہ سے تعلیم دی جائے تو ظاہر ہے کہ اس میں دینیات کے لئے کسی علیحدہ کورس کی کوئی حاجت ہی پیش نہیں آسکتی۔

دوسری خصوصیت دوسری اہم خصوصیت جو اس نظامِ تعلیمی میں ہونی چاہیئے وہ یہ ہے کہ اس میں ہر طالب علم کو مجموعۂ علوم بنانے اور تکمیل کے بعد ہر ایک کو "مولانا" اور ہر ایک کو جملہ مسائل میں فتویٰ کا مجاز قرار دینے کا وہ طریقہ جو اب تک رائج ہے ختم کر دیا جائے اور اس کی جگہ اختصاصی تعلیم کا وہ طریقہ اختیار کیا جائے جو سالہا سال کے تجربات کے بعد دنیا میں مفید پایا گیا ہے۔ انسان کا علم اب اتنی ترقی کر چکا ہے، اور اتنے شعبے اس میں پیدا ہو گئے ہیں کہ کسی ایک شخص کا ان سب کو پڑھنا محال ہے، اور اگر تمام علوم میں محض معمولی سی شد بد اسے کرا دی جائے تو وہ کسی شعبۂ علم میں بھی کامل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بجائے بہتر یہ ہے کہ پہلے آٹھ یا دس سال کا کورس ایسا رکھا جائے کہ ایک بچے کو دنیا اور انسان اور زندگی کے متعلق جتنی معلومات کم سے کم حاصل ہونی ضروری ہیں وہ اس کو خالص اسلامی نقطۂ نظر سے دے دی جائیں۔ اس کے ذہن میں کائنات کا وہ تصور بیٹھ جائے جو مسلمان کا تصور ہونا چاہیئے۔ زندگی کا وہ خاکہ

جم جائے جو ایک مسلمان کی زندگی کا ہونا چاہیئے۔ عملی زندگی کے متعلق وہ تمام معلومات اسے حاصل ہو جائیں جن کی ایک آدمی کو ضرورت ہوتی ہے اور وہ ان سب چیزوں کو ایک مسلمان کے طریقے پر برتنے کے لئے تیار ہو جائے اسے اپنی مادری زبان بھی آجائے عربی زبان بھی وہ اتنی جان لے کہ آگے مزید مطالعہ میں اسے مدد مل سکے اور کسی ایک یورپین زبان سے بھی واقف ہو جائے تاکہ معلومات کے اس وسیع ذخیرے سے فائدہ اٹھا سکے جو ان زبانوں میں موجود ہے۔ اس کے بعد اختصاصی تعلیم کے الگ کورس ہوں جن میں چھ یا سات سال کی محققانہ تربیت حاصل کر کے ایک طالب علم اس شعبۂ علم کا ڈاکٹر قرار دیا جائے جس کی تعلیم اس نے حاصل کی ہے۔ مثال کے طور پر میں چند شعبوں اور ان کے طریق تعلیم کی تشریح کروں گا جس سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ میرے ذہن میں اس اختصاصی تعلیم کا کیا نقشہ ہے۔

ایک شعبہ فلسفہ اور علوم عقلیہ کے لئے مخصوص ہونا چاہیے، اس شعبہ میں طالب علم کو پہلے قرآن کا علم پڑھا دیا جائے تاکہ اس ذریعہ سے وہ معلوم کرے کہ انسانی حواس سے جو چیزیں محسوس ہوتی ہیں ان کی تہ میں حقائق کی جستجو کرنے کی کیا سبیل ہے، عقل انسانی کی رسائی کہاں تک ہے اور کن حدود سے وہ محدود ہے، مجرد استدلال پر تخیلات کی عمارت کھڑی کرنے میں کس طرح انسان واقعات اور

حقیقت کی دنیا سے الگ ہو کر خیالات کی تاریک دنیا میں گم ہو جاتا ہے،
مابعد الطبیعی امور کے متعلق کتنا علم انسان کے لئے فی الواقع ضروری
ہے، اس ضروری علم تک پہنچنے میں مشاہدہ (OBSERVATION) اور
استقراء (Induction) سے کس طرح کام لینا چاہیئے، کن امور
مابعد الطبیعی کا تعین ہم کر سکتے ہیں، کن کے متعلق ایک مجمل اور
مطلق حکم سے آگے ہم نہیں بڑھ سکتے، اور کہاں پہنچ کر اجمال کو تفصیل
سے بدلنے یا اطلاق کو تقیید میں تبدیل کرنے کی کوشش نہ صرف بے بنیاد
ہو جاتی ہے بلکہ انسان کو تخیلات لاطائل کی بھول بھلیوں میں بھٹکا دیتی
ہے۔ اس بنیاد کو مستحکم کر لینے کے بعد طالب علم کو تاریخ فلسفہ کا مطالعہ
کرایا جائے اور یہاں قرآنی فلسفہ کی مدد سے اس کو تمام مذاہب فلسفہ
کی سیر کرا دی جائے تاکہ وہ خود دیکھ لے کہ حقائق تک پہنچنے کے جو
ذرائع انسان کو دئے گئے تھے ان سے کام نہ لے کر یا ان سے غلط طریقہ
پر کام لے کر کس طرح انسان بھٹکتا رہا ہے، کس طرح اس نے اوہام کو
حقیقت سمجھا اور اس سے کس طرح اس کی زندگی متاثر ہوئی، کس طرح
اس نے اپنی پہنچ سے ماوراء چیزوں کے متعلق رجماً بالغیب حکم
لگائے اور اس کے کیا اثرات زندگی پر مترتب ہوئے، کس طرح اس نے
اپنے حواس اور اپنی عقل کی حدود کا تعین کئے بغیر ان حقیقتوں کا تعین
کرنے میں اپنا وقت ضائع کیا جن کا تعین اس کے بس کی چیز ہی نہ
تھا، کہاں ہندو فلسفیوں نے ٹھوکر کھائی کہاں سے یونانی فلسفہ بھٹکا۔

کدھر مسلمان فلاسفہ قرآن کی بتائی ہوئی راہوں سے ہٹ کر نکل گئے۔ اور متکلمین کے مختلف اسکولوں نے صدیوں تک جن مسائل پہ بحثیں کیں ان میں قرآن کی رہنمائی سے کہاں کہاں اور کتنا کتنا تجاوز ہوا فلسفیانہ تصوف کے مختلف مذاہب نے عمل کو معطل اور مطلق کو مقید بنانے کی کس کس طرح کوششیں کیں اور وہ کس قدر غلط تھیں، یورپ میں فلسفیانہ "تفکر" نے کیا کیا راہیں اختیار کیں، ایک ہی حقیقت کی جستجو میں کتنے مختلف مذہب بن گئے، ان مختلف مذاہب میں حق کتنا ہے اور باطل کی آمیزش کتنی ہوئی اور کن راہوں سے آئی، کون سے مابعد الطبیعی تصورات ہیں جنہوں نے یورپ میں جڑ پکڑ لی ہے، ان سے اخلاق و اعمال پہ کیا اثرات مترتب ہوئے ہیں اور اگر کتاب اللہ کی رہنمائی سے فائدہ اٹھایا جاتا تو فضول دماغی کاوشوں میں وقت ضائع کرنے اور غلط بنیادوں پہ زندگی کی تعمیر کرنے سے کس طرح دنیا بچ سکتی تھی۔ اس تمام مطالعہ کے بعد طالب علم اپنی تحقیق کے نتائج مرتب کرے اور جب اہل علم کی جرح و تنقید کے بعد وہ اپنا کامل الفن ہونا ثابت کر دے تو اس کو فلسفہ میں فضیلت کی سند دے کر چھوڑ دیا جائے۔

ایک دوسرا شعبہ تاریخ کا ہونا چاہیئے جس میں قرآن کا فلسفۂ تاریخ، معتمد مطالعہ تاریخ، اور طرز مطالعہ تاریخ طالب علم کے ذہن نشین کرایا جائے تاکہ اس کے قلب سے تمام تعصبات نکل جائیں، وہ حقائق

کو یک رنگ نگاہ سے دیکھنے اور ان سے بے لاگ نتائج اخذ کرنے کے لئے مستعد ہو جائے۔ نوع انسانی کی سرگذشت اور تہذیب انسانی کے نشو و ارتقا کا مطالعہ کر کے انسان کی فلاح و خسران اور سعادت و شقاوت اور عروج و زوال کے مستقل اصول مستنبط کرے۔ تلک الایام نداولھا بین الناس جس ڈھنگ پر اور جس ضابطہ کے مطابق ہوتی ہے اسے معلوم کرے، جو اوصاف انسان کو اوپر اٹھاتے ہیں اور جو اسے نیچے گرا دیتے ہیں۔ ان سے واقف ہو، اور خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لے کہ کس طرح فطرت کا ایک خط مستقیم ابتدا سے آج تک سیدھا کھنچا ہوا نظر آتا ہے جو انسان کی ترقی کا اصلی راستہ ہے اس خط سے ہٹ کر جو بھی دائیں یا بائیں جانب دور نکل گیا اسے یا تو ٹھوکر کھا کر اسی کی طرف پلٹنا پڑا ورنہ پھر ایسا پھینکا گیا کہ اس کا پتہ نشان نہ ملا۔ اس طرز مطالعہ سے جب طالب علم کو معلوم ہو جائے گا کہ خدا کا قانون کس قدر بے لاگ ہے اور کیسی غیر جانبداری کے ساتھ اس نے قوموں سے معاملہ کیا ہے، تو کوئی قوم بھی نہ اس کی چہیتی رہے گی اور نہ کسی کے خلاف اس کے دل میں نفسانی عداوت کا جذبہ رہے گا۔ جس قوم کے کارنامے پر بھی وہ نظر ڈالے گا بے لاگ طریقہ پر ڈالے گا۔ اور فلاح و خسران کے ابدی اصولوں کی کسوٹی پر کس کر کھرے کو الگ اور کھوٹے کو الگ کر کے سامنے رکھ دے گا۔ اس تربیت ذہنی کے بعد اسے تاریخی دستاویزوں اور آثار قدیمہ اور ماخذ اصلیہ سے

بطورِ خود نتائج اخذ کرنے کی مشق کرائی جائے اور اتنا تیار کر دیا جائے کہ وہ جاہلی مورخین کے چڑھائے ہوئے رنگوں سے اصل حقائق کو الگ کر کے خود بے لاگ رائیں قائم کر سکے۔

ایک اور شعبہ علوم عمرانی (Social Sciences) کا ہونا چاہیئے، جس میں پہلے قرآن اور حدیث سے انسانی تمدن کے بنیادی اصول بتائے جائیں۔ پھر تفصیل کے ساتھ اصول سے فروع کا استنباط کر کے اور انبیاءؑ کی راہنمائی میں جو تمدن بنے تھے ان کے نظائر سے استشہاد کرتے ہوئے یہ بتایا جائے کہ ان قواعد اصلیہ (Fundamental Principles) پر کس طرح ایک صالح نظامِ معاشرت، نظام معیشت، نظام سیاست، تدبیر مملکت، اور تعلقات بین الاقوامی کی عمارت اُٹھتی ہے۔ پھر یہ بتایا جائے کہ کس طرح انہی اصولوں پر اس عمارت کی مزید توسیع ہو سکتی ہے اور اجتہاد سے توسیع کا نقشہ مرتب کرنے کا کیا طریقہ ہے، اور انسانی علم کی ترقی سے جو نئی قوتیں دریافت ہوتی ہیں اور تمدن کے فطری نشوونما سے جو نئے طرز عمل پیدا ہوتے ہیں ان سب کو اللہ کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے اس صالح تمدن میں جذب کرنے اور اپنے اپنے ٹھیک مقام پر رکھنے کی کیا صورت ہے۔ اس کے بعد ایک طرف طالب علم کو پچھلی قوموں اور مسلمانوں کی تمدنی تاریخ کا مطالعہ کرایا جائے تاکہ وہ دیکھے کہ تمدن کے ان اساسی

اصولوں اور الٰہی حدود کے قریب رہنے، اور ان سے انحراف کرنے سے کیا نتائج رونما ہوتے ہیں، اور دوسری طرف اسے دورِ جدید کے سیاسی، معاشی، اجتماعی نظریات و عملیات کا تنقیدی مطالعہ کرایا جائے تاکہ وہ یہ بھی دیکھ لے کہ انسان نے الٰہی ہدایت سے بے نیاز بن کر بطور خود اپنی زندگی کے لئے جو راستے تجویز کئے ہیں وہ کہاں تک اس کے لئے موجب سعادت یا شقاوت ہیں۔

سائنس کی مختلف شاخوں کے لئے چند شعبے علیحدہ ہونے چاہئیں جن میں قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اٹھا کر نہ صرف اب تک کی جمع شدہ سائنٹیفک معلومات کا جائزہ لیا جائے بلکہ آثارِ فطرت کے مزید مشاہدہ اور قوانینِ فطرت کی مزید دریافت کا کام بھی ان ہی خطوط پر کیا جائے جو قرآن نے کھینچ دئے ہیں۔ اگرچہ یہ کتاب سائنس کی کتاب نہیں ہے نہ اس کے موضوع کا براہ راست سائنس سے کوئی تعلق ہے، لیکن چونکہ یہ اسی مصنف کی تصنیف ہے جس نے کائنات کو تصنیف کیا ہے اور وہ مصنف اپنی ایک کتاب سے دوسری کتاب میں جگہ جگہ استدلال و استشہاد کا کام لیتا ہے، اس لئے اس کے گہرے مطالعہ سے سائنس کے ایک طالب علم کو نہ صرف نظامِ کائنات کا بنیادی خاکہ معلوم ہو جاتا ہے، بلکہ قریب قریب ہر شعبہ علم میں اسے ایک صحیح نقطۂ آغاز (Starting Point) اور تلاش و تجسس کے لئے ایک صحیح رخ (Direction) بھی مل جاتا ہے۔ یہ وہ شاہ

کلید (Master Key) ہے جس سے تحقیق کا سیدھا راستہ صاف کھل جاتا ہے۔ جس کی مشکل کشائی سے اگر آدمی کام لے تو اس کا بہت سا وقت گتھیوں کے سلجھانے سلجھانے خود الجھ جانے میں ضائع نہ ہو۔ موجودہ سائنس کی گمراہی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ وہ حقائقِ واقعیہ کے مشاہدے کی حد تک تو ٹھیک رہتا ہے، مگر جب ان حقائق کو جوڑ کر ان سے نظریات بناتا ہے تو کائنات فطرت کے مبداء و غایت سے ناواقف ہونے کے باعث ٹھوکریں کھاتا چلا جاتا ہے، اور اس سے نہ صرف بہت سی انسانی قوت فضول ضائع ہوتی ہے، بلکہ ان غلط نظریات کو جب انسانی تمدن میں جذب کر کے عملیات کی بنیاد اٹھائی جاتی ہے تو وہ فسادِ تمدن کی موجب ثابت ہوتی ہے قرآن کی رہنمائی میں جب ایک مسلم سائنٹسٹ ثابت شدہ حقائق کو نظریات سے الگ کر کے مرتب کرے گا اور سرمایہ حقائق دریافت کر کے ان سے بہتر نظریات نکال کر بتائے گا کوئی وجہ نہیں کہ دنیا ان سائنٹیفک گمراہیوں کو چھوڑنے پر مجبور نہ ہو جائے جن میں آج وہ مبتلا ہے۔

جن علوم کو اس وقت علوم دینی کہا جاتا ہے۔ ان کے لیے بھی الگ الگ شعبے مخصوص ہونے چاہئیں۔ مثلاً ایک شعبہ قرآن کے تحقیقی مطالعہ کا ہو جس میں پچھلے مفسرین کے کام کا جائزہ لینے کے بعد آگے مزید کام کیا جائے، مختلف پہلوؤں سے قرآن کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش

کی جائے اور علوم انسانی کے تمام شعبوں سے استفادہ کر کے قرآن میں مزید بصیرت حاصل کی جائے۔ اسی طرح ایک شعبہ علوم حدیث کا ہونا چاہیئے جس میں قدیم محدثین کے کام سے پورا فائدہ اٹھانے کے بعد حدیث میں تحقیق، تنقید، ترتیب معلومات اور اخذ نتائج کا مزید کام کیا جائے، دورِ سعادت کے متعلق زیادہ سے زیادہ تفصیلات ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالی جائیں، اور ان سے وہ نتائج اخذ کیے جائیں جو اب تک ہمارے علم سے مخفی ہیں۔ ایک شعبہ قانون کا ہونا چاہیئے جس میں قرآن کے احکام، حدیث نبوی کی قولی و عملی تشریحات، صحابۂ کرام اور تابعین کے اجتہادات اور آئمہ مجتہدین کے طرز استنباط اور جزئیات میں ان کی تصریحات کا مفصل تحقیقی مطالعہ کیا جائے، نیز دنیا کی دوسری پرانی اور نئی قوموں کے قوانین اور قانونی نظامات پر بھی گہری نظر رکھی جائے اور زندگی کے روز بروز بدلنے والے معاملات و مسائل پر اصول قانون اسلامی کو منطبق کر کے فقہ کے ان چشموں کو پھر سے رواں کیا جائے جو صدیوں سے سوکھ کر رہ گئے ہیں۔ یہ شعبے نہ صرف بجائے خود بہت عظیم الشان کام انجام دیں گے، بلکہ دوسرے تمام شعبوں کو بھی کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے متعلق ان ہی سے وہ مواد ملے گا جس کی بنیاد پر علم کی تمام راہوں میں تحقیق و اکتشاف کا کام چلایا جائے۔

تیسری خصوصیت

میں نے یہ چند شعبے محض تمثیلاً بیان

گئے ہیں جن سے پورے نقشے کی تفصیلات کا تصور بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ اب میں اس نئے نظامِ تعلیمی کی آخری مگر نہایت اہم خصوصیت کا ذکر کروں گا، اور وہ یہ ہے کہ اس میں وہ بے مقصد تعلیم نہیں ہوگی جو آج کل ہندوستان میں دی جا رہی ہے، بلکہ اس میں تعلیم دینے والے اور تعلیم پانے والے، دونوں کے سامنے ایک متعین اور واضح مقصد زندگی اور منتہائے سعی و عمل ہوگا یعنی یہ کہ ان سب کو مسلکِ خداپرستی کی امامت دنیا میں قائم کرنے کے لئے جہادِ کبیر کرنا ہے۔ یہ مقصد اس نظام کی ہر چیز میں اسی طرح کام کرے گا جس طرح انسانی جسم کے ہر رگ اور ہر ریشے اور ہر حرکت میں اس کی روح کام کرتی ہے۔ طلبہ کی شخصی زندگی، ان کے باہمی اجتماعات، ان کے کھیل کود اور تفریحات اور ان کے درس و تدریس اور مطالعہ و تحقیق کے تمام مشاغل میں اسی مقصد کی کارفرمائی ہوگی، اسی کے مطابق ان کی سیرت و کردار کی تعمیر کی جائے گی، اسی پر ان کے اخلاق ڈھالے جائیں گے، اور تمام ماحول ایسا بنایا جائے گا کہ ہر شخص کو ایک مجاہد فی سبیل اللہ میں تبدیل کر دے۔

متوقع نتائج

اس قسم کی تربیت اور اس قسم کی تعلیم پا کر جو لوگ تیار ہوں گے

ان میں یہ طاقت ہوگی کہ ان واقعات کی رفتار بدل دیں۔ ان کی محققانہ تنقید جاہلیت کے علوم اور جاہلی تہذیب کی ساری بنیادوں کو ہلا دے گی۔ ان کے مدوّن کئے ہوئے علوم میں اتنا زور ہوگا کہ جو لوگ آج جاہلیت کے نقطۂ نظر پر جمے ہوئے ہیں ان کو وہ اسلامی نقطۂ نظر کی طرف پھیر لائیں گے۔ ان کی تحقیق کے نتائج یورپ اور امریکہ اور جاپان تک کو متاثر کر دیں گے اور ہر طرف سے معقول انسان ان کے نظریات کی طرف کھنچے چلے آئیں گے۔ ان کا مرتب کیا ہوا نظریۂ حیات اور لائحہ زندگی اتنی قوت کے ساتھ فکر و نظر کی دنیا پر چھا جائے گا کہ عمل کی دنیا میں اس کے خلاف کسی دوسرے لائحہ زندگی کا چلنا مشکل ہوگا۔ پھر اسی تعلیم سے اس سیرت اور اس عزم کے لوگ پیدا ہوں گے جو امامت کے نظام میں عملاً انقلاب کے فن کو بھی جانتے ہوں گے۔ ان میں اس کے برپا کرنے کا مضبوط داعیہ بھی ہوگا۔ اور انہیں اپنی انقلابی تحریک کو خالص اسلامی راہوں پر چلانا بھی آتا ہوگا۔ پھر انہی میں یہ اہلیت بھی ہوگی کہ کامیابی کی منزل پر پہنچ کر اسلامی اصول کے مطابق ایک اسٹیٹ ایک مکمل نظام تمدّن کے ساتھ بنا کھڑا کریں جس کی شکل اور روح اسلامی ہو۔ اور جو دنیا میں امامت کرنے کی پوری طاقت و صلاحیت رکھتا ہو۔

عملی مشکلات

حضرات! اس مرحلہ پہ پہنچ کر تین کٹھن سوالات سامنے آتے ہیں اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے یہ معروضات سننے کے دوران میں ان سوالات نے آپ کے دلوں میں خلش پیدا کرنی شروع کی ہوگی۔

نصاب اور معلّمین کی تیاری

پہلا سوال یہ ہے کہ یہ نیا نظام قائم کیسے کیا جائے گا۔ جب کہ اس نئے طرز پر نہ تو پڑھانے والے ہی اس وقت کہیں مل سکتے ہیں اور نہ ایسی کتابیں ہی موجود ہیں جن سے کسی ایک شعبۂ علم کی تعلیم بھی اس نقشہ کے مطابق دی جا سکے؟ بلکہ شاید مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ پہلی جماعت کے بچّے کو بھی اس طرز کی تعلیم دینے کے لئے کسی مدرس اور کسی کتاب کا ملنا اس وقت مشکل ہے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ جس طرح سے ایک عمارت بنانے کے لئے بھٹہ تیار کرنا پڑتا ہے تاکہ اینٹیں پکائی جائیں۔ اسی طرح ایک نیا نظامِ تعلیم بنانے کے لئے بھی ایک تربیت گاہ بنانا ضروری ہے تاکہ اس میں وہ آدمی تیار کئے جائیں جو اس خاص طریقہ کی تعلیم دینے کے قابل ہوں۔ اینٹیں بھی تو آپ کو پکّی پکائی نہیں ملتیں، پکانی پڑتی ہیں۔ آدمی بھی آپ کو بنے بنائے نہیں ملیں گے، بنانے

پڑیں گے۔ اسی ناقص تعلیم سے کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی فارغ ہو کر نکلے ہیں جو فطرتِ ابراہیمی پر پیدا ہوئے ہیں۔ کافرگر تعلیم و تربیت کے سارے مرحلوں سے گزرنے کے باوجود اپنا ایمان بچا لائے ہیں۔ ان کا نقطۂ نظر اور مقصد زندگی اسلامی ہے یا ذرا سی محنت سے خالص اسلامی بنایا جا سکتا ہے۔ ان میں یہ طاقت بھی موجود ہے کہ جس مقصد پر وہ ایمان لائے ہیں اس کی راہ میں جفاکشی کر سکیں۔ ان میں اجتہادی صلاحیتیں بھی موجود ہیں۔ ایسے لوگوں کو لے کر اگر خاص قسم کی ذہنی و اخلاقی تربیت دی جائے، اور معلومات جس ترتیب سے اب تک ان کے ذہن میں جمع ہوتی رہی ہیں اس کو ذرا حکمت کے ساتھ بدل دیا جائے۔ اور زاویۂ نگاہ اچھی طرح اسلام کی سمت میں جما دیا جائے، تو یہی لوگ تحقیق و مطالعہ سے اس قابل ہو سکتے ہیں کہ علوم کو میرے بیان کردہ نقشے کے مطابق از سرِ نَو مدوّن کرنا شروع کر دیں۔ پھر جب تدوینِ علوم کا کام کسی حد تک انجام پا جائے تو ایک نمونہ کی درسگاہ ابتدائی تجربوں کے لئے بنائی جا سکتی ہے، اور بعد میں آہستہ آہستہ ترقی دے کر یونیورسٹی کے مرتبے تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

متعلّمین کی فراہمی

دوسرا سوال یہ ہے کہ اس قسم کا نظامِ تعلیم اگر قائم بھی کر دیا جائے تو اس میں جاذبیت کونسی ہوگی جو پڑھنے والوں کو اس کی طرف

کھینچے گی؟ جو نظامِ تعلیم موجودہ نظاماتِ تمدّن و سیاست کی خدمت کے لئے نہیں بلکہ ان سے لڑنے کے لئے بنایا جائے۔ اس میں شریک ہونے والے کو یہ تو امید ہو ہی نہیں سکتی کہ کل وہ وہاں سے نکل کر کچھ کما سکے گا، پھر کتنے ایسے لوگ ہوں گے جو کمانے سے بے نیاز ہو کر اس تعلیم کو حاصل کرنے کے لئے آئیں گے۔ جس کے بعد دنیوی لحاظ سے کوئی شاندار مستقبل نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس نظامِ تعلیم میں حق اور صداقت کے سوا کوئی کشش نہیں ہے اور کسی دوسری کشش کی حاجت بھی نہیں۔ جن لوگوں کے لئے اس چیز میں جاذبیت نہ ہو اور صرف روٹی ہی جن کو کھینچ سکتی ہو۔ ان کی توجہ فرمائی سے یہ نظامِ تعلیم خود بھی اتنا ہی بے نیاز ہو گا جتنے وہ اس سے بے نیاز ہیں۔ اس کے لئے تو وہ لوگ درکار ہیں جو جان بوجھ کر اس مقصد اور اس کام کے لئے اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی وقف کرنے کے لئے تیار ہوں جس کے لئے یہ نظامِ تعلیم بنایا جائے گا۔ اور ایسے لوگ بالکل ہی مفقود نہیں ہیں۔ تمام ہندوستان سے پچاس بچے بھی کیا اس کام کے لئے نہ مل سکیں گے؟ اگر اتنے "بچے" بھی وہ قوم فراہم نہیں کر سکتی جو مدتوں سے اسلام اسلام چیخ رہی ہے تب بھی کچھ پروا نہیں۔ اللہ دوسری قوموں کو یہ سعادت بخشے گا۔

مال کا سوال

تیسرا اور آخری سوال یہ ہے کہ اس کام کے لئے مال کہاں سے آئے گا؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس سے جو مال اور ایمان دونوں رکھتے ہوں اور اتنی عقل بھی رکھتے ہوں کہ اپنے مال کا صحیح مصرف سمجھ سکیں۔ ایسے لوگ بھی اگر اس قوم میں نہ پائے گئے جو دن رات اسلام کے درد میں تڑپ رہی ہے تو میں پھر یہی کہوں گا کہ کچھ پروا نہیں، اللہ دوسری قوم میں سے ایسے آدمی پیدا کرے گا۔ آخر پہلے بھی تو کفر و شرک کی گود ہی سے وہ اللہ کے بندے نکل کر آئے تھے جن کی مالی قربانیوں سے دنیا میں اسلام کو فروغ ہوا+

فہرست مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

	پائی	آنے	روپے
الجہاد فی الاسلام	۰	۰	۸
سود	۰	۸	۲
اسلامی قانون	۰	۰	۱
تفہیمات	۰	۸	۳
تنقیحات	۰	۸	۲
رسالہ دینیات	۰	۸	۱
خطبات	۰	۰	۳
مسئلہ قومیت	۰	۸	۱
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۰	۴	۱
اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر	۰	۰	۱
تجدید و احیائے دین	۰	۰	۱
مسئلہ جبر و قدر	۰	۰	۱
پردہ	۰	۸	۲
حقوق الزوجین	۰	۸	۱
اسلام اور ضبط ولادت	۰	۰	۱
اسلام کا نظام حیات	۰	۱۰	۰

بناؤ اور بگاڑ

از

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

شائع کردہ

مکتبہ جماعت اسلامی، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور۔

قیمت چھ آنہ

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی طابع و ناشر نے

دی انوار الاسلام پریس لاہور میں چھپوا کر

مکتبہ جماعت اسلامی، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

طبع اوّل　　دسمبر ۱۹۴۸ء　　۴۰۰۰

بناؤ اور بگاڑ

(یہ تقریر ۱۰ مئی ۱۹۴۷ء کو دارالاسلام پٹھانکوٹ کے جلسۂ عام میں کی گئی تھی۔ سامعین میں دو ہزار مسلمانوں کے علاوہ ڈیڑھ دو سو ہندو اور سکھ اصحاب بھی شریک تھے۔ پس منظر میں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھا جائے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب سارا مشرقی پنجاب ایک کوہ آتش فشاں کی طرح پھٹنے کے لئے تیار تھا اور تین ہی مہینے بعد وہاں فتنہ و فساد کی وہ آگ بھڑکنے والی تھی جس کی تباہ کاریاں اب تاریخ انسانی کا ایک دردناک ترین باب بن چکی ہیں)

تعریف اور شکر اس خدا کے لئے ہے جس نے ہمیں پیدا کیا، عقل اور سمجھ بوجھ عطا کی، بُرے اور بھلے کی تمیز بخشی، اور ہماری ہدایت اور رہنمائی کے لئے اپنے بہترین بندوں کو بھیجا۔ اور سلام ہو خدا کے ان نیک بندوں پر جنھوں نے آدم کی اولاد کو آدمیت کی تعلیم دی، بھلے مانسوں کی طرح رہنا سکھایا، انسانی زندگی کے اصل مقصد سے انہیں آگاہ کیا اور وہ اصول ان کو بتائے جن پر چل کر وہ دنیا میں سکھ اور آخرت میں نجات پا سکتے ہیں۔

حاضرین و حاضرات! یہ دنیا جس خدا نے بنائی ہے اور جس نے

اس زمین کا فرش بچھا کر اس پر انسانوں کو بسایا ہے وہ کوئی اندھا دھند اور الل ٹپ کام کرنے والا خدا نہیں ہے۔ وہ چوپٹ راجہ نہیں ہے کہ اس کی نگری اندھیر نگری ہو۔ وہ اپنے مستقل قانون، پختہ ضابطے اور مضبوط قاعدے رکھتا ہے جن کے مطابق وہ اس سارے جہان پر خدائی کر رہا ہے اس کے قانون سے جس طرح سورج، چاند، زمین اور تارے بندھے ہوئے ہیں، جس طرح ہوا، پانی، درخت اور جانور بندھے ہوئے ہیں، اسی طرح ہم آپ سب انسان بھی بندھے ہوئے ہیں۔ اس کا قانون جس طرح ہماری پیدائش اور موت پر، ہمارے بچپن اور جوانی اور بڑھاپے پر، ہمارے سانس کی آمد و رفت پر، ہمارے ہاضمے اور خون کی گردش پر اور ہماری بیماری اور تندرستی پر بے لاگ اور اٹل طریقے سے چل رہا ہے، ٹھیک اسی طرح اس کا ایک اور قانون بھی ہے جو ہماری تاریخ کے اتار چڑھاؤ پر، ہمارے گرنے اور اٹھنے پر، ہماری ترقی اور تنزل پر، اور ہماری ذاتی، قومی اور ملکی تقدیروں پر حکومت کر رہا ہے اور یہ قانون بھی اتنا ہی بے لاگ اور اٹل ہے۔ اگر یہ ممکن نہیں ہے کہ آدمی ناک سے سانس لینے کے بجائے آنکھوں سے سانس لینے لگے اور معدے میں کھانا ہضم کرنے کے بجائے دل میں ہضم کرنے لگے، تو یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ خدا کے قانون کی رو سے جس راہ پر چل کر کسی قوم کو نیچے جانا چاہیئے وہ اسے بلندی پر لے جائے۔ اگر آگ ایک کے لئے گرم اور دوسرے کے لئے ٹھنڈی نہیں ہے تو برے کرتوت بھی، جو خدا کے قانون کی رو سے برے ہیں، ایک کو گرانے والے

اور دوسرے کو اٹھانے والے نہیں ہو سکتے۔ جو اصول بھی خدا نے انسان کی بھلی اور بری تقدیر بنانے کے لئے مقرر کئے ہیں وہ نہ کسی کے بدلے بدل سکتے ہیں، نہ کسی کے ٹالے ٹل سکتے ہیں۔ اور نہ ان میں کسی کے ساتھ دشمنی اور کسی دوسرے کے ساتھ رعایت ہی پائی جاتی ہے۔

خدا کے اس قانون کی پہلی اور سب سے اہم دفعہ یہ ہے کہ

وہ بناؤ کو پسند کرتا ہے اور بگاڑ کو پسند نہیں کرتا

مالک ہونے کی حیثیت سے اس کی خواہش یہ ہے کہ اس کی دنیا کا انتظام ٹھیک کیا جائے، اس کو زیادہ سے زیادہ سنوارا جائے، اس کے دئے ہوئے ذرائع اور اس کی بخشی ہوئی قوتوں اور قابلیتوں کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کیا جائے۔ وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتا ــــ اور اس سے یہ توقع کی بھی نہیں جا سکتی کہ وہ کبھی اسے پسند کرے گا ــــ کہ اس کی دنیا بگاڑی جائے، اجاڑی جائے اور اس کو بدنظمی سے، گندگیوں سے اور ظلم و ستم سے خراب کر ڈالا جائے۔ انسانوں میں سے جو لوگ بھی دنیا کے انتظام کے امیدوار بن کر کھڑے ہوتے ہیں، ان میں سے صرف وہ لوگ خدا کی نظر انتخاب میں مستحق ٹھہرتے ہیں جن کے اندر بنانے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت ہوتی ہے۔ انہی کو وہ یہاں انتظام کے اختیارات سپرد کرتا ہے۔

پھر وہ دیکھتا رہتا ہے کہ یہ لوگ بناتے کتنا ہیں اور بگاڑتے کتنا۔ جب

تک ان کا بناؤ ان کے بگاڑ سے زیادہ ہوتا ہے اور کوئی دوسرا اُمیدوار ان سے اچھا بنانے والا اور ان سے کم بگاڑنے والا امیدان میں موجود نہیں ہوتا اس وقت تک ان کی ساری برائیوں اور ان کے تمام قصوروں کے باوجود دنیا کا انتظام انہی کے سپرد رہتا ہے۔ مگر جب وہ کم بنانے اور زیادہ بگاڑنے لگتے ہیں تو خدا انہیں ہٹا کر پھینک دیتا ہے۔ اور دوسرے اُمیدواروں کو اسی لازمی شرط پر انتظام سونپ دیتا ہے

یہ قانون بالکل ایک فطری قانون ہے اور آپ کی عقل گواہی دیگی کہ اس کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ اگر آپ میں سے کسی شخص کا کوئی باغ ہو اور وہ اسے ایک مالی کے سپرد کرے تو آپ خود بتائیے کہ وہ اس مالی سے اولین بات کیا چاہے گا؟ باغ کا مالک اپنے مالی سے اس کے سوا اور کیا چاہ سکتا ہے کہ وہ اس کے باغ کو بنائے نہ کہ خراب کر کے رکھ دے۔ وہ تو لازماً یہی چاہے گا کہ اس کے باغ کو زیادہ سے زیادہ بہتر حالت میں رکھا جائے زیادہ سے زیادہ ترقی دی جائے، اس کے حسن میں، اس کی صفائی میں، اس کی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو۔ جس مالی کو وہ دیکھے گا کہ وہ خوب محنت سے، جی لگا کر، سلیقے اور قابلیت کے ساتھ اس کے باغ کی خدمت کر رہا ہے، اس کی روشوں کو سنوار رہا ہے، اس کے اچھے درختوں کو پرورش کر رہا ہے، اس کو بُری ذات کے درختوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے صاف کر رہا ہے، اور اس میں اپنی جدّت اور جودت سے عمدہ پھلوں اور پھولوں کی نئی نئی قسموں کا اضافہ کر رہا ہے تو ضرور ہے کہ

وہ اس سے خوش ہو، اسے ترقی دے اور ایسے لائق، فرض شناس اور خدمت گزار مالی کو نکالنا کبھی پسند نہ کرے۔ لیکن اس کے برعکس اگر وہ دیکھے کہ مالی نالائق بھی ہے، کام چور بھی ہے اور جان بوجھ کر یا بے جانے بوجھے اس باغ کے ساتھ بدخواہی بھی کر رہا ہے، سارا باغ گندگیوں سے اٹا پڑا ہے، روشیں ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں، پانی کہیں بلا ضرورت بہ رہا ہے، اور کہیں قطعے کے قطعے سوکھتے چلے جا رہے ہیں، گھاس پھونس اور جھاڑ جھنکاڑ بڑھتے چلے جاتے ہیں اور پھولوں اور پھلدار درختوں کو بے دردی کے ساتھ کاٹ کاٹ کر اور توڑ توڑ کر پھینکا جا رہا ہے، اچھے درخت مرجھا رہے ہیں اور خار دار جھاڑیاں بڑھ رہی ہیں، تو آپ خود ہی سوچئے کہ باغ کا مالک ایسے مالی کو کیسے پسند کر سکتا ہے۔ کون سی سفارش، کونسی عرض و معروض اور دست بستہ التجائیں، اور کون سے آبائی حقوق یا دوسرے خود ساختہ حقوق کا لحاظ اس کو اپنا باغ ایسے مالی کے حوالہ کئے رہنے پر آمادہ کر سکتا ہے؟ زیادہ سے زیادہ رعایت وہ بس اتنی ہی تو کریگا کہ اسے تنبیہ کر کے پھر ایک موقع دیدے۔ مگر جو مالی تنبیہ پر بھی ہوش میں نہ آئے اور باغ کو اجاڑے ہی چلا جائے اس کا علاج اس کے سوا اور کیا ہے کہ باغ کا مالک کان پکڑ کر اسے نکال باہر کرے اور دوسرا مالی اس کی جگہ رکھ لے۔

اب غور کیجئے کہ اپنے ایک ذرا سے باغ کے انتظام میں جب آپ یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں تو خدا، جس نے اپنی اتنی بڑی زمین اتنے سروسامان

کے ساتھ انسانوں کے حوالہ کی ہے اور اتنے وسیع اختیارات ان کو اپنی دنیا اور اس کی چیزوں پر دئے ہیں، وہ آخر اس سوال کو نظر انداز کیسے کر سکتا ہے کہ آپ اس کی دنیا بنا رہے ہیں یا اجاڑ رہے ہیں۔ آپ بنا رہے ہوں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ آپ کو خواہ مخواہ ہٹا دے۔ لیکن اگر آپ بنائیں کچھ نہیں اور اس کے اس عظیم الشان باغ کو بگاڑتے اور اجاڑتے ہی چلے جائیں، تو آپ نے اپنے دعوے اپنی دانست میں خواہ کیسی ہی زبردست من مانی بنیادوں پر قائم کر رکھے ہوں، وہ اپنے باغ پر آپ کے کسی حق کو تسلیم نہیں کریگا اور کچھ تنبیہات کر کے، سنبھلنے کے دو چار مواقع دیکر آخر آپ کو انتظام سے بے دخل ہی کر کے چھوڑیگا۔

اس معاملہ میں خدا کا نقطۂ نظر انسانوں کے نقطۂ نظر سے اسی طرح مختلف ہے جس طرح خود انسانوں میں ایک باغ کے مالک کا نقطۂ نظر اس کے مالی کے نقطۂ نظر سے مختلف ہوا کرتا ہے۔ فرض کیجئے کہ مالیوں کا ایک خاندان دو چار پشت سے ایک شخص کے باغ میں کام کرتا چلا آرہا ہے۔ ان کا کوئی دادا پردادا اپنی لیاقت و قابلیت کی وجہ سے یہاں رکھا گیا تھا۔ پھر اس کی اولاد نے بھی کام اچھا کیا، تو مالک نے سوچا کہ خواہ مخواہ انہیں ہٹانے اور نئے آدمی رکھنے کی کیا ضرورت ہے، جب کام یہ بھی اچھا ہی کر رہے ہیں تو ان کا حق دوسروں سے زیادہ ہے۔ اس طرح یہ خاندان باغ میں جم گیا۔ لیکن اب اس خاندان کے لوگ نہایت نالائق، بے سلیقہ، کام چور اور نا فرض شناس اٹھے ہیں۔ باغبانی کی کوئی صلاحیت ان کے اندر نہیں ہے۔ سارے باغ کا ستیاناس کئے ڈالتے ہیں۔ اور اس پر ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم باپ دادا کے وقتوں

سے اس باغ میں رہتے چلے آتے ہیں، ہمارے پرداداہی کے ہاتھوں اول اول یہ باغ آباد ہوا تھا، لہٰذا ہمارے اس پر پیدائشی حقوق ہیں، اور اب کسی طرح یہ جائز نہیں ہے کہ ہمیں بے دخل کر کے کسی دوسرے کو یہاں کا مالی بنا دیا جائے۔ یہ اُن نالائق مالیوں کا نقطۂ نظر ہے۔ مگر کیا باغ کے مالک کا نقطۂ نظر بھی یہی ہو سکتا ہے؟ کیا وہ یہ نہ کہے گا کہ میرے نزدیک تو سب سے مقدم چیز میرے باغ کا حسن انتظام ہے۔ میں نے یہ باغ تمہارے پردادا کے لیے نہیں لگایا تھا بلکہ تمہارے پردادا کو اس باغ کے لئے نوکر رکھا تھا۔ تمہارے اس پر جو حقوق بھی ہیں خدمت اور قابلیت کے ساتھ مشروط ہیں۔ باغ کو بناؤ گے تو تمہارے سب حقوق کا لحاظ کیا جائیگا۔ اپنے پرانے مالیوں سے آخر مجھے کیا دشمنی ہو سکتی ہے کہ وہ کام اچھا کریں تب بھی میں انہیں خواہ مخواہ نکال ہی دوں اور نئے اُمیدواروں کا بلاضرورت تجربہ کروں۔ لیکن اگر اس باغ ہی کو تم بگاڑتے اور اجاڑتے رہے جس کے انتظام کی خاطر تمہیں رکھا گیا تھا تو پھر تمہارا کوئی حق مجھے تسلیم نہیں ہے، دوسرے اُمیدوار موجود ہیں، باغ کا انتظام اُن کے حوالے کر دُونگا اور تم کو ان کے ماتحت بیش خدمت بن کر رہنا ہوگا۔ اس پر بھی اگر تم درست نہ ہوئے اور ثابت ہوا کہ ماتحت کی حیثیت سے بھی تم کسی کام کے نہیں ہو، بلکہ کچھ بگاڑنے ہی والے ہو تو تمہیں یہاں سے نکال باہر کیا جائیگا اور تمہاری جگہ خدمت گار بھی دوسرے ہی لا کر بسائے جائیں گے۔

یہ فرق جو مالک اور مالیوں کے نقطۂ نظر میں ہے، ٹھیک یہی فرق دُنیا

کے مالک اور دنیا والوں کے نقطۂ نظر میں بھی ہے۔ دنیا کی مختلف قومیں زمین
کے جس جس خطہ میں بستی ہیں، ان کا دعویٰ یہی ہے کہ یہ خطہ ہمارا قومی وطن ہے،
پشتہا پشت سے ہم اور ہمارے باپ دادا یہاں رہتے چلے آرہے ہیں،
اس ملک پر ہمارے پیدائشی حقوق ہیں، لہذا یہاں انتظام ہمارا اپنا ہی ہونا
چاہیئے، کسی دوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ باہر سے آکر یہاں کا انتظام کرے۔
مگر زمین کے اصلی مالک، خدا کا نقطۂ نظر یہ نہیں ہے۔ اس نے کبھی ان قومی
حقوق کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ وہ نہیں مانتا کہ ہر ملک پر اس کے باشندوں
کا پیدائشی حق ہے جس سے اس کو کسی حال میں بے دخل نہیں کیا جا سکتا۔
وہ تو یہ دیکھتا ہے کہ کوئی قوم اپنے وطن میں کام کیا کر رہی ہے۔ اگر وہ بناؤ
اور سنوار کے کام کرتی ہو، اگر وہ اپنی قوتیں زمین کی اصلاح و ترقی میں استعمال
کرتی ہو، اگر وہ برائیوں کی پیداوار روکنے اور بھلائیوں کی کھیتی سینچنے میں
لگی ہوئی ہو، تو مالکِ کائنات کہتا ہے کہ بیشک تم اس کے مستحق ہو کہ یہاں
کا انتظام تمہارے ہاتھ میں رہنے دیا جائے، تم پہلے سے یہاں آباد بھی ہو
اور اہل بھی ہو، لہذا تمہارا ہی حق دوسروں کی بہ نسبت مقدم ہے۔ لیکن اگر
معاملہ برعکس ہو، بناؤ کچھ نہ ہو اور سب بگاڑ ہی کے کام ہوئے جارہے ہوں،
بھلائیاں کچھ نہ ہوں اور برائیوں ہی سے خدا کی زمین بھری جارہی ہو، جو کچھ خدا
نے زمین پر پیدا کیا ہے اسے بیدردی کے ساتھ تباہ کیا جارہا ہو اور کوئی بہتر
کام اسی سے لیا ہی نہ جاتا ہو، تو پھر خدا کی طرف سے پہلے کچھ ہلکی اور کچھ سخت
چوٹیں لگائی جاتی ہیں تاکہ یہ لوگ ہوش میں آئیں اور اپنا رویہ درست کرلیں۔

پھر جب وہ قوم اس پر درست نہیں ہوتی تو اسے ملک کے انتظام سے بے دخل کر دیا جاتا ہے اور کسی دوسری قوم کو، جو کم از کم اس کی بہ نسبت اہل تر ہو وہاں کی حکومت دے دی جاتی ہے۔ اور بات اس پر بھی ختم نہیں ہو جاتی۔ اگر ماتحت بننے کے بعد بھی باشندگانِ ملک کسی لیاقت و اہلیت کا ثبوت نہیں دیتے اور اپنے عمل سے یہی ظاہر کرتے ہیں کہ ان سے کچھ بھی بن نہ آئے گا بلکہ کچھ بگڑ ہی جائیگا، تو خدا پھر ایسی قوم کو مٹا دیتا ہے اور دوسروں کو لے آتا ہے جو اس کی جگہ بستے ہیں۔ اس معاملہ میں خدا کا نقطۂ نظر ہمیشہ وہی ہوتا ہے جو مالک کا ہونا چاہیئے وہ اپنی زمین کے انتظام میں دعویداروں اور امیدواروں کے آبائی یا پیدائشی حقوق نہیں دیکھتا بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ ان میں سے کون بناؤ کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت اور بگاڑ کی طرف کم سے کم میلان رکھتا ہے۔ ایک وقت کے امیدواروں میں سے جو اس لحاظ سے اہل تر نظر آتے ہیں، انتخاب انہی کا ہوتا ہے اور جب تک ان کے بگاڑ سے ان کا بناؤ زیادہ رہتا ہے، یا جب تک ان کی بہ نسبت زیادہ اچھا بنانے والا اور کم بگاڑنے والا کوئی میدان میں نہیں آجاتا، اس وقت تک انتظام انہی کے سپرد رہتا ہے۔

یہ جو کچھ عرض کر رہا ہوں، تاریخ گواہ ہے کہ خدا نے ہمیشہ اپنی زمین کا انتظام اسی اصول پر کیا ہے۔ دور کیوں جائیے، خود اپنے اسی ملک کی تاریخ دیکھ لیجئے یہاں جو قومیں پہلے آباد تھیں ان کی تعمیری صلاحیتیں جب ختم ہو گئیں تو خدا نے آریوں کو یہاں کے انتظام کا موقعہ دیا جو اپنے وقت کی قوموں میں سب سے زیادہ اچھی صلاحیتیں رکھتے تھے۔ انہوں نے یہاں آکر ایک بڑے شاندار تمدن

کی بنا رکھی، بہت سے علوم و فنون ایجاد کئے، زمین کے خزانوں کو نکالا اور انہیں بہتری میں استعمال کیا، بگاڑ سے زیادہ بناؤ کے کام کر کے دکھلائے۔ یہ قابلیتیں جب تک ان میں رہیں، تاریخ کے سارے نشیبوں اور فرازوں کے باوجود وہی اس ملک کے منتظم رہے۔ دوسرے اُمیدوار بڑھ بڑھ کر آگے آئے مگر دھکیل دئے گئے کیونکہ ان کے ہوتے دوسرے منتظم کی ضرورت نہ تھی ان کے حملے زیادہ سے زیادہ بس یہ حیثیت رکھتے تھے کہ جب کبھی یہ ذرا بگڑنے لگے تو کسی کو بھیج دیا گیا تاکہ انہیں متنبہ کر دے۔ مگر جب یہ بگڑتے ہی چلے گئے اور انہوں نے بناؤ کے کام کم اور بگاڑ کے کام زیادہ کرنے شروع کر دیئے، جب انہوں نے اخلاق میں وہ پستی اختیار کی جس کے آثار بام مارگی تحریک میں آپ اب بھی دیکھ سکتے ہیں۔ جب انہوں نے انسانیت کی تقسیم کر کے خود اپنی ہی سوسائٹی کو ورنوں اور ذاتوں میں پھاڑ ڈالا، اور اپنی اجتماعی زندگی کو ایک زینے کی شکل میں ترتیب دیا جس کی ہر سیڑھی کا بیٹھنے والا اپنے سے اوپر کی سیڑھی والے کا بندہ اور نیچے کی سیڑھی والے کا خدا بن گیا، جب انہوں نے خدا کے لاکھوں کروڑوں بندوں پر وہ ظلم ڈھایا جو آج تک اچھوت پن کی شکل میں موجود ہے، جب انہوں نے علم کے دروازے عام انسانوں پر بند کر دئے اور ان کے پنڈت علم کے خزانوں پر سانپ بن کر بیٹھ گئے، اور جب ان کے کار فرماطبقوں کے پاس اپنے زبردستی جمائے ہوئے حقوق وصول کرنے اور دوسروں کی محنتوں پر داد عیش دینے کے سوا کوئی کام نہ رہا تو خدا نے آخر کار ان سے ملک کا انتظام چھین لیا اور وسط ایشیا

کی ان قوموں کو یہاں کام کرنے کا موقع دیا جو اس وقت اسلامی تحریک سے متاثر ہو کر زندگی کی بہتر صلاحیتوں سے آراستہ ہو گئی تھیں۔

یہ لوگ سینکڑوں برس تک یہاں کے انتظام پر سرفراز رہے۔ اور ان کے ساتھ خود اس ملک کے بھی بہت سے لوگ اسلام قبول کر کے شامل ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں نے بہت کچھ بگاڑا بھی، مگر جتنا بگاڑا اس سے زیادہ بنایا۔ کئی سو برس تک ہندوستان میں بناؤ کا جو کام بھی ہوا انہی کے ہاتھوں ہوا یا پھر ان کے اثر سے ہوا۔ انہوں نے علم کی روشنی پھیلائی، خیالات کی اصلاح کی، تمدن و معاشرت کو بہت کچھ درست کیا، ملک کے ذرائع و وسائل کو اپنے عہد کے معیار کے لحاظ سے بہتری میں استعمال کیا، اور امن و انصاف کا عمدہ نظام قائم کیا جو اگرچہ اسلام کے اصلی معیار سے بہت کم تھا مگر پہلے کی حالت اور گرد و پیش کے دوسرے ملکوں کی حالت سے مقابلہ کرتے ہوئے کافی بلند تھا۔ اس کے بعد وہ بھی اپنے پیش رووں کی طرح بگڑنے لگے ان کے اندر بھی بناؤ کی صلاحیتیں گھٹنی شروع ہوئیں اور بگاڑ کے میلانات بڑھتے چلے گئے۔ انہوں نے بھی اونچ نیچ اور نسلی امتیازات اور طبقاتی تفریقیں کر کے خود اپنی سوسائٹی کو پھاڑ لیا جس کے بے شمار اخلاقی، سیاسی اور تمدنی نقصانات ہوئے۔ انہوں نے بھی انصاف کم اور ظلم زیادہ کرنا شروع کر دیا۔ وہ بھی حکومت کی ذمہ داریوں کو بھول کر صرف اس کے فائدوں اور زیادہ تر ناجائز فائدوں پر نظر رکھنے لگے۔ انہوں نے بھی تعمیر، ترقی اور اصلاح کے کام چھوڑ کر خدا کی دی ہوئی قوتوں اور ذرائع کو ضائع کرنا شروع کیا اور اگر استعمال

کیا بھی تو زیادہ تر زندگی کو بگاڑنے والے کاموں میں کیا۔ تن آسانی و عیش پرستی میں وہ اتنے کھوئے گئے کہ جب آخری شکست کھا کر ان کے فرماں رواؤں کو دلی کے لال قلعہ سے نکلنا پڑا تو ان کے شاہزادے ـــــ وہی جو ملک کی حکومت کے اُمیدوار تھے ـــــ جان بچانے کے لئے بھاگ بھی نہ سکتے تھے کیونکہ زمین پر چلنا انھوں نے چھوڑ رکھا تھا۔ مسلمانوں کی عام اخلاقی پستی اس حد کو پہنچ گئی کہ ان کے عوام سے لے کر بڑے بڑے ذمہ دار لوگوں تک کسی میں بھی اپنی ذات کے سوا دوسری کسی چیز کی وفاداری باقی نہ رہی جو انہیں دین فروشی، قوم فروشی اور ملک فروشی سے روکتی۔ ان میں ہزاروں لاکھوں پیشہ ور سپاہی پیدا ہونے لگے جن کی اخلاقی حالت پالتو کتوں کی سی تھی کہ جو چاہے روٹی دیکر انہیں پال لے اور پھر جس کا دل چاہے ان سے شکار کرالے۔ ان میں یہ احساس بھی باقی نہ رہا تھا کہ یہ ذلیل ترین پیشہ ہے جس کی بدولت ان کے دشمن خود انہی کے ہاتھوں ان کا ملک فتح کر رہے تھے، اپنے اندر کوئی ذلت کا پہلو بھی رکھتا ہے۔ غالب جیسا شخص فخریہ کہتا ہے کہ "سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری" یہ بات کہتے ہوئے ہمارے اتنے بڑے شاعر کو ذرا خیال تک نہ گزرا کہ پیشہ ورانہ سپہ گری کوئی فخر کی نہیں، ڈوب مرنے کی بات ہے۔

جب یہ ان کی حالت ہو گئی تو خدا نے ان کی معزولی کا بھی فیصلہ کر لیا اور ہندوستان کے انتظام کا منصب پھر نئے اُمیدواروں کے لئے کھل گیا۔ اس موقع پر چار اُمیدوار میدان میں تھے۔ مرہٹے، سکھ، انگریز اور بعض مسلمان رئیس۔ آپ خود انصاف کے ساتھ، قومی تعصب کی عینک اتار کر

اس دور کی تاریخ اور بعد کے حالات کو دیکھیں گے تو آپ کا دل گواہی دیگا
کہ دوسرے اُمیدواروں میں سے کسی میں بھی بناؤ کی وہ صلاحیتیں نہ تھیں
جو انگریزوں میں تھیں، اور جتنا بگاڑ انگریزوں میں تھا اس سے کہیں زیادہ
بگاڑ مرہٹوں، سکھوں اور مسلمان اُمیدواروں میں تھا۔ جو کچھ انگریزوں نے
بنایا وہ اِن میں سے کوئی نہ بناتا۔ اور جو کچھ انہوں نے بگاڑا اس سے
بہت زیادہ یہ اُمیدوار بگاڑ کر رکھ دیتے۔ مطلقاً دیکھئے تو انگریزوں میں
بہت سے پہلوؤں سے بیشمار برائیاں آپ کو نظر آئینگی۔ مگر مقابلتاً
دیکھئے تو اپنے ہم عصر حریفوں سے ان کی برائیاں بہت کم اور ان کی
خوبیاں بہت نکلیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے قانون نے پھر ایک مرتبہ
انسانوں کے اس من مانے اصول کو توڑ دیا جو انہوں نے بغیر کسی حق کے
بنا رکھا ہے کہ "ہر ملک خود ملکیوں کے لئے ہے۔ خواہ وہ اسے بنائیں
یا بگاڑیں"۔ اس نے تاریخ کے اٹل فیصلہ سے ثابت کیا کہ نہیں، ملک تو خدا
کا ہے، وہی یہ طے کرنے کا حق رکھتا ہے کہ اس کا انتظام کس کے سپرد کرے
اور اس کا فیصلہ کسی نسلی، قومی یا آبائی حق کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ اس بنیاد
پر ہوتا ہے کہ مجموعی بھلائی کون سے انتظام میں ہے

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ
الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ
بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ [1]

[1] کہو کہ خدایا، ملک کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے ملک دیتا ہے (باقی حاشیہ صفحہ ۱۶ پر)

اس طرح اللہ تعالیٰ ہزاروں میل کے فاصلہ سے ایک ایسی قوم کو لے آیا جو کبھی یہاں تین چار لاکھ کی تعداد سے زیادہ نہیں رہی اور اس نے یہیں کے ذرائع اور یہیں کے آدمیوں سے یہاں کی ہندو، مسلم، سکھ سب طاقتوں کو زیر کر کے اس ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہاں کے کروڑوں باشندے ان مٹھی بھر انگریزوں کے تابع فرمان بن کر رہے۔ ایک ایک انگریز نے تن تنہا ایک ایک ضلع پر حکومت کی۔ بغیر اس کے کہ اس کی قوم کا کوئی دوسرا فرد اس کا ہاتھ مضبوط کرنے کے لئے اس کے پاس موجود ہوتا۔ اس تمام دوران میں ہندوستانیوں نے جو کچھ کیا بیش خدمت کی حیثیت سے کیا نہ کہ کارفرما کی حیثیت سے ہم سب کو یہ ماننا پڑیگا، ورنہ مانیں گے تو حقیقت کو جھٹلائیں گے، کہ اس ساری مدت میں، جبکہ انگریز یہاں رہے، بناؤ کا جو کچھ بھی کام ہوا انگریزوں کے ہاتھوں سے اور ان کے اثر سے ہوا جس حالت میں انہوں نے ہندوستان کو پایا تھا اس کے مقابلہ میں آج کی حالت دیکھئے تو آپ اس بات سے انکار نہ کر سکیں گے کہ بگاڑ کے باوجود بناؤ کا بہت سا کام ہوا ہے جس کے خود اہل ملک کے ہاتھوں انجام پانے کی ہرگز توقع نہ کی جا سکتی تھی۔ اس لئے تقدیر الٰہی کا وہ فیصلہ غلط نہ تھا جو اس نے اٹھارویں صدی کے وسط میں کر دیا تھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۵) اور جس سے چاہتا ہے ملک چھین لیتا ہے، جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے اور تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اب دیکھیے کہ جو کچھ انگریز بنا سکتے تھے وہ بنا چکے ہیں۔ ان کے بناؤ کے حساب میں اب کوئی خاص اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس حساب میں جو اضافہ وہ کر سکتے ہیں وہ دوسروں کے ہاتھوں بھی ہو سکتا ہے۔ مگر دوسری طرف ان کے بگاڑ کا حساب بہت بڑھ چکا ہے اور جتنی مدت بھی وہ یہاں رہیں گے بناؤ کی بہ نسبت بگاڑ ہی زیادہ بڑھائیں گے —— ان کی فرد جرم اتنی لمبی ہے کہ اسے ایک صحبت میں بیان کرنا مشکل ہے۔ اور اس کے بیان کی کوئی حاجت بھی نہیں ہے، کیونکہ وہ سب کے سامنے ہے —
اب تقدیر الٰہی کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ یہاں کے انتظام سے بے دخل کر دیے جائیں۔ انھوں نے بہت عقلمندی سے کام لیا کہ خود سیدھی طرح رخصت ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ سیدھی طرح نہ جاتے تو ٹیڑھی طرح نکالے جاتے کیونکہ خدا کے اٹل قوانین اب ان کے ہاتھ میں یہاں کا انتظام رکھنے کے روادار نہیں ہیں۔

یہ موقع جس کے عین سرے پر ہم آپ کھڑے ہیں، تاریخ کے ان اہم مواقع میں سے ہے جب زمین کا اصلی مالک کسی ملک میں ایک انتظام کو ختم کرتا ہے اور دوسرے انتظام کا فیصلہ کرتا ہے۔ بظاہر جس طرح یہاں انتقال اختیارات کا معاملہ طے ہوتا نظر آ رہا ہے اس سے یہ دھوکا نہ کھا جائیے کہ یہ قطعی فیصلہ ہے جو ملک کا انتظام خود اہل ملک کے حوالے کیے جانے کے حق میں ہو رہا ہے۔ آپ شاید معاملہ کی سادہ سی صورت یہ سمجھتے ہوں گے کہ اجنبی لوگ جو باہر سے آ کر حکومت کر رہے تھے واپس جا رہے ہیں اس لئے

اب یہ آپ سے آپ ہونا ہی چاہیئے کہ ملک کا انتظام خود ملکیوں کے ہاتھ آ ئے۔ نہیں، خدا کے فیصلے اس طرح کے نہیں ہوتے وہ ان اجنبیوں کو نہ پہلے بلا وجہ لایا تھا نہ اب بلا وجہ لے جا رہا ہے، نہ پہلے الل ٹپ اس نے آپ سے انتظام چھینا تھا اور نہ اب الل ٹپ وہ اسے آپ کے حوالہ کردیگا۔ دراصل اس وقت ہندوستان کے باشندے اُمیدوار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندو۔ مسلمان سکھ سب اُمیدوار ہیں۔ چونکہ یہ پہلے سے یہاں آباد چلے آرہے ہیں اس لئے پہلا موقع انہی کو دیا جا رہا ہے۔ لیکن یہ مستقل تقرر نہیں ہے بلکہ محض امتحانی موقع ہے۔ اگر فی الواقع انہوں نے ثابت کیا کہ ان کے اندر بگاڑ سے بڑھکر بناؤ کی صلاحیتیں ہیں تب تو ان کا تقرر مستقل ہو جائیگا۔ ورنہ اپنے بناؤ سے بڑھ کر اپنا بگاڑ پیش کر کے یہ بہت جلدی دیکھ لیں گے کہ انہیں پھر اس ملک کے انتظام سے بے دخل کر دیا جائیگا اور دور ونزدیک کی قوموں میں سے کسی ایک کو اس خدمت کے لئے منتخب کر لیا جائیگا۔ پھر اس فیصلے کے خلاف یہ کوئی فریاد تک نہ کر سکیں گے۔ دنیا بھر کے سامنے اپنی نالائقی کا کھلا ثبوت دے چکنے کے بعد ان کا کیا منہ ہوگا کہ کوئی فریاد کریں اور ڈھیٹ بن کر فریاد کریں گے بھی تو اس کی داد کون دیگا۔

اب ذرا آپ جائزہ لے کر دیکھیں کہ ہندوستان کے لوگ ہندو، مسلمان سکھ، اس امتحان کے موقع پر اپنے خدا کے سامنے اپنی کیا صلاحتیں اور قابلیتیں اور اپنے کیا اوصاف اور کارنامے پیش کر رہے ہیں جن کی بنا پر یہ اُمید کر سکتے ہوں کہ خدا اپنے ملک کا انتظام پھر ان کے سپرد کر دیگا۔

اس موقع پر اگر میں بے لاگ طریقے سے کھلم کھلا وہ فردِ جرم سنا دوں جو اخلاق کی عدالت میں ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں سب پر لگتی ہے تو میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ بُرا نہ مانیں گے۔ اپنی قوم اور اپنے وطنی بھائیوں کے عیوب بیان کر کے خوشی تو مجھے بھی نہیں ہوتی۔ حقیقت میں میرا دل روتا ہے، کیونکہ میں گویا اپنی آنکھوں سے اس انجام کو دیکھ رہا ہوں جو ان عیوب کی بنا پر کل انہیں دیکھنا ہی نہیں، بھگتنا بھی پڑیگا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ یہ عیوب انہیں لے ڈوبیں گے۔ ہم، آپ، کوئی بھی ان کے انجام بد سے نہ بچے گا۔ اس لئے میں انہیں دلی رنج کے ساتھ بیان کرتا ہوں تاکہ جن کے کان ہوں وہ سنیں اور اصلاح کی کچھ فکر کریں۔

ہمارے افراد کی عام اخلاقی حالت جیسی کچھ ہے آپ اس کا اندازہ خود اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کی بنا پر کیجئے۔ ہم میں کتنے فیصدی آدمی ایسے پائے جاتے ہیں جو کسی کا حق تلف کرنے میں، کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے میں، کوئی "مفید" جھوٹ بولنے اور کوئی "نفع بخش" بے ایمانی کرنے میں صرف اس بنا پر تامل کرتے ہوں کہ ایسا کرنا اخلاقاً بُرا ہے؟ جہاں قانون گرفت نہ کرتا ہو، یا جہاں قانون کی گرفت سے بچ نکلنے کی اُمید ہو وہاں کتنے فیصدی اشخاص محض اپنے اخلاقی احساس کی بنا پر کسی جرم اور کسی برائی کا ارتکاب کرنے سے باز رہ جاتے ہیں؟ جہاں اپنے کسی ذاتی فائدے کی توقع نہ ہو وہاں کتنے آدمی دوسروں کے ساتھ بھلائی، ہمدردی، ایثار، حق رسانی اور حسن سلوک کا برتاؤ کرتے ہیں؟ ہمارے تجارت پیشہ لوگوں میں

ایسے تاجروں کا اوسط کیا ہے جو دھوکے اور فریب اور جھوٹ اور ناجائز نفع اندوزی سے پرہیز کرتے ہوں؟ ہمارے صنعت پیشہ لوگوں میں ایسے افراد کا تناسب کیا ہے جو اپنے فائدے کے ساتھ کچھ اپنے خریداروں کے مفاد اور اپنی قوم اور اپنے ملک کی مصلحت کا بھی خیال رکھتے ہوں؟ ہمارے زمینداروں میں کتنے ہیں جو غلہ روکتے ہوئے اور بے حد گراں قیمتوں پر بیچتے ہوئے یہ سوچتے ہوں کہ اپنی اس نفع اندوزی سے وہ کتنے لاکھ بلکہ کتنے کروڑ انسانوں کو فاقہ کشی کا عذاب دے رہے ہیں؟ ہمارے مالداروں میں کتنے ہیں جن کی دولتمندی میں کسی ظلم، کسی حق تلفی اور کسی بد دیانتی کا دخل نہیں ہے؟ ہمارے محنت پیشہ لوگوں میں کتنے ہیں جو فرض شناسی کے ساتھ اپنی اُجرت اور اپنی تنخواہ کا حق ادا کرتے ہیں؟ ہمارے سرکاری ملازموں میں کتنے ہیں جو رشوت اور خیانت سے، ظلم اور مردم آزاری سے، کام چوری اور حرام خوری سے، اور اپنے اختیارات کے ناجائز استعمال سے بچے ہوئے ہیں؟ ہمارے وکیلوں میں، ہمارے ڈاکٹروں اور حکیموں میں، ہمارے اخبار نویسوں میں، ہمارے ناشرین و مصنفین میں، ہمارے قومی "خدمت گزاروں" میں کتنے ہیں جو اپنے فائدے کی خاطر ناپاک سے ناپاک طریقے اختیار کرنے اور خلق خدا کو ذہنی، اخلاقی، مالی اور جسمانی نقصان پہنچانے میں کچھ بھی شرم محسوس کرتے ہوں؟ شاید میں مبالغہ نہ کروں گا اگر یہ کہوں کہ ہماری آبادی میں بمشکل ۵ فیصدی لوگ اس اخلاقی جذام سے بچے رہ گئے ہیں، ورنہ ۹۵ فیصدی کو یہ چھوت بُری طرح لگ چکی ہے

اس معاملہ میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی اور ہریجن کے درمیان کوئی امتیاز نہیں۔ سب کے سب یکساں بیمار ہیں۔ سب کی اخلاقی حالت انتہائی خوفناک حد تک گری ہوئی ہے۔ اور کسی گروہ کا حال دوسرے سے بہتر نہیں ہے۔

اخلاقی تنزل کی یہ وبا جب افراد کی ایک بہت بڑی اکثریت کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تو قدرتی بات تھی کہ وسیع پیمانے پر اجتماعی شکل میں اس کا ظہور شروع ہو جائے۔ اس آنے والے طوفان کی پہلی علامت ہمیں اس وقت نظر آئی جب جنگ کی وجہ سے ریلوں میں مسافروں کا ہجوم ہونے لگا۔ وہاں ایک ہی قوم اور ایک ہی ملک کے لوگوں نے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جس خودغرضی، بیدردی اور سنگدلی کا سلوک کیا وہ پتہ دے رہا تھا کہ ہمارے عام اخلاق کس تیز رفتاری کے ساتھ گر رہے ہیں۔ پھر اشیاء کی کمیابی و گرانی کے ساتھ ذخیرہ اندوزی اور چوربازاری بڑے وسیع پیمانے پر شروع ہوئی۔ پھر بنگال کا وہ ہولناک مصنوعی قحط رونما ہوا جس میں ہمارے ایک طبقہ نے اپنے ہی ملک کے لاکھوں انسانوں کو اپنے نفع کی خاطر بھوک سے تڑپا تڑپا کر مار دیا۔ یہ سب ابتدائی علامات تھیں اس کے بعد خباثت، کمینہ پن، درندگی اور وحشت کا وہ لاوا یکایک پھٹ پڑا جو ہمارے اندر مدتوں سے پک رہا تھا اور اب وہ فرقہ وارانہ فساد کی شکل میں ہندوستان کو ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک بھسم کر رہا ہے۔ کلکتہ کے فساد کے بعد سے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کی

قومی کشمکش کا جو نیا باب شروع ہوا ہے اس میں یہ تینوں قومیں اپنی ذلیل ترین صفات کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ جن افعال کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کوئی انسان کبھی ان کا بھی مرتکب ہو سکتا ہے، آج ہماری بستیوں کے رہنے والے علانیہ ان کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے علاقوں کی پوری پوری آبادیاں غنڈہ بن گئی ہیں اور وہ کام کر رہی ہیں جو کسی غنڈے کے خواب و خیال میں بھی کبھی نہ آئے تھے۔ شیر خوار بچوں کو ماؤں کے سینوں پر رکھ کر ذبح کیا گیا ہے۔ زندہ انسانوں کو آگ میں بھونا گیا ہے۔ شریف عورتوں کو برسرِ عام ننگا کیا گیا ہے اور ہزاروں کے مجمع میں ان کے ساتھ بدکاری کی گئی ہے۔ باپوں، شوہروں اور بھائیوں کے سامنے ان کی بیٹیوں بیویوں، اور بہنوں کو بے عزت کیا گیا ہے۔ عبادت گاہوں اور مذہبی کتابوں پر غصہ نکالنے کی ناپاک ترین شکلیں اختیار کی گئی ہیں۔ بیماروں اور زخمیوں اور بوڑھوں کو انتہائی بے رحمی کے ساتھ مارا گیا ہے۔ مسافروں کو چلتی ریل پر سے پھینکا گیا ہے۔ زندہ انسانوں کے اعضا کاٹے گئے ہیں۔ نہتے اور بے بس انسانوں کا جانوروں کی طرح شکار کیا گیا ہے۔ ہمسایوں نے ہمسایوں کو لوٹا ہے۔ دوستوں نے دوستوں سے دغا کی ہے۔ پناہ دینے والوں نے خود اپنی دی ہوئی پناہ کو توڑا ہے۔ امن و امان کے محافظوں (پولیس اور فوج اور مجسٹریٹوں) نے علانیہ فساد میں حصہ لیا ہے، بلکہ خود فساد کیا اور اپنی حمایت و نگرانی میں فساد کرایا ہے۔ غرض ظلم و ستم، سنگدلی و بے رحمی اور کمینگی و بد معاشی کی کوئی قسم ایسی نہیں رہ گئی ہے جس کا ارتکاب ان

چند مہینوں میں ہمارے ملک کے رہنے والوں نے اجتماعی طور پر نہ کیا ہو اور ابھی دلوں کا غبار پوری طرح نکلا نہیں ہے۔ آثار بتا رہے ہیں کہ یہ سب کچھ اس سے بہت زیادہ بڑے پیمانے پر اور بدرجہا بدتر صورت میں ابھی ہونے والا ہے۔

کیا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ محض کسی اتفاقی ہیجان کا نتیجہ ہے؟ اگر یہ آپ کا گمان ہے تو آپ سخت غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ ابھی میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ اس ملک کی آبادی کے ۹۵ فیصدی افراد اخلاقی حیثیت سے بیمار ہو چکے ہیں۔ جب افراد کی اتنی بڑی اکثریت بداخلاق ہو جائے تو قوموں کا اجتماعی رویہ آخر کیسے درست رہ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مسلمان اور سکھ تینوں قوموں میں سچائی، انصاف اور حق پسندی کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہی ہے۔ راست باز، دیانت دار اور شریف انسان ان کے اندر نکو بن کر رہ گئے ہیں۔ برائی سے روکنا اور بھلائی کی نصیحت کرنا ان کی سوسائٹی میں ایک ناقابل برداشت جرم ہو گیا ہے۔ حق اور انصاف کی بات سننے کے لئے وہ تیار نہیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک قوم کو وہی لوگ پسند ہیں جو اس کی حد سے بڑھی ہوئی خواہشات اور اغراض کی وکالت کریں، دوسروں کے خلاف اس کے تعصبات کو بھڑکائیں اور اس کے جائز و ناجائز مقاصد کے لئے لڑنے کو تیار ہوں۔ اسی بنا پر ان قوموں نے چھانٹ چھانٹ کر اپنے اندر سے بدترین آدمیوں کو چنا اور انہیں اپنا نمائندہ بنایا۔ انھوں نے اپنے اکابر مجرمین کو ڈھونڈ ڈھونڈ

کر نکالا اور انہیں اپنا سربراہ کار بنا لیا۔ ان کی سوسائٹی میں جو لوگ سب سے زیادہ پست اخلاق، بے ضمیر اور بے اصول تھے وہ ان کی ترجمانی کیلئے اٹھے اور اخبار نویسی کے میدان میں وہی سب سے بڑھ کر مقبول ہوئے۔ پھر یہ سب لوگ بگاڑ کی راہ پر اپنی اپنی بگڑی ہوئی قوموں کو سرپٹ لے کر چلے۔ انہوں نے متضاد قومی خواہشات کو کسی نقطۂ انصاف پر جمع کرنے کے بجائے اتنا بڑھایا کہ وہ آخر کار نقطۂ تصادم پر پہنچ گئیں۔ انہوں نے معاشی و سیاسی اغراض کی کشمکش میں غصے اور نفرت اور عداوت کا زہر ملایا اور اسے روز بروز بڑھاتے چلے گئے۔ انہوں نے برسوں اپنی زیر اثر قوموں کو اشتعال انگیز تقریروں اور تحریروں کے انجکشن دے دے کر یہاں تک بھڑکایا کہ وہ جوش میں آکر کتوں اور بھیڑیوں کی طرح لڑنے کھڑی ہوگئیں۔ انہوں نے عوام اور خواص کے دلوں کو ناپاک جذبات کی سنڈاس اور اندھی دشمنی کا تنور بنا کر رکھ دیا۔ اب جو طوفان آپ کی نگاہوں کے سامنے برپا ہے یہ کوئی وقتی اور ہنگامی چیز نہیں ہے جو اچانک رونما ہوگئی ہو۔ یہ تو قدرتی نتیجہ ہے بگاڑ کے اُن بے شمار اسباب کا جو مدتوں سے ہمارے اندر کام کر رہے تھے، اور یہ نتیجہ بس ایک ہی دفعہ ظاہر ہو کر نہیں رہ جائیگا بلکہ جب تک وہ اسباب اپنا کام کئے جا رہے ہیں یہ روز افزوں ترقی کے ساتھ ظاہر ہوتا چلا جائیگا۔ یہ ایک بس بھری فصل ہے جو برسوں کی تخم ریزی و آبیاری کے بعد اب پک کر تیار ہوئی ہے، اور اسے آپ کو اور آپ کی نسلوں کو نہ معلوم کب تک کاٹنا پڑیگا۔

حضرات! آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ عین اس وقت جبکہ قانونِ قدرت کے مطابق اس ملک کی قسمت کا نیا انتظام در پیش ہے، ہم مالکِ زمین کے سامنے اپنی اہلیت و قابلیت کا کیا ثبوت پیش کر رہے ہیں۔ موقع تو یہ تھا کہ ہم اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کرتے کہ اگر وہ اپنی زمین کا انتظام ہمارے حوالہ کریگا تو ہم اسے خوب بنا سنوار کر گلزار بنا دیں گے۔ ہم اس میں انصاف کریں گے، اسے ہمدردی اور تعاون اور رحمت کا گہوارہ بنائیں گے، اس کے وسائل کو اپنی اور انسانیت کی فلاح میں استعمال کریں گے، اس میں بھلائیوں کو پروان چڑھائیں گے اور برائیوں کو دبائیں گے۔ لیکن ہم اسے بتا رہے ہیں کہ ہم ایسے غارت گر، اس قدر مفسد اور اتنے ظالم ہیں کہ اگر تو نے یہ زمین ہمارے حوالے کی تو ہم اس کی بستیوں کو اجاڑ دینگے، محلّے کے محلّے اور گاؤں کے گاؤں پھونک دیں گے، انسانی جان کو مکھی اور مچھر سے زیادہ بے قیمت کر دیں گے، عورتوں کو بے عزت کریں گے، چھوٹے بچوں کو شکار کریں گے، بوڑھوں اور بیماروں اور زخمیوں پر بھی رحم نہ کھائیں گے، عبادت گاہوں اور مذہبی کتابوں تک کو اپنی نفس کی گندگی سے لبس دیں گے، اور جس زمین کو تو نے انسانوں سے آباد کیا ہے اس کی رونق ہم لاشوں اور جلی ہوئی عمارتوں سے بڑھائیں گے۔ کیا واقعی آپ کا ضمیر یہ گواہی دیتا ہے کہ اپنی یہ خدمات، یہ اوصاف یہ کارنامے پیش کر کے آپ خدا کی نگاہ میں اس کی زمین کے انتظام کے لئے اہل ترین بندے قرار پائیں گے؟ کیا یہ کرتوت دیکھ کر وہ آپ سے

کہے گا کہ "شاباش! اے میرے پرانے مالیوں کی اولاد تمہیں سب سے بڑھ کر میرے اس باغ کی رکھوالی کے قابل ہو۔ اسی اکھیڑ پچھاڑ، اسی اجاڑ اور بگاڑ، اسی تباہی و بربادی اور گندگی و غلاظت کے لئے تو میں نے یہ باغ لگایا تھا، وہ اب اسے اپنے ہاتھ میں لے کر خوب خراب کرو؟"

میں یہ باتیں آپ سے اس لئے نہیں کہہ رہا ہوں کہ آپ اپنے آپ سے اور اپنے ملک کے مستقبل سے مایوس ہو جائیں۔ میں نہ خود مایوس ہوں، نہ کسی کو مایوس کرنا چاہتا ہوں۔ دراصل میرا مدعا آپ کو یہ بتانا ہے کہ ہندوستان کے لوگ اپنی حماقت اور جہالت سے اس زریں موقع کو کھونے پر تلے ہوئے ہیں جو کسی ملک کی قسمت بدلتے وقت صدیوں کے بعد خداوند عالم اس کے باشندوں کو دیا کرتا ہے۔ یہ وقت تھا کہ وہ ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اپنے اعلیٰ اوصاف اور اپنی بہتر صلاحیتوں کا ثبوت پیش کرتے تاکہ خدا کی نگاہ میں انتظام زمین کے اہل قرار پاتے۔ مگر آج ان کے درمیان مقابلہ اس چیز میں ہو رہا ہے کہ کون زیادہ غارت گر، زیادہ سفاک اور زیادہ ظالم ہے تاکہ سب سے بڑھ کر خدا کی لعنت کا وہی مستحق قرار پائے۔ یہ لچھن آزادی اور ترقی اور سرفرازی کے نہیں ہیں۔ ان سے تو اندیشہ ہے کہ کہیں پھر ایک مدت دراز کے لئے ہمارے حق میں غلامی اور ذلت کا فیصلہ نہ لکھ دیا جائے۔ لہٰذا جو لوگ عقل و ہوش رکھتے ہیں انھیں ان حالات کی اصلاح کے لئے کچھ فکر کرنی چاہئیے۔

اس مرحلہ پر آپ کے دل میں یہ سوال خود بخود پیدا ہو گا کہ اصلاح کی

صورت کیا ہے؟ میں اس کا جواب دینے کے لئے حاضر ہوں۔

اس تاریکی میں ہمارے لئے اُمید کی ایک ہی شعاع ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہماری پوری آبادی بگڑ کر نہیں رہ گئی ہے بلکہ اس میں کم از کم چار پانچ فی صدی لوگ ایسے ضرور موجود ہیں جو اس عام بداخلاقی سے بچے ہوئے ہیں۔ یہ وہ سرمایہ ہے جس کو اصلاح کی ابتدا کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اصلاح کی راہ میں پہلا قدم یہ ہے کہ اس صالح عنصر کو چھانٹ کر منظم کیا جائے۔ ہماری بدقسمتی کی بڑی وجہ یہی ہے کہ ہمارے یہاں بدی تو منظم ہے اور پوری باقاعدگی کے ساتھ اپنا کام کر رہی ہے، لیکن نیکی منظم نہیں ہے۔ نیک لوگ موجود ضرور ہیں مگر منتشر ہیں۔ ان کے اندر کوئی ربط اور تعلق نہیں ہے۔ کوئی تعاون اور اشتراک عمل نہیں ہے۔ کوئی لائحہ عمل اور کوئی مشترک آواز نہیں ہے۔ اسی چیز نے ان کو بالکل بے اثر بنا دیا ہے۔ کبھی کوئی اللہ کا بندہ اپنے گرد وپیش کی برائیوں کو دیکھ کر چیخ اُٹھتا ہے، مگر جب کسی طرف سے کوئی آواز اس کی تائید میں نہیں اُٹھتی تو مایوس ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ کبھی کوئی شخص حق اور انصاف کی بات علانیہ کہہ بیٹھتا ہے مگر منظم بدی زبردستی اس کا منہ بند کر دیتی ہے اور حق پسند لوگ بس اپنی جگہ چپکے سے اس کو داد دے کر رہ جاتے ہیں۔ کبھی کوئی شخص انسانیت کا خون ہوتے دیکھ کر صبر نہیں کر سکتا اور اس پر احتجاج کر گزرتا ہے، مگر ظالم لوگ ہجوم کر کے اسے دبا لیتے ہیں اور اس کا حشر دیکھ کر بہت سے ان لوگوں کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں

جن کے ضمیر میں ابھی کچھ زندگی باقی ہے ۔ یہ حالت اب ختم ہونی چاہیئے ۔ اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارا ملک خدا کے عذاب میں مبتلا ہو اور اس عذاب میں نیک و بد سب گرفتار ہو جائیں ، تو ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ ہمارے اندر جو صالح عناصر اس اخلاقی وبا سے بچے رہ گئے ہیں وہ اب مجتمع اور منظم ہوں اور اجتماعی طاقت سے اس بڑھتے ہوئے فتنہ کا مقابلہ کریں جو تیزی کے ساتھ ہمیں تباہی کی طرف لئے جا رہا ہے ۔

آپ اس سے نہ گھبرائیں کہ یہ صالح عنصر اس وقت بظاہر بہت ہی مایوس کن اقلیت میں ہے ۔ یہی تھوڑے سے لوگ اگر منظم ہو جائیں ، اگر ان کا اپنا ذاتی اور اجتماعی رویہ خالص راستی ، انصاف ، حق پسندی اور خلوص و دیانت پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو ، اور اگر وہ مسائل زندگی کا ایک بہتر حل اور دنیا کے معاملات کو درست طریقے پر چلانے کے لئے ایک اچھا پروگرام بھی رکھتے ہوں تو یقین جانیئے کہ اس منظم نیکی کے مقابلہ میں منظم بدی اپنے لشکروں کی کثرت اور اپنے گندے ہتھیاروں کی تیزی کے باوجود شکست کھا کر رہیگی ۔ انسانی فطرت شر پسند نہیں ہے ۔ اسے دھوکا ضرور دیا جا سکتا ہے ، اور ایک بڑی حد تک مسخ بھی کیا جا سکتا ہے ، مگر اس کے اندر بھلائی کی قدر کا جو مادہ خالق نے ودیعت کر دیا ہے اُسے بالکل معدوم نہیں کیا جا سکتا ۔ انسانوں میں ایسے لوگ تھوڑے ہی ہوتے ہیں جو بدی ہی سے دلچسپی رکھتے ہوں اور اس کے علمبردار بن کر کھڑے ہوں ۔ اور ایسے لوگ بھی کم ہوتے ہیں جنھیں نیکی سے عشق ہو اور اسے قائم کرنے کی جد و جہد

کریں۔ ان دونوں گروہوں کے درمیان عام انسان نیکی اور بدی کے ملے جلے رجحانات رکھتے ہیں۔ وہ نہ بدی کے گرویدہ ہوتے ہیں اور نہ نیکی ہی سے انہیں غیر معمولی دلچسپی ہوتی ہے۔ ان کے کسی ایک طرف جھک جانے کا انحصار تمام تر اس پر ہوتا ہے کہ خیر اور شر کے علمبرداروں میں سے کون آگے بڑھ کر انہیں اپنے راستہ کی طرف کھینچتا ہے۔ اگر خیر کے علمبردار سرے سے میدان میں آئیں ہی نہیں اور ان کی طرف سے عوام الناس کو بھلائی کی راہ پر چلانے کی کوئی کوشش ہی نہ ہو تو لامحالہ میدان علمبردارانِ شر ہی کے ہاتھ رہے گا۔ اور وہ عام انسانوں کو اپنی راہ پر کھینچ لے جائیں گے۔ لیکن اگر خیر کے علمبردار بھی میدان میں موجود ہوں اور وہ اصلاح کی کوشش کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کریں تو عوام الناس پر علمبردارانِ شر کا اثر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ ان دونوں کا مقابلہ آخرکار اخلاق کے میدان میں ہوگا۔ اور اس میدان میں نیک انسانوں کو بُرے انسان کبھی شکست نہیں دے سکتے۔ سچائی کے مقابلہ میں جھوٹ، ایمانداری کے مقابلہ میں بے ایمانی، اور پاکبازی کے مقابلہ میں بدکرداری خواہ کتنا ہی زور لگالے، آخری جیت بہرحال سچائی، پاکبازی اور ایمانداری ہی کی ہوگی۔ دنیا اس قدر بے حس نہیں ہے کہ اچھے اخلاق کی مٹھاس اور بُرے اخلاق کی تلخی کو چکھ لینے کے بعد آخرکار اس کا فیصلہ یہی ہو کہ مٹھاس سے تلخی زیادہ بہتر ہے۔

اصلاح کے لئے نیک انسانوں کی تنظیم کے ساتھ دوسری ضروری

چیز یہ ہے کہ ہمارے سامنے بناؤ اور بگاڑ کا ایک واضح تصور موجود ہو۔ ہم اچھی طرح یہ سمجھ لیں کہ بگاڑ کیا ہے تاکہ اسے دور کرنے کی کوشش کی جائے، اور بناؤ کیا ہے تاکہ اسے عمل میں لانے پر سارا زور لگا دیا جائے۔ تفصیلات میں جانے کا اس وقت موقع نہیں ہے۔ میں بڑے اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے ان دونوں چیزوں کی ایک تصویر پیش کرونگا۔

انسانی زندگی میں بگاڑ جن چیزوں سے پیدا ہوتا ہے ان کو ہم چار بڑے بڑے عنوانات کے تحت جمع کر سکتے ہیں۔

(۱) خدا سے بے خوفی، جو دنیا میں بے انصافی، بے رحمی، خیانت، اور ساری اخلاقی برائیوں کی جڑ ہے۔

(۲) خدا کی ہدایت سے بے نیازی، جس نے انسان کے لئے کسی معاملہ میں بھی ایسے مستقل اخلاقی اصول باقی نہیں رہنے دئے ہیں جن کی پابندی کی جائے۔ اسی چیز کی بدولت اشخاص اور گروہوں اور قوموں کا سارا طرزِ عمل مفاد پرستی، لذت پرستی، اور خواہشات کی غلامی پر قائم ہو گیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ نہ اپنے مقاصد میں جائز و ناجائز کی تمیز کرتے ہیں اور نہ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے کسی قسم کے بُرے سے بُرے ذرائع اختیار کرنے میں انہیں ذرا سا تامل ہوتا ہے۔

(۳) خود غرضی، جو صرف افراد ہی کو ایک دوسرے کی حق تلفی پر آمادہ نہیں کرتی بلکہ بڑے پیمانے پر نسل پرستی، قوم پرستی اور طبقاتی امتیازات کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور اس سے فساد کی بے شمار صورتیں پیدا ہوتی ہیں

(۴) جمود یا بے راہ روی، جس کی وجہ سے انسان یا تو خدا کی دی ہوئی قوتوں کو استعمال ہی نہیں کرتا، یا غلط استعمال کرتا ہے، یا تو خدا کے بخشے ہوئے ذرائع سے کام نہیں لیتا یا غلط کام لیتا ہے۔ پہلی صورت میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ کاہل اور نکمے لوگوں کو زیادہ دیر تک اپنی زمین پر قابض نہیں رہنے دیتا بلکہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آتا ہے جو کچھ نہ کچھ بنانے والے ہوں۔ دوسری صورت میں جب غلط کار قوموں کی تخریب ان کی تعمیر سے بڑھ جاتی ہے تو وہ ہٹا کر پھینک دی جاتی ہیں اور بسا اوقات خود اپنی ہی تخریبی کارروائیوں کا لقمہ بنا دی جاتی ہیں۔

اس کے مقابلہ میں وہ چیزیں بھی، جن کی بدولت انسانی زندگی بنتی اور سنورتی ہے، چار ہی عنوانات کے تحت تقسیم ہوتی ہیں۔

(۱) خدا کا خوف، جو آدمی کو برائیوں سے روکنے اور سیدھا چلانے کے لئے ایک ہی قابلِ اعتماد ضمانت ہے۔ راستبازی، انصاف، امانت، حق شناسی، ضبط نفس، اور وہ تمام دوسری خوبیاں جن پر ایک پر امن اور ترقی پذیر تمدن و تہذیب کی پیدائش کا انحصار ہے، اسی ایک تخم سے پیدا ہوتی ہیں۔ اگرچہ بعض دوسرے عقیدوں کے ذریعہ سے بھی کسی نہ کسی حد تک انہیں پیدا کیا جا سکتا ہے، جس طرح مغربی قوموں نے کچھ نہ کچھ اپنے اندر پیدا کیا ہے، لیکن ان ذرائع سے پیدا کی ہوئی خوبیوں کا نشو و نما بس ایک حد پر جا کر رُک جاتا ہے۔

اور اس حد میں بھی ان کی بنیاد متزلزل رہتی ہے۔ صرف خدا ترسی ہی وہ پائدار بنیاد ہے جس پر انسان کے اندر برائی سے رکنے اور بھلائی پر چلنے کی صفت مضبوطی کے ساتھ قائم ہوتی ہے، اور محدود پیمانے پر نہیں بلکہ نہایت وسیع پیمانے پر تمام انسانی معاملات میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔

(۲) خدائی ہدایت کی پیروی، جو انسان کے شخصی، اجتماعی، قومی اور بین الاقوامی رویہ کو اخلاق کے مستقل اصولوں کا پابند کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔ جب تک انسان اپنے اخلاقی اصولوں کا خود واضع اور مصنف رہتا ہے، اس کے پاس باتیں بنانے کے لئے کچھ اور اصول ہوتے ہیں اور عمل میں لانے کے لئے کچھ اور۔ کتابوں میں آبِ زر سے وہ ایک قسم کے اصول لکھتا ہے اور معاملات میں اپنے مطلب کے مطابق بالکل دوسری ہی قسم کے اصول برتتا ہے۔ دوسروں سے مطالبہ کرتے وقت اس کے اصول کچھ ہوتے ہیں اور خود معاملہ کرتے وقت کچھ۔ موقع اور مصلحت اور خواہش اور ضرورت کے دباؤ سے اس کے اصول ہر آن بدلتے ہیں۔ وہ اخلاق کا اصل محور "حق" کو نہیں بلکہ "اپنے مفاد" کو بناتا ہے۔ وہ اس بات کو مانتا ہی نہیں کہ اس کے عمل کو حق کے مطابق ڈھلنا چاہئیے۔ اس کے بجائے وہ چاہتا ہے کہ حق اس کے مفاد کے مطابق ڈھلے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی بدولت افراد سے لے کر قوموں تک سب کا رویہ غلط ہو جاتا ہے اور اسی سے دنیا میں فساد پھیلتا ہے۔ اس کے برعکس جو چیز انسان کو امن،

خوش حالی اور فلاح وسعادت بخش سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اخلاق کے
کچھ ایسے اصول ہوں جو کسی کے مفاد کے لحاظ سے نہیں بلکہ حق کے
لحاظ سے بنے ہوئے ہوں اور انھیں اٹل مان کر تمام معاملات میں ان
کی پابندی کی جائے خواہ وہ معاملات شخصی ہوں یا قومی، خواہ وہ تجارت
سے تعلق رکھتے ہوں یا سیاست اور صلح و جنگ سے۔ ظاہر ہے کہ ایسے
اصول صرف خدائی ہدایت ہی میں ہمیں مل سکتے ہیں، اور ان پر عمل درآمد
کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ انسان ان کے اندر رد و بدل کے اختیار
سے دست بردار ہو کر انھیں واجب الاتباع تسلیم کرلے۔

(۳) نظام انسانیت، جو شخصی، قومی، نسلی اور طبقاتی خود غرضیوں
کے بجائے تمام انسانوں کے مساوی مرتبے اور مساوی حقوق پر مبنی ہو۔
جس میں بے جا امتیازات نہ ہوں۔ جس میں اونچ نیچ، چھوت چھات،
اور مصنوعی تعصبات نہ ہوں۔ جن میں بعض کے لئے مخصوص حقوق اور
بعض کے لئے بناوٹی پابندیاں اور رکاوٹیں نہ ہوں۔ جس میں سب
کو یکساں پھولنے پھلنے کا موقع ملے۔ جس میں انسان کی پستی و بلندی
صرف اس کے اوصاف کی بنا پر ہو۔ جس میں اتنی وسعت ہو کہ روئے
زمین کے سارے انسان اس میں برابری کے ساتھ شریک ہو سکتے
ہوں۔

(۴) عمل صالح، یعنی خدا کی دی ہوئی قوتوں اور اس کے بخشے ہوئے
ذرائع کو پوری طرح استعمال کرنا اور صحیح استعمال کرنا۔

حضرات! یہ چار چیزیں ہیں جن کے مجموعہ کا نام "بناؤ" اور "صلاح" ہے، اور ہم سب کی بہتری اس میں ہے کہ ہمارے اندر نیک انسانوں کی ایک ایسی تنظیم موجود ہو جو بگاڑ کے اسباب کو روکنے اور بناؤ کی ان صورتوں کو عمل میں لانے کے لئے پیہم جد و جہد کرے۔ یہ جد وجہد اگر اس ملک کے باشندوں کو راہ راست پر لانے میں کامیاب ہو گئی تو خدا ایسا بے انصاف نہیں ہے کہ وہ خواہ مخواہ اپنی زمین کا انتظام اس کے اصلی باشندوں سے چھین کر کسی اور کو دیدے۔ لیکن اگر خدا نخواستہ یہ ناکام ہوئی تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارا، آپ کا اور اس ارض ہند کے رہنے والوں کا کیا انجام ہوگا!۔

مطبوعات

مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام		۸/-/-
رسالہ دینیات		۱/۸/-
حقوق الزوجین		۱/۸/-
مسئلہ قومیت		۱/۸/-
مسئلہ جبر و قدر		۱/-/-
سود		۲/۸/-
تجدید و احیائے دین		۱/-/-
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر		۱/-/-
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں		۱/۴/-
سیاسی کشمکش	حصہ اول	۱/۴/-
"	حصہ دوم	۲/۸/-

سیاسی کشمکش	حصہ سوم	۲/۶/-
خطبات	نیا ایڈیشن	۳/-/-
پردہ		۲/۸/-
تنقیحات		۲/۸/-
تفہیمات		۴/۸/-
حقیقت شرک		۲/-/-
حقیقت توحید		۱/۴/-
حقیقت تقویٰ		-/۱۲/-
اسلام اور ضبط ولادت		۱/-/-
دستور جماعت اسلامی		-/۳/-
روداد جماعت اسلامی	حصہ اول	۱/-/-
"	حصہ دوم	-/۱۴/-
"	حصہ سوم	۲/-/-
"	حصہ پنجم	۲/-/-
"	حلقہ خواتین	-/۱۲/-
دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات		۲/۸/-
اشتراکیت اور اسلامی نظام		زیر طبع
اسلامی قانون		۱/-/-
سلامتی کا راستہ		-/۶/-

اسلام کا نظریہ سیاسی	-/۶/-
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	-/۸/-
انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	-/۸/-
اسلام اور جاہلیت	-/۷/-
اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	-/۶/-
دین حق	-/۶/-
نیا نظام تعلیم	-/۶/-
مذہب کا انقلابی تصوّر	-/۶/-
جہاد فی سبیل اللہ	-/۶/-
شہادت حق	-/۶/-
تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں	-/۶/-
ایک اہم استفتا	-/۳/-
اسلام کا نظامِ حیات	-/۱۰/-
نشانِ راہ	-/۶/-
ہندوستان میں تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل	-/۸/-
اسلامی معاسیات کے اصول	-/۶/-

انگریزی کتب

رسالہ دینیات	(انگریزی)	-/۸/۳

اسلام کا نظریہ سیاسی	انگریزی	-/۱۲/
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	"	-/۱۲/
اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	"	-/۱۲/-
انسان کا معاشی مسئلہ	"	-/۱۲/-
نیشنلزم اینڈ انڈیا	"	-/۱۲/-
الحاد کے بعد کیا ؟	"	-/۱۲/-
اسلام کیا ہے ؟	"	-/۸/۱

عربی کتب

اسلام کا نظریہ سیاسی	-/-/۱
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	-/-/۱
دین حق	-/ ۱/
انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	-/-/۱

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی، ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور۔

رسالہ ترجمان القرآن ماہوار

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

تمام ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کا ایک ہی ماہوار رسالہ ہے۔ اس کا مقصد وحید اعلائے کلمۃ اللہ اور دعوت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ دنیا میں جو افکار و تخیلات اور اصولِ تہذیب و تمدن پھیل رہے ہیں، اُن پر قرآنی نقطۂ نظر سے تنقید کرنا اور فلسفہ و سائنس، سیاست و معیشت، تمدن و معاشرت ہر چیز میں قرآن و سنت کے پیش کردہ اصولوں کی تشریح کرنا اور زمانۂ جدید کے حالات پر ان اصولوں کو منطبق کرنا اس رسالہ کا خاص موضوع ہے۔

یہ رسالہ اُمت مسلمہ کو ایک نئی زندگی کی دعوت دیتا ہے اور اس کی دعوت کا خلاصہ یہ ہے کہ:- "اپنے دل و دماغ کو مسلمان بناؤ۔ جاہلیت کے طریقے چھوڑ کر اسلام کی صراط مستقیم پر چلو۔ قرآن کو لے کر اٹھو اور دنیا میں غالب بن کر رہو۔"

یہ رسالہ سنہ ۱۹۳۲ء سے باقاعدہ نکل رہا ہے اور ملک کے مشہور رسالوں کی صف اول میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ قیمت سالانہ پانچ روپے۔ نمونہ کا پرچہ ۸